ہر دور میں مصلوب

خالد سہیل

ہر دور میں مصلوب

خالد سہیل

بارِ اوّل : جنوری سنہ ۱۹۹۵ء
کتابت : عبداللہ سنجر، کلکتہ
طباعت : جی آر ٹی پرنٹرس، کلکتہ
اہتمام : ظہیر انور، کلکتہ
سرِورق : خالد سہیل

قیمت : =/150
بیرونِ ملک کے لئے : دس ڈالر

ناشر :

○

CREATIVE LINKS
PENT HOUSE # 6
WHITE OAKS CRT
WHITBY, ONTARIO
CANADA — LIP 1B7.

•

شرجیل آرٹس پبلیکیشنز
۱۱- اہری پوکھر فرسٹ لین، کلکتہ - ۱۹

ہر
دَور
میں
مصلوب

لیسبیئنز (LESBIAN)

اور

گے (GAY)

ادب و زندگی

(مضامین، شاعری، تراجم)

ناشر:

کریئٹیو لِنکس، کینیڈا

شرجیل آرٹس پبلیکیشنز، کلکتہ

اپنے
طور پر
زندگی
گزارنے کی
مکمّل آزادی
کے
نام!

شرکاء

خالد سہیل	—	کینیڈا
جاوید دانش	—	کینیڈا
چودھری محمد نعیم	—	امریکہ
افتخار نسیم	—	امریکہ
نصر ملک	—	ڈنمارک
سعید انجم	—	ناروے
سائیں سُچّا	—	سویڈن
کشور ناہید	—	پاکستان
اسد ملک	—	پاکستان
ش۔ اختر	—	ہندستان
ظہیر الور	—	ہندستان

آئینے

یادوں کے آئینہ میں

مجھے دسمبر ۱۹۷۷ء کی وہ ٹھٹھرتی ہوئی شام ابھی تک یاد ہے جب میں نیا نیا کینیڈا آیا تھا اور ہسپتال کے لئے ایمرجنسی ڈیوٹی پر رہا تھا۔ چاروں طرف برف گر رہی تھی۔ سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔ نرس نے مجھے فون پر بتایا کہ ایک مریض انتظار گاہ میں بیٹھا ہے اور ڈاکٹر سے بات کرنا چاہتا ہے۔

میں نے کوٹ، مفلر، ہیٹ اور دستانے پہنے اور اپنے کمرے سے ہسپتال کی طرف چل دیا۔ "اس طوفان میں جو شخص ہسپتال آیا ہے وہ ضرور کسی مصیبت میں مبتلا ہوگا" میں نے سوچا۔

میں نے کوٹ لٹکایا، دستانے اور ہیٹ میز پر رکھے اور نرس کے اشارے پر مریض کیطرف بڑھا۔

"میرا نام ڈاکٹر سہیل ہے" میں نے تعارف کرایا

"مجھے چارمز کہتے ہیں۔"

میں اس نوجوان کو انٹرویو کے کمرے میں لے گیا۔ وہ درمیانے قد کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔ اس کا چہرہ زرد تھا جسم مضمحل اس نے جینز (JEANS) کی قمیص اور پتلون زیب تن کر رکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں اداسی کے سائے تھے۔

"آج ہسپتال کس طرح آنا ہوا؟" میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"میں ایک سخت نفسیاتی بحران کا شکار ہوں۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

پھر اس نے اپنے دل کی بپتا سنائی، کہنے لگا — "میں گے (Gay) ہوں اور پندرہ سال سے اس صلیب کو اٹھائے پھر رہا ہوں۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی نہیں بتایا کیوں کہ وہ بہت مذہبی اور روایتی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے عاق کر دیں گے۔ میں اپنے محبوب کے ساتھ دس سال سے رہ رہا تھا۔ سب لوگ سمجھتے تھے کہ ہم دو دوست ہیں محبوب نہیں۔ میرا محبوب جانتھن ایک اسکول میں معلم ہے لیکن اب اسکول والوں کو پتہ چل گیا ہے کہ وہ گے ہے اور اسے اسکول کی ملازمت سے نکال دیا گیا ہے۔ اسکول کے اصحابِ اختیار اور بچوں کے والدین کہتے ہیں کہ اس سے بچوں پر غلط اثر پڑے گا اور ان کا اخلاق خراب ہوگا۔ جانتھن نے بہت ثابت کیا کہ وہ ایک اچھا استاد ہے۔ بچے اسے پسند کرتے ہیں۔ اس نے ہمیشہ بچوں کا احترام کیا ہے لیکن وہ نہ مانے۔ جانتھن نے یہ بھی پوچھا کہ اگر والدین کو اتنی ہی فکر ہے تو وہ اپنی بچیوں کو ہیٹروسیکسول اساتذہ کے پاس کیوں بھیجتے ہیں؟"

جب اسکول کے حکام نے کچھ نہ سنا تو جانتھن نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ خبر اخبار میں چھاپ دی گئی جس سے پورے شہر کو خبر ہو گئی۔ یہ بھی لکھا گیا کہ جانتھن اپنے محبوب چارمز کے ساتھ دس سال سے گناہ کی زندگی گزار رہا ہے۔ اسطرح میرے والدین کو پتہ چل گیا اور انہوں نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔

میں چارمز کی کہانی سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ میں اس کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میرا کبھی ایسے انسانوں سے واسطہ نہ پڑا تھا۔

مجھے چارمز سے بڑی ہمدردی ہوئی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ مجھے افسوس ہوا کہ لوگوں کو دو انسانوں کی خوشی پسند نہ آئی۔

چارمز کئی ہفتوں تک آتا رہا

وہ اپنی بپتا سناتا
میں ہمدردی سے سنتا
میرے پاس نہ کوئی مشورہ تھا نہ علاج
آخر ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا
"چارمز میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر پایا۔ تم آخر میرے پاس کیوں آتے ہو؟"
وہ کہنے لگا۔" تم سے بات کرکے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ تم ہمدردی سے میری باتیں سنتے ہو۔" پھر کہنے لگا۔" المیہ یہ ہے کہ میرے اپنے ملک، اپنے شہر، اپنے قبیلے اور اپنے خاندان والے مجھ سے نفرت اور تعصب کا سلوک کرتے ہیں اور تم ایک اجنبی قوم اور ملک کے انسان مجھ سے خلوص سے پیش آتے ہو۔ میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔"
چند ہفتوں کے بعد چارمز کے محبوب نے خودکشی کر لی اور چارمز کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ ایک نرس نے بتایا کہ شاید وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔
اس ایک واقعہ نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں خود زندگی کی اہم حقیقتوں سے ناآشنا تھا اور میرے دل میں بھی جہالت اور تعصب کے بہت سے بُت موجود تھے۔
اس واقعہ کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرتا رہوں گا۔
٭٭٭
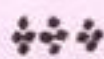
مجھے سان فرانسسکو کا وہ دن بھی یاد ہے جب میں اپنے دوست زاہد کے ساتھ امریکن پوئٹری ایسوسی ایشن (American Poetry Association) کی دعوت پر اپنی نظم سنانے گیا ہوا تھا۔ کانفرنس کے بعد ہم دونوں شہر کی سیر کو نکل گئے۔ شہر کے پل دیکھنے کے بعد ہم لوگ کاسٹرو اسٹریٹ پہنچے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں ایک لاکھ کے قریب ہوموسیکسول لوگوں نے اپنا علیحدہ شہر بسا رکھا ہے۔

وہ شہر مجھے آشتی کا شہر لگا۔ وہ پہلا موقع تھا جب میں نے لوگوں کے چہروں پر اطمینان اور مسرت کے جذبات دیکھے۔ ان کی اپنی دکانیں تھیں، اپنے گھر، اپنے گرجے تھے، اپنے اسکول۔ انہوں نے وہاں اپنے خاندان بسا رکھے تھے۔ کئی گھروں کے باہر کئی جوڑے ایسے کام کر رہے تھے جیسے عام شہروں میں میاں بیوی ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے دوست بھی تھے، محبوب بھی، غم خوار بھی تھے، مسیحا بھی۔

میں اور زاہد ایک ریستوران میں کھانا کھانے گئے۔ میزوں پر "گے جوڑے" سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ کسی نے کسی کا ہاتھ تھام رکھا تھا، کسی نے دوسرے کی گردن میں بازو ڈال رکھا تھا۔ ان کی گفتگو، ان کا لہجہ، ان کے انداز سب جداگانہ تھے۔ ویٹر نے ہمیں اس انداز سے دیکھا جیسے ہم بھی ایک "گے کپل" (gay couple) ہوں۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں نے اتفاق سے اس دن پیازی قمیص پہن رکھی تھی۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس شہر میں لوگ ہم سے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آئے۔

آخر میں ہم کتابوں کی ایک دکان پر گئے۔ مجھے وہاں بہت حیرانی ہوئی۔ اس دکان میں LESBIANS اور GAYS کے بارے میں ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔

ان کی تاریخ، ان کے حقوق، ان کا ادب حتیٰ کہ ایڈز کے بارے میں بھی بیسیوں کتابیں موجود تھیں۔ میں نے بھی چند کتابیں خریدیں تاکہ اپنی جہالت میں کچھ اور کمی کر سکوں۔

میں جب اس شہر سے لوٹ رہا تھا تو میرا دل خوش بھی تھا اور افسردہ بھی۔

٭٭٭
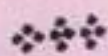
مجھے سویڈن کی وہ شام بھی یاد ہے جب سائیں سُچا کی دعوت پر یورپ اور اور شمالی امریکہ کے چند ایشیائی ادیب جمع ہوئے تھے اور "شناخت کی تلاش" کے موضوع پر اپنے جذبات، احساسات، تجربات اور نظریات کا اظہار کر رہے تھے۔ اس محفل میں گفتگو کا آغاز خاندان، کاروبار اور معاشرتی حالات کی تبدیلی سے ہوا تھا۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا تھا کہ ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے میں آنے سے جہاں ہماری خارجی زندگیوں میں تبدیلیاں آئی ہیں وہیں ہماری داخلی زندگیاں بھی متاثر ہوئی ہیں۔ میں نے اپنی تصوراتی زندگی (FANTASY LIFE) کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے بتایا کہ جب میں پاکستان میں تھا تو جب میں عورتوں کے بارے میں سوچتا تھا تو میرے ذہن میں بھوری رنگت کی جلد کی، بھوری آنکھوں اور سیاہ لمبے بالوں والی عورتوں کا ہیولا ابھرتا تھا لیکن کینیڈا میں آکر چونکہ میرا سفید جلد اور سنہرے چھوٹے بالوں والی عورتوں سے رابطہ رہا تھا اس لئے میری تصوراتی زندگی بالکل بدل گئی تھی۔ یہ ہجرت کا وہ پہلو تھا جس پر لوگ کھل کر بات نہیں کرتے۔

ابھی میں اپنی گفتگو ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ ہمارا دوست افتخار نسیم بول اٹھا:

"میں خالد سہیل کی باتیں سن رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ جب وہ اپنی رومانوی زندگی کے بارے میں کھل کر بات کر سکتا ہے تو مجھے ڈرنے یا گھبرانے کی کیا ضرورت ہو۔ اگرچہ آپ میں سے چند لوگ جانتے ہیں لیکن میں آج سب کے سامنے اس حقیقت کا کھل کر اظہار کرتا ہوں کہ میں "گے" ہوں۔ میں نے امریکہ آکر اپنی جنسی شناخت کے سفر کی کئی منزلیں طے کی ہیں اور اب ایسے مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں میں اپنے آپ کو قبول کر سکتا ہوں اور دوسروں کے سامنے سچ بول سکتا ہوں۔"

اس محفل میں افتخار نسیم کی وہ PUBLIC CONFESSION اچھا شگون تھی۔ سب دوستوں نے اس کی جرأت اور صاف گوئی کو سراہا اور اپنے سینے سے لگالیا۔ اس نے اس محفل میں اپنے تجربات پر مبنی نظم "ہم جنس" سنائی۔

اس گروہ نے بڑی فراخدلی سے افتخار نسیم کو اپنے ادبی خاندان میں شریک کرلیا تھا۔ افتخار نسیم کو بھی اس قدر خلوص اور محبت کی امید نہ تھی۔ وہ افتخار نسیم جسے پتھروں کی عادت تھی مسکراہٹیں دیکھ کر حیران ہوگیا تھا۔

وہ اگلے چند دن تک اپنی زندگی کے اس نئے باب کا جشن مناتا رہا۔

٭٭٭

مجھے ٹورانٹو کی وہ شام بھی یاد ہے جب افتخار نسیم مجھے اور زاہد کو ٹورانٹو کی "SOUTH INDIAN GAY COMMUNITY" کے اراکین سے ملانے لے گیا تھا۔ ہم ایک گھر میں پہنچے تھے جہاں چار مرد (دو جوڑے) شام کا کھانا کھا رہے تھے اور باقی دوست گپ شپ لگا رہے تھے۔ اس گھر میں ہر چیز سلیقے سے سجی تھی (وہ گھران غیر شادی شدہ مردوں کا نہیں تھا جہاں ہر چیز بے ترتیب ہوتی ہے) افتخار نے ہمارا تعارف کرایا۔ انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ڈرنکز (Drinks) پیش کیں۔ ان میں سے چند ایک نے مجھ سے ہوموسیکسوئیلٹی اور نفسیات کے حوالے سے سوال پوچھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ نفسیات کی دنیا کے تعصّبات آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں اور علم و آگہی کی روشنی آہستہ آہستہ جہالت اور کم علمی کی تاریکی کو دور کر رہی ہے۔ ان دوستوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے ٹورانٹو سے "خوش خیال" کے نام سے ایک پرچہ نکال رہے ہیں جس کے ذریعہ اس قبیلے کے لوگوں کو ان کے حقوق کا احساس دلایا جا رہا ہے۔ انہوں نے مجھے اور زاہد کو اس کی چند کاپیاں بھی تحفتاً دیں۔ وہ سب نہایت شریف النفس اور مخلص انسان تھے۔ زاہد ان کے اخلاق سے اس قدر متاثر ہوا کہ انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔

جب میں نے انہیں اپنے "گے اور لیسبئن ادب اور زندگی" کے موضوع پر کتاب لکھنے کے پروجیکٹ کے بارے میں بتایا تو بہت خوش ہوئے اور مجھے ٹورانٹو کی اس

دکان کا پتہ بتایا جہاں سے گے اور لیسبین شاعری کے مجموعے مل سکتے تھے۔

میں اس شام ان دوستوں کی حوصلہ افزائی سے بہت متاثر ہوا تھا۔

٭٭٭

مجھے ٹورانٹو کی وہ شام بھی یاد ہے جب میں ٹورانٹو کے GAY BOOK STORE سے لیسبیئن شاعرات کی کتابیں خرید کر نکل رہا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ہیلو ڈاکٹر سہیل"

میں نے مڑ کر دیکھا تو چارمز تھا اور ہم دونوں بے اختیار گلے لپٹ گئے۔

بعض لوگوں نے مجھے کن انکھیوں سے بھی دیکھا تھا۔

"تم یہاں کہاں؟"

"اور تم؟"

چنانچہ ہم دونوں چائے پینے ایک ریستوران میں چلے گئے۔ چارمز سے میری ملاقات تقریباً چودہ سال بعد ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹیں پھیلی ہوئی تھیں۔

میں نے اسے بتایا کہ میں آج کل GAY LITERATURE پڑھ رہا ہوں اور منتخب نظموں کا اردو میں ترجمہ کر رہا ہوں۔

وہ بہت خوش ہوا۔

"اور تم؟"۔ میں اس کے بارے میں متجسس تھا۔

"میں آج کل سان فرانسسکو میں رہتا ہوں۔ میں نے ایک گھر خریدا ہے۔ میرا محبوب پچھلے آٹھ سال سے میرے ساتھ رہ رہا ہے۔ ہم بہت خوش ہیں۔ میرا محبوب ٹورانٹو کا ہے۔ اس لئے میں اس کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔"

"پھر تو تم ہمارے داماد ہوتے۔" اور ہم دونوں ہنس دئے۔

"وہاں کرتے کیا ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں گے کاؤنسلر (GAY COUNSELLOR) ہوں۔ میں ان لوگوں اور جوڑوں

کی مدد کرتا ہوں جو ذہنی مسائل کا شکار ہیں۔"

"تو گویا اب تم مسیحا بن گئے ہو۔"

"اگر ہم خود ایک دوسرے کی مدد نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔"

پھر ہم دونوں ہاتھ ملا کر جدا ہو گئے۔

جانے سے پہلے اس نے مجھ سے کہا" ڈاکٹر سہیل میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ نے مشکل وقت میں میری مدد کی تھی۔"

"میں بھی تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔ تم نے مجھے انسانی زندگی کے ایک ایسے رُخ سے آشنا کرایا تھا جس سے میں پہلے واقف نہ تھا اور اب میں مشرقی دنیا کو اس سے واقف کرانا چاہتا ہوں۔"

جب چارمز رخصت ہو رہا تھا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔

❖❖❖

میرے ہم خیال دوستو!

اس سے پہلے میں آپ لوگوں کے سامنے عورتوں، اقلیتوں اور سیاہ فام لوگوں کی زندگی اور ادب کے بارے میں اپنی تخلیقات اور تراجم پیش کر چکا ہوں۔ ان کتابوں کا مقصد اردو قارئین کے سامنے ایسا ادب پیش کرنا تھا جس سے زندگی کے سنجیدہ مسائل اور ادب کے رشتے واضح ہو سکیں اور مشرقی لوگ یہ جان سکیں کہ مغرب میں بیسویں صدی میں انسانی حقوق کے حوالے سے جو تحریکیں چلی ہیں انہوں نے ہماری انفرادی اور معاشرتی زندگیوں کو کیسے متاثر کیا ہے۔

اب میں ان لوگوں کی زندگی اور ادب کے حوالے سے ایک کتاب ترتیب دینے کا خواب دیکھ رہا ہوں جنہیں آج کے دور میں "گے" (GAY) اور لیسبیئن (LESBIAN) کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں آپ لوگوں کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔

میرا ذاتی مشاہدہ، تجربہ اور مطالعہ یہ کہتا ہے کہ "گے" اور لیسبیئن لوگ ہر دور میں مظلوم و مصلوب رہے ہیں۔ ان لوگوں کے حقوق کو صرف قبول ہی نہ کیا گیا بلکہ ان پر ہر عہد میں ہر قسم کی پابندیاں عائد کی گئیں۔ آج بھی کئی ممالک میں ان کو نہ صرف قید کی سزا مل سکتی ہے بلکہ قانونی طور پر ان کا سر بھی قلم ہو سکتا ہے۔

میں جس ماحول میں پلا بڑھا وہاں جنس ایک ایسا موضوع تھا جس پر نہ تو رشتہ داروں سے، نہ اساتذہ سے اور نہ ہی دوستوں سے کھل کر بات ہو سکتی تھی اس لیے میں بھی اور بہت سے لوگوں کی طرح جہالت اور تعصبات کے جنگل میں بھٹکتا رہا۔ میرے ذہن میں بھی ہوموسیکشویلٹی (جس کے لئے اردو میں کوئی مناسب لفظ نہیں ہے۔ "ہم جنسی" سے میں مطمئن نہیں) سے "لونڈے بازی" اور "لوطی" جیسے تصورات پیدا ہوئے تھے۔ اب جبکہ میں طب، نفسیات اور تاریخ کا مطالعہ کر رہا ہوں مجھے احساس ہو رہا ہے کہ نابالغ بچوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا ہر مہذب معاشرے میں قانونی اور اخلاقی جرم سمجھا گیا ہے۔ (انگریزی میں اسے Pedophilia کہتے ہیں) لیکن دو بالغ مردوں اور عورتوں کے درمیان رومانوی اور جنسی تعلقات کا احترام انسانی حقوق میں شمار ہوتا ہے۔

میں ایک ایسی کتاب تیار کرنا چاہتا تھا جو تاریخی، معاشرتی اور ادبی تخلیقات اور حوالوں پر مبنی ہو۔ میں مذہب یا سیاست میں ملوث ہو کر کسی کو خواہ مخواہ اشتعال میں لانا نہیں چاہتا۔ کتاب کا مقصد تعلیمی اور ادبی ہے۔ لہجہ ہمدردانہ ہو گا تاکہ لوگ اس موضوع اور ان لوگوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ اس سلسلے میں میں نے جو فہرست تیار کی ہے وہ ارسال کر رہا ہوں۔

اگر آپ لوگ اس موضوع پر کوئی نظم، افسانہ، ڈرامہ یا مضمون تخلیق کر سکیں یا اپنے علاقے کے ادب (جس میں علاقائی اور لوک ورثہ بھی شامل ہیں) کے کسی حصہ کا اردو میں ترجمہ کر سکیں جو Homosexuality کے بارے میں جنسی اور معاشرتی آگہی بڑھانے میں ممد ہو تو میں ممنون ہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی

فرمائیں گے۔

ویسے تو میں اکیلا بھی اس Project کو جلد یا بدیر پایۂ تکمیل تک پہنچا ہی دوں گا لیکن اگر آپ نے میرے اس سفر میں میرا ساتھ دیا تو زیادہ لطف آئے گا۔

اگر اس سلسلے میں کوئی سوال یا مشورہ ہو تو ضرور لکھیں۔ میں اس Project کے بارے میں بہت Excited ہوں۔ میرے خیال میں یہ کتاب اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہو گی۔

مثبت جواب کے لئے چشم براہ!

آپ کا

خالد سہیل

فروری سنہ ۱۹۹۲ء

ہوموسیکشوئیلٹی (HOMOSEXUALITY) کی ترکیب یونانی لفظ (HOMO) سے مرکّب ہے جس کا مطلب ہے "ایک جیسا" اور سیکشوئیلٹی (SEXUALITY) سے مرکّب ہے۔ جب دو انسان چاہے وہ ۲ مرد ہوں یا ۲ عورتیں آپس میں جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں تو وہ "ہوموسیکشول" تعلقات کہلاتے ہیں۔ روزمرّہ کی بول چال میں ایسے لوگوں کے لئے "گے" (GAY) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عورتوں کیلئے لیسبینزم (LESBIANISM) کا لفظ بھی مقبولِ عام ہے۔ یہ لفظ یونانی شاعرہ سیپو (SAPPO) کا عطا کردہ ہے جس نے سب سے پہلے جزیرہ لیسبوس (LESBOS) میں ۲ عورتوں کے باہمی جنسی تعلقات کے بارے میں لکھا تھا۔

وہ مرد اور عورتیں جنہیں آج ہم ہوموسیکشول، گے اور لیسبیئن کہہ کر پکارتے ہیں ان کو شمالی امریکہ میں سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں درج ذیل ناموں سے پکارا جاتا تھا:

SAPPHISTS, TRIBADES, PEDERASTS, CATAMITES, SISSIES, URANIADS, ANDROGYNES, CONTRASEXUALS, INVERTS, PERVERTS, QUEERS, FAIRIES, FAGGOTS, DYKES, LESBICS, PANSIES, DEVIENTS, ABNORMALS, VARIANTS, HOMOPHILES.

ہوموسیکشول کی ترکیب امریکی کتابوں میں سب سے پہلے نمودار ہوئی۔ "نیویارک ٹائمز" میں لفظ ہوموسیکشول (HOMO SEXUAL) سب سے پہلے ۱۹۲۶ء میں اور لفظ ہیٹروسیکشول (HETERO SEXUAL) سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں استعمال ہوا تھا۔

جہاں تک الفاظ "گے" اور "لیسبیئن" کا تعلق ہے تو وہ آج بھی بعض حلقوں نے قبول نہیں کیا ہے۔ اگرچہ نیویارک ٹائمز نے "گے" (GAY) کا لفظ سب سے پہلے ۱۹۶۳ء میں استعمال کیا تھا لیکن ٹائمز (TIMES) رسالے نے چند سال پہلے ہوموسیکشول کی بجائے "گے" اور "لیسبیئن" کے الفاظ کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

جب ہم شمالی امریکہ کی معاشرتی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انڈین قبائل جو یہاں ہزاروں برسوں سے بسے ہوتے تھے ان میں دو مردوں اور دو عورتوں کے درمیان جنسی تعلقات کو اسی طرح قبول کیا جاتا تھا جیسے ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان جنسی تعلقات کو۔ اس معاشرے میں ہم جنسی نہ تو گناہ سمجھی جاتی تھی نہ ہی کوئی جرم اور نہ ہی اسے غیر فطری سمجھا جاتا تھا۔ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں یورپی فاتحین نے شمالی امریکہ آکر جب اپنے لنگر ڈالے تو وہ اپنے ساتھ اپنی طرزِ معاشرت، اپنے نظریات و خیالات اور اعتقادات بھی لے کر آئے۔ جب انہوں نے اپنے گناہ و ثواب کے پیمانوں پر قبائلی لوگوں کو پرکھنا شروع کیا تو وہ انسانی تعلقات جو معصوم اور فطری سمجھے جاتے تھے غیر فطری اور غیر سماجی بن گئے۔

ہمیں اس تبدیلی کا احساس ہسپانوی اور فرانسیسی مورخین کی کتابوں کے مطالعے سے ہوتا ہے۔

کاربیزا ڈی واکا (CARBEZA DE VACA) نے ۳۶-۱۵۲۸ء میں ان انڈین مردوں کے بارے میں لکھا ہے جنہوں نے ایک دوسرے سے شادی کر رکھی تھی۔

ٹارقیومیڈا (TORQUEMADA) نے ۱۶۰۹ء میں فلوریڈا (FLOREDA) میں ان مردوں کا ذکر کیا ہے جو عورتوں کا لباس پہنتے تھے اور دوسرے مردوں سے شادی کرتے تھے۔

انڈین قبائل کے یہ ہم جنس تعلقات صرف مردوں تک ہی محدود نہ تھے بلکہ

عورتیں بھی اس میں برابر کی شریک تھیں۔ مورّخین نے کئی عورتوں کا ذکر کیا ہے جو مردوں کا لباس پہنتی تھیں۔ پریجا (PAREJA) نے ۱۶۱۳ء میں اپنی کتاب کنفشل (CONFESSIONAL) میں عورتوں کے درمیان جنسی تعلقات کا ذکر کیا ہے۔

مارقویٹا (MARQUETTA) نے ۷۳-۱۶۷۷ء میں الینوئے (ILLINOIS) میں ان مردوں کا ذکر کیا ہے جو وہ تمام کام کرتے تھے جو روایتی طور پر عورتیں کرتی ہیں۔

پینیسیون (PENSION) نے بھی کینا ٹیکٹ (CONNECTICUT) میں ۱۶۷۷ء میں مردوں کی ایسی دوستیوں اور جنسی تعلقات کا ذکر کیا ہے جو تیس سال کی مدت پر پھیلی ہوئی تھیں۔

ہسپانوی اور فرانسیسی مورخین نے جہاں بھی ان واقعات کا ذکر کیا ہے وہیں انہیں غیر فطری بھی قرار دیا ہے۔ اسی لئے جب یورپی فاتحین نے شمالی امریکہ کی قبائلی زندگی پر اپنا مذہب اور قانون مسلط کیا تو ان لوگوں کو جو ہم جنسی تعلقات رکھتے تھے یا تو گنہگار ثابت کیا یا مجرم۔ اس طرح یہ یورپی نظریات اور اخلاقی معیار شمالی امریکہ کی قبائلی زندگی میں زہر بن کر پھیل گئے۔ یورپی حکام کا یہ خیال تھا کہ وہ ان جنگلیوں کو نیک اور مہذب بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب ہم ان یورپی رجحانات اور نظریات کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے مذہبی اعتقادات کا بڑا ہاتھ ہے۔ عیسائیت نے یورپی اقوام کو یہ منوانے کی کوشش کی تھی کہ جنسی تعلقات کا مقصد افزائشِ نسل ہے اس لئے انسانی جنسی تعلقات صرف شادی کی حدود میں جائز ہیں اور وہ بھی صرف بچے پیدا کرنے کے لئے۔ اس لئے ہر وہ جنسی عمل جو شادی کی حدود سے باہر ہو اور جس کا مقصد خاندان کی وسعت یا بچے پیدا کرنا نہ ہو وہ گناہ ہے۔

اس اصول کی بنیاد پر مشت زنی، مردوں کے مردوں سے جنسی تعلقات، مردوں کی عورتوں سے عقبی مباشرت (ANAL INTERCOURSE) ________ اور مردوں اور مردوں کی دھنی مباشرت (ORAL INTERCOURSE) اور

عورتوں کے عورتوں سے جنسی تعلقات سب گناہ ٹھہرے۔ عیسائیت نے اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ جنسی تعلقات کا مقصد لذّت حاصل کرنا ہرگز نہیں۔
جب بھی ہم عیسائی پادریوں کے بیانات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں دو تاریخی تحریروں کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

GO OUT AND MULTIPLY"

"FOR THIS CAUSE GOD GAVE THEM UP UNTO VILE AFFECTIONS: FOR EVEN THEIR WOMEN DID CHANGE THE NATURAL USE INTO THAT WHICH IS AGAINST NATURE: AND LIKEWISE, ALSO THE MEN, LEAVING THE NATURAL USE OF THE WOMAN, BURNED IN THEIR LUST ONE TOWARD ANOTHER, MEN WITH MEN WORKING THAT WHICH IS UNSEEMLY AND RECEIVING IN THEMSELVES THAT RECOMPENSE OF THEIR ERROR WHICH WAS MEET"

(NEW TESTAMENT :— ST. PAUL'S EPISTLE TO THE ROMANS. 1:26-27 - KING JAMES TRANSLATION)

ہم جنسی تعلقات کو اس قدر بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے کہ ۱۶۴۲ء میں پادری جان رینر (JOHN RAYNER) نے اس کی سزا موت تجویز کی۔
۱۶۴۶ء میں ولیم پلین (WILLIAM PLAINE) کو جب موت کی سزا دی گئی تو جان ونتھروپ (JOHN WINTHROP) نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ پلین نے شادی شدہ مرد ہونے کے باوجود ایسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے جو افزائشِ نسل کے اصول کو پسِ پشت ڈالتا ہے۔
۱۶۷۴ء میں پادری ڈینفورتھ نے اپنے مشہور وعظ (CRY OF SODOM) میں امریکی عوام کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے ہم جنسی رشتوں سے توبہ نہ کی تو پوری قوم پر

عذاب نازل ہوگا۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں جوں جوں مذہب اور سیاست کے دائرے علیحدہ ہونے لگے تو وہ جنسی تعلقات جو پہلے گناہ سمجھے جاتے تھے وہ آہستہ آہستہ غیر قانونی جرم بننے لگے اور ان میں ایک ہم جنسی تعلقات بھی شامل تھے۔ ۱۵۳۳ء میں سب سے پہلے ہم جنسی کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ عمل جو مذہبی حلقوں میں SODOMY کے نام سے جانا جاتا تھا کیوں کہ اس کا تعلق انجیل کے SODOM AND GUMURRAH کے گناہوں سے تھا۔ اسے قانونی حلقوں میں BUGGERY کا نام دیا گیا جس کا تعلق عوامی زبان سے تھا۔ اس فرق سے ملکی قوانین نے مذہبی قوانین سے نجات حاصل کی اور یہ قانون POPE اور KING کے درمیان حدِ فاصل ہوا۔

انگلستان اور امریکہ دونوں ممالک میں ہم جنسی کے جرم کو بڑے جرائم میں شمار کیا جاتا تھا اور اس کی سزا موت تھی۔

شمالی امریکہ کی تاریخ میں بیسیوں نہیں سیکڑوں ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں لوگوں کو ہم جنسی تعلقات پر اذیت ناک سزائیں دی گئیں۔

دسمبر ۱۶۴۲ء میں الزبتھ جانسن کو میساچوسٹی (MASSACHUSETTE) میں عدالت نے کوڑوں کی سزا دی کیوں کہ اس نے اپنی خادمہ سے جنسی تعلقات قائم کئے تھے۔

۱۷۳۴ء میں جارجیا میں ایک شخص کو ہم جنسی کے جرم میں تین سو کوڑوں کی سزا دی گئی۔

۱۶۴۶ء میں ولیم پلین کو ہم جنسی کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

جہاں بعض ریاستوں میں ہم جنسی تعلقات گناہ، بعض ریاستوں میں جرم سمجھے جانے لگے تھے وہیں بعض ریاستوں میں انہیں غیر فطری قرار دیا گیا تھا۔ (۱۶۸۳ء میں پنسلوینیا کی حکومت نے اسے غیر فطری قرار دیا تھا۔"

جب ہم ان تاریخی حوالوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں ہم جنسی تعلقات کو غیر فطری قرار دیا جاتا رہا ہے تو ان میں ہمیں یہ منطق نظر آتی ہے کہ جنسی ملاپ کا مقصد افزائش نسل ہے۔ چونکہ وہ دور کاشتکاری کا تھا اس لئے اس دور کی تشبیہات اور استعارے بھی کسانوں کی زندگی کے قریب تھے۔ ان تحریروں میں مرد کی منی کو بیج، عورت کو کھیتی، بچوں کو فصل سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ اس سوچ کے مطابق اگر مرد اپنی منی کو بچوں کی پیدائش کے لئے استعمال نہیں کرتا تو اسے غیر فطری اور گناہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس دور میں انسانی تعلقات کے لئے زرعی اصطلاحات استعمال کی گئیں۔

چاہے ہم جنسی تعلقات کو گناہ سمجھا گیا ہو، غیر قانونی قرار دیا گیا ہو یا غیر فطری جانا گیا ہو ان سب کا حل یا تو کوڑوں کی سزائیں تھیں یا سزائے موت۔

سیکڑوں سالوں کی اس اذیت ناک زندگی کے بعد شمالی امریکہ کا سماجی شعور اتنا بیدار ہوا کہ اسے قانونی طور پر قبول کر لیا گیا۔

نیویارک میں ۱۷۹۶ء میں ہم جنسی تعلقات کے لئے موت کی سزا کو ختم کیا گیا اور جنوبی کیرالائنا (SOUTH CAROLINA) میں ۱۸۷۳ء میں اس قانون کو بدلا گیا اور اس طرح اس تاریک دور کا ایک باب ختم ہوا۔

جب ہم ہوموسیکشویلیٹی کے سماجی ارتقا کی کہانی میں انیسویں اور بیسویں صدی کے ابواب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں واضح تبدیلی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سولہویں سے ۱۸ ویں صدی تک کا زمانہ نظریات و اخلاقی تعصبات کی جکڑبندیوں میں قید تھا تو انیسویں اور بیسویں صدی طب، نفسیات اور ادبی اقدار کی علمبردار رہے۔ سائنسی تحقیقات نے انسانی سوچ کے نئے دروازے کھول دئے ہیں اور علم و آگہی کی ایسی روشنی در آئی تھی کہ جہالت اور تعصب نے آہستہ آہستہ پچھلے دروازے سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن یہ عمل کسی بھی ارتقائی عمل کی طرح بہت آہستہ آہستہ وقوع پذیر ہوا اور آج بھی ہم جہاں ایک طرف سائنس اور بالغ نظری کا دامن پکڑے ہوئے ہیں تو دوسری طرف اپنے ماضی کے تعصبات اور نظریات کو چھوڑتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ آج بھی جب ہم

حقیقتوں کے آئینوں میں اپنی شکلیں دیکھتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں اور اپنی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو فخر کرنے کی بجائے ہماری نگاہیں اور گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔

انیسویں صدی میں مغرب کے دانش وروں میں ہم جنسی تعلقات کے بارے میں ایک نئی بحث کا آغاز ہوا۔ اس بحث میں شامل ہونے والے ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہم جنسی تعلقات کو گناہ یا جرم قرار دینا ناانصافی ہے۔ اسے ذہنی بیماری یا نفسیاتی کجی یا دماغی خلل قرار دینا چاہئیے اور اس میں ملوّث لوگوں کو سزا دینے کی بجائے ان کا علاج کرنا چاہئیے، ان پر ظلم ڈھانے کے بجائے ان سے ہمدردانہ سلوک رکھنا چاہئیے لیکن دوسرا گروہ اسے ذہنی بیماری بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ مصر تھا کہ دو مردوں اور دو عورتوں کے درمیان تعلقات کو وہی مقام حاصل ہونا چاہئیے جو ایک مرد اور ایک عورت کے تعلقات کو حاصل ہے۔ یہ بحث کافی طول کھینچ گئی اور بعض حلقوں میں آج تک جاری ہے۔

جب اس بحث کا آغاز ہوا تو ہم جنسی تعلقات کو بیماری اور ABNORMAL ثابت کرنے والوں میں KRAFT-EBBING اور DR KIERMAN کا نام سرفہرست تھا۔ ڈاکٹر کائرمین نے اپنے مضامین اور ابنگ نے اپنی کتاب PSYCHOPATHICA SEXUALIS میں HOMOSEXUALISM کو ذہنی کجی قرار دینے کی کوشش کی۔

ان دونوں کے مقابلے میں جرمنی کا ایک ڈاکٹر DR BENKERT صف آرا تھا جس نے ۱۸۶۹ء میں سب سے پہلے جرمن لفظ HOMOSEXUALITAT استعمال کیا تھا۔ وہ خود بھی ہوموسیکشول تھا۔ اس نے SODOMY کے قانون کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی تھی اور اپنے قبیلے کے لوگوں کے قانونی حقوق کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دو مردوں اور دو عورتوں کے ذاتی تعلقات میں مذہب اور عدالتوں کو دخل اندازی کی ضرورت نہیں ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر بنکرٹ کا استعمال کردہ لفظ HOMOSEXUAL

تیس سال کے بعد خود اس کے مخالفین نے قبول کر لیا تھا اور اس کے بعد یورپ اور امریکہ میں سب ہم جنس لوگ ہوموسیکشول کہلانے لگے۔

انیسویں صدی کے آخر میں انگلستان کے مشہور ادیب آسکر وائلڈ (OSCAR WILDE) پر ہم جنسی تعلقات کی بنیاد پر مقدمہ چلانے اور اسے سخت سزا ملنے نیز ہیولاک ایلس (HAVELOCK ELLIS) کی کتاب (SEXUAL INVERSION) پر پابندی لگانے کے واقعات نے مغربی دنیا میں خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی تھی

بیسویں صدی کے آغاز میں مردوں کے عورتوں کے لباس پہننے اور عورتوں کے مردوں کے لباس پہننے کے عمل نے بھی بہت سے ماہرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور کئی ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات نے اسی عمل کے لئے خاص نام بھی تجویز کئے تھے۔

جرمنی میں ۱۹۱۰ء میں ڈاکٹر ہرشفیلڈ (HIRSCHFIELD) نے اسے DIE TRANSVESTISM کا نام دیا تھا جبکہ امریکہ میں ڈاکٹر ایلس (ELLIS) نے ۱۹۲۰ء میں D'EONISM کہہ کر پکارا تھا۔

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں جہاں ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات صحت اور بیماری کے جھگڑوں میں الجھے ہوئے تھے اس دوران ادیب، مفکر اور فنکار انسانی رشتوں کی معصومیت اور احترام کا ترانہ گا رہے تھے ان کے نزدیک انسانی رشتوں اور جذبوں کا احترام ایک بنیادی قدر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جنسی تعلقات کو اعتبار ملے، چنانچہ انہوں نے انگریزی زبان کے الفاظ اور ان کے معانی کو بدلنے کی کوشش کی۔ وہ الفاظ کی طاقت سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ زبان بدلنے سے لوگوں کے دل بدل جاتے ہیں۔

انگریزی کے ادیبوں نے LOVER کے لفظ کے مفہوم کو بدلا۔ کسی زمانے میں اس سے روحانی محبت مراد لی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس میں جنسی اور جسمانی جذبات بھی شامل کئے گئے اور پھر "TO MAKE LOVE TO" جیسی اصطلاحات رائج کی گئیں جن سے جنسی تعلقات مراد لی جانے لگی۔ اسی طرح SEX کا لفظ جس سے مراد مرد اور عورت لی جاتی تھی اس سے بھی مراد جنسی تعلقات لی جانے لگی۔ اس طرح

جنس اور جنسی تعلقات پر جوانانی زندگی کا حصہ ہیں کھل کر باتیں ہونے لگیں۔

جہاں ایک طرف ادیب آزادیٔ فکر کے حصول کے لئے کوشاں تھے تو دوسری طرف قوم کے مبلغین اور روایت پرست لوگ قوم کی تباہی کے لئے پریشان تھے چنانچہ انہوں نے ادیبوں کی کتابوں پر پابندیاں عائد کرانے کی کوششیں کیں۔

اس دور میں جن کتابوں نے معاشرتی رویوں کو بدلا تھا ان میں سے چند ایک کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں ریڈ کلف ہال (RADCLUFF HALL) کے مشہور ناول "تنہائی کے کنویں" (THE WELL OF LONELINESS) پر پہلے انگلستان پھر امریکہ میں پابندی عائد کر دی گئی۔

ہال کی محبوبہ اونا ٹربنبریج (UNA TRUNBRIDGE) نے اس ناول کا ترجمہ فرانسیسی میں کیا۔

ڈوروتھی بسی (DOROTHY BUSSY) نے اپنی سوانح "اولیویا" (OLIVIA) کے نام سے چھاپی جس میں عورتوں کے ہم جنسی تعلقات کو انسانی حقوق کی جنگ کے طور پر پیش کیا گیا۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں ڈایانا فریڈرکز (DIANA FREDRICKS) نے اپنی سوانح "ڈایانا" "DIANA" کے نام سے چھاپی۔

مارینی (MA RAINY) کا گیت (PROVE IT ON ME BLUES) بہت مشہور ہوا۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں رابرٹ ڈنکن (ROBERT DUNCAN) کے مضمون (THE HOMOSEXUAL IN SOCIETY) نے اس تحریک کے معاشرتی پہلو کو ایک موڑ دیا۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں جو سنکلیر (JO SINCLAIR) کے ناول "WASTELAND" اور سنہ ۱۹۴۹ء میں جیمز بالڈون جیسے معتبر ادیب کی کتاب "STUDIES OF A NEW MORALITY" نے امریکی زندگی پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور ہم جنسوں کی تحریک کو ایک نئی زندگی بخشی۔

بیسویں صدی کی پانچویں، چھٹی اور ساتویں دہائی میں سائنس نے ایک دفعہ پھر انگڑائی لی۔ ایک طرف طب اور نفسیات کی تحقیقات درپردہ ہو رہی تھی اور فرائڈ جیسے مفکروں کے خیالات غیر شعوری طور پر عوام و خواص کو متاثر کر رہے تھے۔ سائنسی تحقیق نے ایک نیا موڑ لیا۔

اس سلسلے میں کنزی (KINSEY) کی کتابوں:

THE HUMAN MALE (1948)

THE HUMAN FEMALE (1953)

ماسٹرز جانسن (MASTERS + JOHNSON) کی کتاب:

HUMAN SEXUAL RESPONSE (1966)

اور فوکو (FOUCAULT) کی کتاب:

THE HISTORY OF SEXUALITY (1978)

نے جنسی انقلاب کو نئی بنیاد فراہم کیا۔ ان محققین نے سالہا سال کی تحقیق سے ثابت کیا کہ شمالی امریکہ کے لوگ صدیوں سے خود فریبی کا شکار رہے ہیں۔ انہوں نے اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ انسانی تعلقات کو صرف ہوموسیکشول اور ہیٹروسیکشول گروہوں میں تقسیم کرنا حقیقتوں سے چشم پوشی ہے۔ انسانی رشتے بہت پیچیدہ اور گنجلک ہوتے ہیں اور ان کے بہت سے رنگ اور خوشبوئیں ہوتی ہیں۔ کنزی نے ثابت کیا کہ شمالی امریکہ کے مردوں اور عورتوں میں ۵۰ سے ۵۰ فیصد تک لوگ نوجوانی سے بڑھاپے تک کے ادوار میں کسی نہ کسی موڑ پر ہم جنسی تعلقات میں شریک ہوتے ہیں۔

اسی دوران شمالی امریکہ کے ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات کو ایسے شواہد ملے جن کی بنا پر انہیں ہوموسیکشوئیلٹی کو ذہنی امراض کی فہرست سے خارج کرنے کے بارے میں سوچنا پڑا اور آخر کار امریکہ کے ماہرینِ نفسیات کے سالانہ اجلاس میں اس موضوع پر بحث ہوئی اور پھر ووٹنگ ہوئی (جبکہ کانفرنس کی عمارت کے باہر ہزاروں ہوموسیکشول احتجاج کر رہے تھے) اس طرح ہوموسیکشوئیلٹی کو ذہنی امراض کی فہرست سے خارج کر دیا

گیا۔ یوں امریکہ کے ماہرین نے مان لیا کہ ہوموسیکشول لوگوں کے مسائل ہیٹروسیکشول لوگوں کے مسائل کی طرح ہیں۔

اسی دوران شمالی امریکہ میں کالوں، عورتوں اور دیگر اقلیتوں نے اپنے حقوق کی تحریک تیز کر دی تھی، چنانچہ ہوموسیکشول لوگوں نے بھی اپنے آپ کو اقلیت قرار دیا اور ہیٹروسیکشولز کی اکثریت سے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا۔ یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اگرچہ یورپ نے شمالی امریکہ کے قبائل پر اپنے نظریات اور قوانین ٹھونسے تھے لیکن چار سو سال کے بعد یورپ ہوموسیکشولز کے انسانی حقوق کے حصول کی جنگ میں شمالی امریکہ سے چند قدم آگے ہے۔ اسکنڈی نیوین ممالک (SCANDANAVIAN) میں ہوموسیکشولز کو وہ حقوق اور مراعات حاصل ہیں جو شمالی امریکہ میں حاصل نہیں۔ اگرچہ شمالی امریکہ کے بعض گرجوں نے ان کے حقوق کو تسلیم کیا ہے اور ان کی شادیاں بھی کی ہیں لیکن ان شادیوں کو قانونی حیثیت حاصل نہیں اس لئے وہ جوڑے

نہ شادی کا قانونی سرٹیفیکیٹ حاصل کر سکتے ہیں

نہ انشورنس کے لئے درخواست دے سکتے ہیں

نہ امیگریشن حاصل کر سکتے ہیں

حتیٰ کہ جب کسی ہوموسیکشول کا بیس برس کا شریکِ حیات مر جاتا ہے تو اسے دفتر سے تین دن کی چھٹی بھی نہیں ملتی کہ وہ اپنے محبوب کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کر سکے اور اس کے جنازے میں شریک ہو سکے۔

مغرب کے اہالیانِ دل یہ امید رکھتے ہیں کہ ایک دن ہم دو مردوں اور دو عورتوں کے درمیان جسمانی، ذہنی اور روحانی رشتوں کو اتنا ہی قابلِ احترام سمجھیں گے جتنا کہ ہم ایک مرد اور ایک عورت کے رشتے کو سمجھتے ہیں — اور وہ دن اب زیادہ دور نہیں لگتا۔

؏ "لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے"

٭٭٭
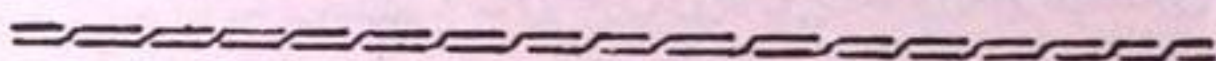
پچھلی چند دہائیوں میں بین الاقوامی اداروں نے مختلف ممالک میں انسانی حقوق کے تحفظ اور بحالی کے لئے جو اقدامات اٹھائے ہیں ان میں سے ایک قدم ان حقوق کی محرومی اور استحصال کی شناخت کرنا بھی ہے۔ مختلف اداروں نے ان حقوق کی فہرست تیار کی ہے جو ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کے لئے ضروری ہیں۔ وہ ممالک اور معاشرے جن میں انسانوں کو وہ حقوق حاصل ہیں وہاں ایک آزادانہ فضا کے امکانات زیادہ دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ ممالک جہاں ان حقوق کا یا تو شعور پیدا نہیں ہوا یا عوام ان حقوق سے محروم ہیں وہاں استحصال اور ظلم و جبر کے امکانات زیادہ ہیں۔ ان حقوق میں سے ایک حق دو بالغ انسانوں کے درمیان چاہے وہ ایک مرد ہو اور ایک عورت، دو مرد ہوں یا دو عورتیں، باہمی رضامندی سے رومانوی اور جنسی تعلقات کا حق بھی شامل ہے۔

چارلز ہیومینیا نے جو مختلف ممالک میں انسانی حقوق کے موضوع پر طویل عرصے سے تحقیق کر رہے ہیں سنہ ۱۹۸۴ء میں "WORLD HUMAN RIGHTS GUIDE" تیار کی تھی جس میں انہوں نے بین الاقوامی اداروں کی مدد سے انفرادی اور معاشرتی زندگی کے چالیس ایسے پہلوؤں کی فہرست تیار کی ہے جن کا تعلق انسانی حقوق سے ہے اور پھر ہر ملک کی قانونی اور معاشرتی زندگی کو اس کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔

اگرچہ پوری دنیا میں ایک بھی ملک ایسا نہیں ہے جہاں عوام کو صد فیصد حقوق حاصل

ہوں لیکن بعض ممالک کے رہنے والوں کو ۹۰ فیصد سے زیادہ حقوق حاصل ہیں اور بین الاقوامی ادارے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ باقی ممالک میں ان حقوق کے حصول کی جدوجہد کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

انسانی حقوق کی گفتگو میں یہ پہلو نہایت اہم ہے کہ بعض ممالک میں بعض حقوق کو قانونی حیثیت حاصل تو ہوگئی ہے لیکن بعض انسانوں کو اب بھی معاشرتی دباؤ اور تعصب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انسانی حقوق کی بحالی میں قانونی اور معاشرتی تبدیلیاں لازم و ملزوم ہیں اور یہ عمل انسانی معاشرے کے ارتقاء کا عمل ہے جو انقلاب کی نسبت سست خرام لیکن دیرپا ہوتا ہے۔

انسانی حقوق کا تعلق جہاں ایک طرف افراد کی آزادی کا ہے تو دوسری طرف سماج اور حکومت سے ہے۔ ایک صحت مند اور آزاد معاشرے میں حکومت پر ایسی قانونی پابندیاں عائد ہوتی ہیں جو انہیں شہریوں کو ناجائز اور غیر منصفانہ سزائیں دینے سے روکے رکھتی ہیں۔ بین الاقوامی ادارے زندگی کے جن چالیس پہلوؤں کو انسانی حقوق میں شمار کرتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱: اپنے ملک کے اندر سفر کرنے کی آزادی۔
۲: ملک سے باہر سفر کرنے کی آزادی۔
۳: لوگوں کے جمع ہونے کی آزادی۔
۴: لوگوں کے نقطۂ نظر کے اظہار اور تبادلۂ خیال کی آزادی۔
۵: ملک میں انسانی حقوق کے استحصال پر بین الاقوامی اداروں کے سروے کی آزادی۔
۶: اقلیتوں کو اپنی زبان پڑھنے اور سیکھنے کی آزادی۔
۷: غلامی اور بچوں سے جبری مشقّت کرانے پر پابندی۔
۸: بغیر مقدمہ چلائے سزائے موت پر پابندی۔
۹: حکومت پر عوام سے ظالمانہ سلوک کرنے پر پابندی۔
۱۰: حکومت پر عوام سے جبری مشقّت کرانے پر پابندی۔

۱۱: حکومت پر لوگوں کو سزائے موت دینے پر پابندی۔
۱۲: ملزم کو جسمانی سزا دینے پر پابندی۔
۱۳: مقدمہ چلائے بغیر طویل عرصے تک جیل میں رکھنے پر پابندی۔
۱۴: حکومت کے اداروں اور سیاسی پارٹیوں میں جبری شمولیت پر پابندی۔
۱۵: اسکولوں میں جبری مذہبی تعلیم پر پابندی۔
۱۶: فنکاروں کو فنی اظہار کی آزادی۔
۱۷: اخباروں کو اپنی رائے کے اظہار کی آزادی۔
۱۸: خطوط اور ٹیلی فون پر سنسر شپ پر پابندی۔
۱۹: حکومت پر پرامن سیاسی مخالفت کی آزادی۔
۲۰: مختلف سیاسی پارٹیوں کو خفیہ ووٹ دینے کی آزادی۔
۲۱: عورتوں کو سیاسی اور قانونی برابری۔
۲۲: عورتوں کو معاشرتی اور اقتصادی برابری۔
۲۳: اقلیتوں کو معاشرتی اور اقتصادی برابری۔
۲۴: خود مختار اخبار نکالنے کی آزادی۔
۲۵: کتابوں کو چھاپنے کی آزادی۔
۲۶: ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں کی آزادی۔
۲۷: عدالتوں کی آزادی۔
۲۸: ٹریڈ یونین قائم کرنے کی آزادی۔
۲۹: شہریت کو ہمیشہ قائم رکھنے کی آزادی۔
۳۰: جب تک جرم ثابت نہ ہو ہر شہری کو معصوم سمجھے جانے کی ضمانت۔
۳۱: جو شخص صاحب استطاعت نہ ہو اس کیلئے حکومت کیطرف سے وکیل کا تقرر۔
۳۲: در پردہ عدالت قائم کرنے پر پابندی۔
۳۳: ملزم کو بلا تاخیر جج یا حکومت کے سامنے لائے جانے کا حق۔

۳۴: وارنٹ کے بغیر پولیس کی گھر کی تلاشی پر پابندی۔

۳۵: کسی کی بلاوجہ ملکیت ضبط کرنے پر پابندی۔

۳۶: رنگ، نسل اور مذہب سے بالاتر ہو کر شادی کرنے کی آزادی۔

۳۷: شادی اور طلاق میں جانبین کو برابری کا حق۔

۳۸: کسی کی مذہب کی پیروی کی اجازت۔

۳۹: مانع حمل ادویہ کے استعمال کی آزادی۔

۴۰: ایک ہی جنس کے بالغوں کے درمیان باہمی آزادی سے جنسی تعلقات کی آزادی۔

ہم جنسی حقوق کا بین الاقوامی جائزہ

نمبر	ملک (۱)	انسانی حقوق (۲)	حق ہے (۳)	عمر (۴)	حق نہیں ہے (۵)	سزا یا جواز (۶)
۱	الجیریا	۴۵ فیصد			✓	
۲	ارجنٹینا	۸۸ ″ ″	✓	۲۲ سال کی عمر کے بعد		
۳	آسٹریلیا	۹۴ ″ ″	✓			
۴	آسٹریا	۹۶ ″ ″	✓	۱۹ سال کی عمر کے بعد		
۵	بنگلہ دیش	۴۴ ″ ″			✓	سات سال کی قید
۶	بلجیئم	۹۶ ″ ″	✓	۱۸ ″ ″ ″ ″		
۷	بینن	۵۹ ″ ″	✓			خفیہ طور پر اجازت
۸	بولیویا	۷۰ ″ ″	✓			سزا پولس پر منحصر ہے
۹	بوٹسوانا	۷۸ ″ ″			✓	
۱۰	برازیل	۷۱ ″ ″	✓			
۱۱	بلغاریہ	۲۳ ″ ″			✓	تین سے پانچ سال قید
۱۲	کیمرون	۵۳ ″ ″			✓	غیر فطری عمل سمجھا جاتا ہے
۱۳	کینیڈا	۹۶ ″ ″	✓	۲۱ ″ ″ ″ ″		نابالغ بچوں کی ترغیب جرم ہے
۱۴	چلی	۳۵ ″ ″			✓	تین سے ۵ سال قید
۱۵	چین	۲۳ ″ ″			✓	
۱۶	کولمبیا	۵۷ ″ ″	✓			اسکول اور حکومت کے ادارے متعصب ہیں
۱۷	کوسٹاریکا	۹۱ ″ ″	✓			
۱۸	کیوبا	۲۶ ″ ″			✓	

	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۱۹	چیکوسلواکیہ	۳۶ فیصد	✓	۱۸ سال کی عمر کے بعد		
۲۰	ڈنمارک	۹۸ 〃 〃	✓			
۲۱	ڈومینیکن ریپبلک	۸۴ 〃 〃			✓	
۲۲	اکیوڈور	۸۳ 〃 〃			✓	
۲۳	مصر	۵۹ 〃 〃			✓	
۲۴	ایتھوپیا	۱۳ 〃 〃			✓	
۲۵	فن لینڈ	۹۸ 〃 〃	✓			
۲۶	فرانس	۹۴ 〃 〃	✓			
۲۷	گھانا	۴۶ 〃 〃			✓	
۲۸	یونان	۹۲ 〃 〃	✓	۱۷ سال کی عمر کے بعد		
۲۹	ہانگ کانگ	۸۳ 〃 〃			✓	عمر قید
۳۰	ہنگری	۵۵ 〃 〃	✓			
۳۱	انڈیا	۶۰ 〃 〃			✓	غیر فطری عمل سمجھا جاتا ہے
۳۲	انڈونیشیا	۳۰ 〃 〃	✓			
۳۳	عراق	۱۹ 〃 〃			✓	
۳۴	آئرلینڈ	۸۶ 〃 〃			✓	دس سال قید
۳۵	اسرائیل	۷۴ 〃 〃			✓	
۳۶	اٹلی	۸۷ 〃 〃	✓			
۳۷	جمیکا	۷۷ 〃 〃			✓	دس سال قید
۳۸	جاپان	۸۸ 〃 〃	✓	۱۸ 〃 〃 〃 〃		
۳۹	کینیا	۴۸ 〃 〃			✓	۵ سے ۱۴ سال قید/جسمانی سزا
۴۰	شمالی کوریا	۱۷ 〃 〃			✓	حکومت کے مطابق ایسے لوگ ملک میں ہیں ہی نہیں

	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۴۱	جنوبی کوریا	۵۹ فیصد			✓	
۴۲	کویت	۴۹ ״ ״			✓	
۴۳	لائبیریا	۳۹ ״ ״			✓	
۴۴	لیبیا	۲۳ ״ ״			✓	
۴۵	ملائشیا	۵۳ ״ ״			✓	بیس سال قید
۴۶	میکسیکو	۶۲ ״ ״			✓	غیر اخلاقی عمل سمجھا جاتا ہے
۴۷	موراکو	۵۲ ״ ״			✓	
۴۸	موزمبیک	۲۵ ״ ״	✓			
۴۹	نیدرلینڈ	۹۸ ״ ״	✓			
۵۰	نیوزی لینڈ	۹۸ ״ ״	✓			
۵۱	نائجیریا	۵۳ ״ ״			✓	۱۴ سال قید / غیر فطری عمل
۵۲	ناروے	۹۷ ״ ״	✓	۱۶ سال کی عمر کے بعد		
۵۳	پاکستان	۴۰ ״ ״			✓	دو سال قید - سو کوڑے
۵۴	پاناما	۷۹ ״ ״			✓	
۵۵	نیوگینی	۹۱ ״ ״	✓			
۵۶	پاراگوئے	۴۸ ״ ״			✓	
۵۷	پیرو	۶۳ ״ ״	✓			
۵۸	فلیپین	۸۶ ״ ״	✓			نابالغوں کیساتھ ۱۲ سال قید
۵۹	پولینڈ	۴۱ ״ ״	✓			
۶۰	پرتگال	۹۱ ״ ״	✓	۱۸ ״ ״ ״ ״		
۶۱	رومانیہ	۲۰ ״ ״			✓	۵ سال قید
۶۲	سعودی عرب	۲۸ ״ ״			✓	سزا سر قلم ہوسکتا ہے

	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۶۳	سینیگال	۷۷ " "			✓	
۶۴	سیرالیون	۶۴ " "			✓	غیر فطری عمل سمجھا جاتا ہے
۶۵	سنگالیہ	۵۹ " "			✓	
۶۶	جنوبی افریقہ	۲۲٪ "			✓	مختلف نسلوں کے لوگوں کے درمیان ہو تو جیل کی سزا
۶۷	اسپین	۸۴ " "	✓			
۶۸	سویڈن	۹۸ " "	✓			
۶۹	سوئزرلینڈ	۹۵ " "	✓			
۷۰	شام	۲۹ " "			✓	تین مہینے کی قید
۷۱	تائیوان	۵۰ " "			✓	سزائے موت
۷۲	تنزانیہ	۴۷ " "			✓	۱۴ سال قید
۷۳	تھائی لینڈ	۵۷ " "	✓			
۷۴	ٹرینیڈاڈ	۷۹ " "			✓	ملک میں داخلے کی اجازت نہیں
۷۵	تیونیسیا	۶۰ " "			✓	
۷۶	ترکی	۴۱ " "	✓			
۷۷	سوویت روس	۲۰ " "			✓	
۷۸	برطانیہ	۹۴ " "	✓	۲۱ سال کی عمر کے بعد عورتوں پر کوئی قید نہیں		
۷۹	امریکہ	۹۰ " "	✓			
۸۰	یوراگوئے	۹۱ " "	✓			
۸۱	وینی زویلا	۸۸ " "	✓	۱۸ " " " " "		
۸۲	ویت نام	۲۵ " "			✓	

	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۸۳	یوگوسلاویہ	۵۰،، ،،			✓	بعض حصوں میں ایک سال قید
۸۴	زائرے	۳۰،، ،،			✓	
۸۵	زیمبیا	۵۱،، ،،			✓	مسافروں کو ملک بدر کر دیا جاتا ہے۔

جب ہم بین الاقوامی پس منظر میں انسانی اور جنسی حقوق پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ آج بھی آدھی سے زیادہ دنیا گے اور لیسبین انسانوں کے حقوق کا قانون اور معاشرتی طور پر احترام کرنے کو تیار نہیں۔ بعض ملکوں میں تو ایسے لوگ قانونی طور پر سزا بھی پا سکتے ہیں چاہے وہ ملک بدر ہونے کا حکم ہو، کوڑے لگانے یا جیل جانے کی سزا ہو یا سزائے موت۔

اگر ہم مختلف ملکوں کے قانونی اور معاشرتی رویوں کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بعض معاشروں میں گے اور لیسبین انسانوں کے ملاپ کو غیر قانونی، بعض میں غیر اخلاقی اور کچھ میں غیر فطری سمجھا جاتا ہے۔

شمالی کوریا جیسے ملک میں جہاں عوام کو صرف ۷ فیصد حقوق حاصل ہیں حکومت نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ہمارے ملک میں گے اور لیسبین انسان موجود ہی نہیں ہیں جبکہ آسٹریا جیسے حقیقت پسند ملک نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اس ملک کی دس فیصد آبادی (گویا ہر دس میں سے ایک شخص) ہوموسیکشول ہے۔

ان ممالک میں جہاں عوام کو جنسی حقوق حاصل ہیں وہاں بھی عمر کا بہت فرق ہے۔ ایک طرف تو وہ ممالک ہیں جن میں عمر کی قید اکیس سال ہے اور دوسری طرف ۱۵ سال۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ممالک میں جنس مخالف سے جنسی تعلقات کی اجازت کی عمر کم ہے گویا ہوموسیکشول (HOMOSEXUAL) کی جنسی زندگی پر ہیٹروسیکشول (HETEROSEXUAL) کی جنسی زندگی کی بہ نسبت چند سالوں کی پابندی عاید ہے۔

ڈنمارک شاید دنیا کا واحد ملک ہے جہاں نہ صرف حکومت نے اپنی دس فیصد آبادی

کے حقوق کا احترام کیا ہے بلکہ اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ ملک میں باقی نوّے فیصد آبادی اس دس فیصد اقلیت کو اپنے تعصبات کا نشانہ نہ بنائے۔ بین الاقوامی ادارے یہ امید رکھتے ہیں کہ ڈنمارک نے جو اقدامات اٹھائے ہیں ان سے باقی دنیا کے ممالک بھی اثرات قبول کریں گے اور مستقبل قریب میں اس اقلیت کو بھی اس کے جائز حقوق مل سکیں گے۔
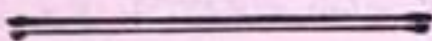
جب ہم ہوموسیکشویلیٹی کے تصور کو سمجھنے کے لئے سائنس کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو بہت جلد ANATOMY ، GENETICS ، PHYSIOLOGY ، MEDICINE ، PATHOLOGY ، PSYCHOLOGY اور SEXOLOGY کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں اور اگر ہم اس مقام تک پہنچ بھی جائیں جہاں ہماری ملاقات کسی ہوموسیکشول سے ہو تو ہمیں وہ ایسی دھند میں گھرے ملتے ہیں جہاں کوئی اپنے آپ کو HERMAPHRODITE کہتا ہے تو کوئی TRANSEXUAL اور بعض کہتے ہیں کہ ہم صرف TRANSVESTITES ہیں۔
وہ ایسا ماحول ہے جہاں عوام تو کیا خواص بھی اپنی کم علمی سے متعارف ہوتے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ہم اپنے تعصبات کو گھر چھوڑ کر نہ آئیں اور چیزوں کو نئے انداز سے دیکھنے کے لئے تیار نہ ہوں تو ہم زیادہ نہیں سیکھ سکتے۔ ہوموسیکشویلیٹی کی بحث میں ہمیں احساس ہوتا ہے کہ SEX کا لفظ جسے ہم صرف مرد اور عورت یا جنسی مباشرت کے لئے استعمال کرتے تھے اور بھی بہت سے مفاہیم لئے ہوئے ہے جو صرف طب اور نفسیات کی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ اسی لئے جب اس موضوع پر لوگ تبادلۂ خیال کر رہے ہوتے ہیں تو انہیں گھنٹوں گفتگو کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دو مختلف چیزوں کے بارے میں اظہار خیال کر رہے ہوتے ہیں۔

چونکہ ہمارا مقصد ہوموسیکشوئیلٹی کے تصور کو سائنسی نقطۂ نگاہ سے سمجھنا ہے اس لئے ہم مختصراً ان تصورات کا جائزہ لیں گے جن کو سمجھنے کے بعد ہمارے لئے ہوموسیکشوئیلٹی کی تفہیم آسان ہو جائے گی اور ہم غیر ضروری بحث میں الجھنے سے بچ جائیں گے۔

انسانی بچہ حمل سے بلوغت تک انسانی اور جنسی ارتقا کے جن مراحل سے گزرتا ہے انہیں ہم افہام و تفہیم کے لئے پانچ مراحل میں تقسیم کر سکتے ہیں اور ان میں ہر مرحلہ اپنی جداگانہ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر مرحلے کو سمجھنا انسان کی جنسی زندگی سے پوری طرح واقفیت کے لئے ضروری ہے۔

SEXUAL PERFORMANCE

↑

SEXUAL ORIENTATION

↑

SEXUAL (GENDER) IDENTITY

↑

ANATOMIC SEX

↑

GENETIC SEX

GENETIC SEX:

انسانی بچہ اپنی ماں کے OVUM اور باپ کے SPERM کے ملاپ سے معرضِ وجود میں آتا ہے اور ان میں سے ہر ایک میں کروموسومز CHROMOSUMES کے تیئیس ۲۳ جوڑے ہوتے ہیں۔ ان تیئیس میں سے بائیس ۲۲ جوڑے اوٹوسوم (22 PAIRS OF AUTOSOME) کہلاتے ہیں جو انسان کی باقی خصوصیات کا فیصلہ کرتے ہیں اور ایک جوڑا جنسی کروموسوم (1 PAIR OF SEX CHROMOSOME) کہلاتا ہے جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ بچہ لڑکا ہوگا یا لڑکی۔

ماں کے OVUM کے جنسی کروموسوم ہمیشہ (XX) ہوتے ہیں لیکن باپ کے SPERM میں آدھے جنسی کروموزوم (X) ہوتے ہیں اور آدھے (Y)۔ اس لئے بچے کی پیدائش کے لئے ماں کی طرف سے تو ہمیشہ (X) کروموسوم ہی ملتا ہے لیکن باپ کی طرف سے کبھی X ملتا ہے اور کبھی Y۔ اگر باپ کی طرف سے X کروموزوم ہے تو بچہ لڑکی پیدا ہوتا ہے اور اگر باپ کی طرف سے Y کروموزوم ہے تو بچہ لڑکا پیدا ہوتا ہے اس لئے یہ سمجھنا کہ بچے کی جنس کا فیصلہ ماں کرتی ہے طبی طور پر درست نہیں ہے۔

بعض بیماریوں میں اس انتظام میں خلل پیدا ہو جاتا ہے اور انسانی بچہ ۴۶ کروموزوم کی بجائے یا تو ۴۵ کروموزومز سے معرضِ وجود میں آتا ہے یا ۴۷ سے۔ اگر بچے میں ۴۵ کروموزوم ہوں (XO) تو اسے ہم ٹرنر سنڈروم (TURNERS SYNDROME) کہتے ہیں۔ اور اگر ۴۷ کروموزوم ہو جائیں تو یا وہ (XXX) ہوتے ہیں اور بچہ سوپر فیمیل (SUPER FEMALE) کہلاتا ہے اور اگر (XYY) ہوں تو بچہ سوپر میل (SUPER MALE) یا KLINEFLTER'S SYNDROME کہلاتا ہے۔ اگرچہ نام میں SUPER کا لفظ آتا ہے لیکن ایسے بچوں کو بہت سے جسمانی اور ذہنی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایک صحت مند بچے میں ۴۶ کروموزوم ہوتے ہیں چاہے وہ لڑکی ہو یا لڑکا۔

ANATOMIC SEX

ماں کے رحم میں انسانی بچے کی پرورش کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسانی بچہ بنیادی طور پر لڑکی ہوتا ہے لیکن اگر اس کے کروموزومز میں (Y) کروموزوم شامل ہے تو چھ ہفتوں کی پرورش کے بعد مردانہ غدودوں کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے اور انسانی بچے میں مردانہ جنسی اعضاء کی پرورش شروع ہو جاتی ہے۔

اگر بچے میں XX کروموزوم ہیں تو اس کے جنسی اعضاء میں OVARIES اور UTERUS اور VAGINA شامل ہوں گے اور اگر بچے میں XY کروموزوم ہیں تو اس کے جنسی اعضا میں TESTICLES اور PENIS شامل ہوں گے۔

وہ انسانی بچے جن میں جنسی اعضا کی پرورش میں کمی رہ جاتی ہے ان میں نہ تو مردانہ جنسی اعضاء پایۂ تکمیل تک پہنچتے ہیں اور نہ زنانہ جنسی اعضاء۔ ایسے بچے پیدائش کے وقت پہچانے نہیں جاتے کہ وہ لڑکا ہیں یا لڑکی۔

ایسے بچے INTERSEX یا HERMAPHORODITE کہلاتے ہیں۔

ایسے بچے باقی ہر لحاظ سے صحتمند ہوتے ہیں لیکن ان کے جنسی اعضا کی تکمیل میں کمی رہ گئی ہوتی ہے، چنانچہ انہیں بڑے ہو کر بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے علاقوں میں ایسے لوگ ہیجڑے کہلاتے ہیں۔

SEXUAL (GENDER) IDENTITY

اکثر محققین کا خیال ہے کہ انسانی بچے جب تین یا چار سال کی عمر تک پہنچتے ہیں تو انہیں یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ لڑکے ہیں یا لڑکی۔ یہ مرحلہ شناخت کا مرحلہ ہوتا ہے اسلئے اسے IDENTITY کا نام دیا جاتا ہے۔

سائنسدانوں کی تحقیق نے اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ انسانی بچے کی شناخت کا لازمی تعلق جنسی اعضاء سے نہیں ہے اس لئے وہ لفظ جنڈر GENDER کو سیکشول SEXUAL پر ترجیح دیتے ہیں۔ سائنسداں ابھی اس عقدے کا حل تلاش نہیں کر سکے کہ یہ شناخت کا شعور کیسے پیدا ہوتا ہے۔

اگرچہ یہ بچے جن کے کروموسوم XX ہوتے ہیں اور جو زنانہ جنسی اعضاء رکھتے ہیں وہ اپنے آپ کو لڑکی سمجھتے ہیں اور وہ بچے جن کے کروموسوم XY ہوتے ہیں اور جو مردانہ جنسی اعضاء رکھتے ہیں وہ اپنے آپ کو لڑکا سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔

چنانچہ وہ انسانی بچے جن کے جنسی اعضا اور شناخت میں تضاد ہو TRANSEXUAL کہلاتے ہیں۔

وہ بچے جو دیکھنے میں لڑکا نظر آتے ہیں اور ان کے والدین اور رشتہ دار انہیں لڑکا سمجھتے ہیں جب اپنے آپ کو لڑکی سمجھتے ہیں اور مُصر ہوتے ہیں کہ ان کی ذات غلط جسم میں قید ہوگئی ہے تو وہ MALE TRANSEXUAL کہلاتے ہیں۔ وہ مُصر ہوتے ہیں کہ وہ لڑکیوں کی طرح کپڑے پہنیں گے، لڑکیوں کی طرح زندگی گزاریں گے اور اگر ممکن ہوا تو اپنے جسم کو آپریشن کے ذریعہ عورت میں تبدیل کرالیں گے۔ ان کے مقابلے میں وہ بچے جو دیکھنے میں لڑکی نظر آتے ہیں اور سب لوگ انہیں لڑکی سمجھتے ہیں لیکن وہ مُصر ہوتے ہیں کہ وہ لڑکا ہیں تو وہ FEMALE TRANSEXUAL کہلاتے ہیں۔ ایسے بچے لڑکوں کا لباس پہنتے ہیں، لڑکوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں اور مُصر ہوتے ہیں کہ ایک دن وہ جسمانی طور پر مرد میں تبدیل ہونے کی کوشش کریں گے۔

ایسے لوگ سائنس اور نفسیات کے لئے ایک بڑا معمہ ہیں اور ہمیں اپنی کم علمی کا احساس دلاتے ہیں۔

TRANSVESTITE

بعض لوگ Transexual اور Transvestite میں بہت زیادہ فرق نہیں کر سکتے اگرچہ ان میں بہت زیادہ فرق ہے۔

ایک Transexual جنسِ مخالف کی شناخت رکھتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ لڑکے کے جسم میں لڑکی یا لڑکی کے جسم میں لڑکا پیدا ہوا ہے اور وہ زندگی کے ہر پہلو کو اسی انداز میں گزارنا چاہتا ہے لیکن Transvestite یقین تو رکھتا ہے کہ وہ اسی جنس کا مرد ہے جس جنس کا اس کا جسم ہے لیکن وہ جنسِ مخالف کے کپڑے پہن کر ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتا ہے۔ بعض Transvestite تو صرف جوتے، دستانے یا کوئی اور چیز پہن کر خوش ہوتے ہیں لیکن بعض پوری کی پوری پوشاک پہن کر ایک خاص قسم کا تلذذ محسوس کرتے ہیں۔

SEXUAL ORIENTATION

انسانی بچے جب سنِ بلوغت تک پہنچتے ہیں تو وہ دوسرے انسانوں کو جنسی طور پر پرکشش پاتے ہیں اور ان کے ساتھ جنسی تعلقات استوار کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

اکثر نوجوان جنسِ مخالف کے افراد کو (عورتیں مردوں کو اور مرد عورتوں کو) جنسی طور پر پرکشش پاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم ہیٹروسیکشول کہتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی ہی جنس کے افراد کے ساتھ (مرد مردوں کے ساتھ اور عورتیں عورتوں کے ساتھ) جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم ہوموسیکشول (HOMOSEXUAL) کہتے ہیں اور یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں آگے چل کر تفصیلی گفتگو ہوگی۔ یہاں یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ ہوموسیکشول لوگ HERMAPHRODITES، TRANSEXUAL اور TRANSVESTITES سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔

SEXUAL PERFORMANCE

جب مرد اور عورتیں اپنا جنسی رفیق چن لیتے ہیں تو پھر ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ان کے اتنے قریب آجائیں کہ وہ جنسی مباشرت سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ان جنسی تعلقات کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ رومانی بھی، لذت بھی اور افزائشِ نسل بھی۔ اکثر بالغ اور صحت مند لوگوں کے لیے جنسی تعلقات قائم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی لیکن:

وہ مرد جو مباشرت نہیں کر سکتے IMPOTENT کہلاتے ہیں۔ ایسے لوگ جنسی خواہش رکھنے کے باوجود یا تو جنسی عمل شروع نہیں کر سکتے اور ان کے جنسی اعضاء میں وہ سختی پیدا نہیں ہوتی جو مباشرت کے لئے ضروری ہے اور اگر ان کے PENIS میں سختی پیدا ہوتی بھی ہے تو یا تو کم ہوتی ہے یا پھر جنسی عمل کی تکمیل تک قائم نہیں رہتی۔

اور

وہ عورتیں جو خواہش رکھنے کے باوجود جنسی لذت سے محروم رہتی ہیں اور جنسی معراج (ORGASM) تک نہیں پہنچ سکتیں FRIGID کہلاتی ہیں۔

ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ IMPOTENT مردوں اور FRIGID عورتوں کی اکثریت نفسیاتی تضادات کا شکار ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اکثر اوقات جسمانی طور پر صحت مند ہوتے ہیں۔

اگر ایسے لوگ نفسیاتی علاج کرائیں اور اپنے احساسِ گناہ یا کسی اور ذہنی تضاد کا جس کے وہ شکار ہوں حل تلاش کر لیں تو ان کی جنسی زندگی بہتر ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ اس قسم کے علاج کے لئے دو محبوبوں کا (چاہے وہ دو مرد ہوں، دو عورتیں یا ایک مرد یا ایک عورت) علاج کرنا پڑتا ہے۔

یہاں یہ بات واضح کرنا اہم ہے کہ جنسی عمل کا کسی کے ہیٹروسیکشول یا ہوموسیکشول ہونے سے کوئی متعلق نہیں۔ دونوں گروہوں کے لوگ جنسی تعلقات میں کامیاب بھی ہو سکتے ہیں اور ناکام بھی۔

مندرجہ بالا گفتگو کا مقصد یہ تھا کہ اس سے پہلے کہ ہم ہوموسیکشولیٹی پر اپنی توجہ پوری

طرح مرکوز کریں ہم ان کیفیات اور CONDITIONS کا مختصراً جائزہ لے لیں جن کو جانے بغیر ہوموسیکشوئلٹی کی گفتگو واضح نہیں ہو گی۔

جب ہم بیسویں صدی میں ہوموسیکشوئلٹی کے موضوع پر کی گئی تحقیق کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری نظر سب سے پہلے جرمنی کے پروفیسر ہرشفیلڈ (HIRSCHFELD) پر پڑتی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچا اور اسے سائنسی نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی۔

چونکہ اس دور میں لوگوں سے بالمشافہ ملنا اور جنسی وہ بھی ہم جنسی جیسے نازک موضوع پر کھل کر بات کرنا بہت مشکل تھا اس لئے انہوں نے ہزاروں لوگوں کو ایسے سوالنامے بھیجے جن سے ان کی جنسی زندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

ہرشفیلڈ نے جب ۱۹۲۰ء میں اپنی تحقیق کے نتائج کے بارے میں مضامین لکھے تو انہوں نے بتایا کہ ان کے معاونین نے ۳۰۰۰ طلباء اور ۵۷۲۱ مزدوروں کو سوالنامے بھیجے تھے۔ ۴۹ فیصد لوگوں نے سوالوں کے جواب دئیے اور ان جوابات کے تجزیے سے اندازہ ہوا کہ اس ملک کے:

۹۴،۳ فیصد لوگ ہیٹروسیکشول

۲،۳ فیصد لوگ ہوموسیکشول

اور

۳،۴ فیصد لوگ بائی سیکشول (BISEXUAL) زندگی گزار رہے تھے۔

اگرچہ ماہرین کا خیال ہے کہ ہرشفیلڈ کی ریسرچ سائنس اور تحقیق کے اعلیٰ معیاروں پر پوری نہیں اترتی لیکن اس دور میں اس منزل کی طرف پہلا قدم اٹھانا ہی مجاہدانہ عمل تھا

ہرشفیلڈ کے بعد انگلینڈ میں ہیولاک ایلس (HAVELOCK ELLIS) نے ۱۹۳۶ء میں اس موضوع پر تحقیق کی۔ اس نے ہرشفیلڈ کی تحقیق سے بھی استفادہ کیا۔ ایلس کا تجزیہ یہ تھا کہ معاشرے میں ۵ - ۲ فیصد مرد اور ۱۰ - ۴ فیصد عورتیں ہوموسیکشول زندگی گزارتی

ہیں۔

جوں جوں ہوموسیکشویلٹی کے بارے میں کھل کر بات ہونے لگی توں توں یہ اندازہ ہونے لگا کہ ہوموسیکشول تعلقات کی تعداد زندگی کے مختلف مراحل میں مختلف ہوتی ہے۔ امریکہ میں جو تحقیقات ہوئیں ان سے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑی۔

ریمزی (RAMSEY) نے ۱۹۴۳ء میں یہ ثابت کیا کہ نوجوانوں میں سے ۳۵ فیصد لوگ ہم جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔

ہمیلٹن (HAMILTON) نے ۱۹۲۹ء میں ثابت کیا کہ ۱۸ سال کی عمر کے بعد ۱۷ فیصد لوگ ہم جنسی تعلقات میں شرکت کرتے ہیں۔

فنگر (FINGER) نے ۱۹۴۷ء میں کالج کے طلباء میں تحقیق کی اور بتایا کہ ۲۷ فیصد نوجوان جنسی معراج (ORGASM) تک ہم جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔

ان تحقیقات نے وہ بنیاد فراہم کیں جس پر کنزی نے تحقیق کی عمارت تعمیر کی۔ کنزی کی تحقیق وہ پہلا قدم تھا جس نے ہوموسیکشویلٹی جیسے موضوع کو کم علمی، جہالت اور تعصبات کے تہہ خانوں سے نکال کر یونیورسٹیوں اور گھروں کے لیونگ رومز (LIVING ROOMS) تک پہنچا دیا اور اس موضوع پر معروضی انداز میں گفتگو ہونے لگی۔ کنزی نے ماہرین کے ایک گروہ کے ساتھ مل کر ہزاروں لوگوں کے انٹرویو لیے اور ان کی جنسی زندگی کی تفصیلی ہسٹری لی۔ اس ہسٹری میں تفاصیل پر کافی زور دیا گیا اور ہم جنسی زندگی کے

آغاز

اظہار

محبوباؤں کا چناؤ

جسمانی عمل اور ردِ عمل

نفسیاتی ردِ عمل اور

اختتام پر زور دیا گیا

اس تحقیق نے اس موضوع کے جسمانی، نفسیاتی اور معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

کنزی نے یہ ثابت کیا کہ جب تک ہم جنسی جیسے موضوع پر سائنسی اور حقیقت پسندانہ انداز سے گفتگو نہ کریں گے ہم تعصبات اور توہمات کی تاریکیوں میں کھوئے رہیں گے۔

کنزی نے بنیادی طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ لوگوں کو صرف ہوموسیکشول اور ہیٹروسیکشول خانوں میں بند کر دینا حقیقت پسندانہ انداز نہیں۔ کنزی نے ایک SPECTRUM کا تصور پیش کیا اور نتائج سے ثابت کیا کہ لوگوں میں جنسی میلانات اور رجحانات کی شدت بدلتی رہتی ہے اور مختلف قسم کے میلانات بیک وقت بھی موجود ہو سکتے ہیں۔

کنزی نے یہ بھی بتایا کہ جب اس نے شمالی امریکہ کے مختلف شہروں اور علاقوں کے نتائج کا تجزیہ کیا تو اس میں اسے کوئی زیادہ فرق نظر نہیں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ معاشرہ ابھی تک ہوموسیکشول طرزِ زندگی کو قبول نہیں کرتا اس لئے ہوموسیکشول میلانات اور طرزِ زندگی گزارنے والے دیرپا تعلقات قائم نہیں کر سکتے اور عارضی رشتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور انہیں بھی چھپا کر رکھتے ہیں تاکہ ان پر خاندان اور معاشرے کا عذاب نازل نہ ہو۔

(اگلے صفحہ پر خاکہ ملاحظہ فرمائیں)
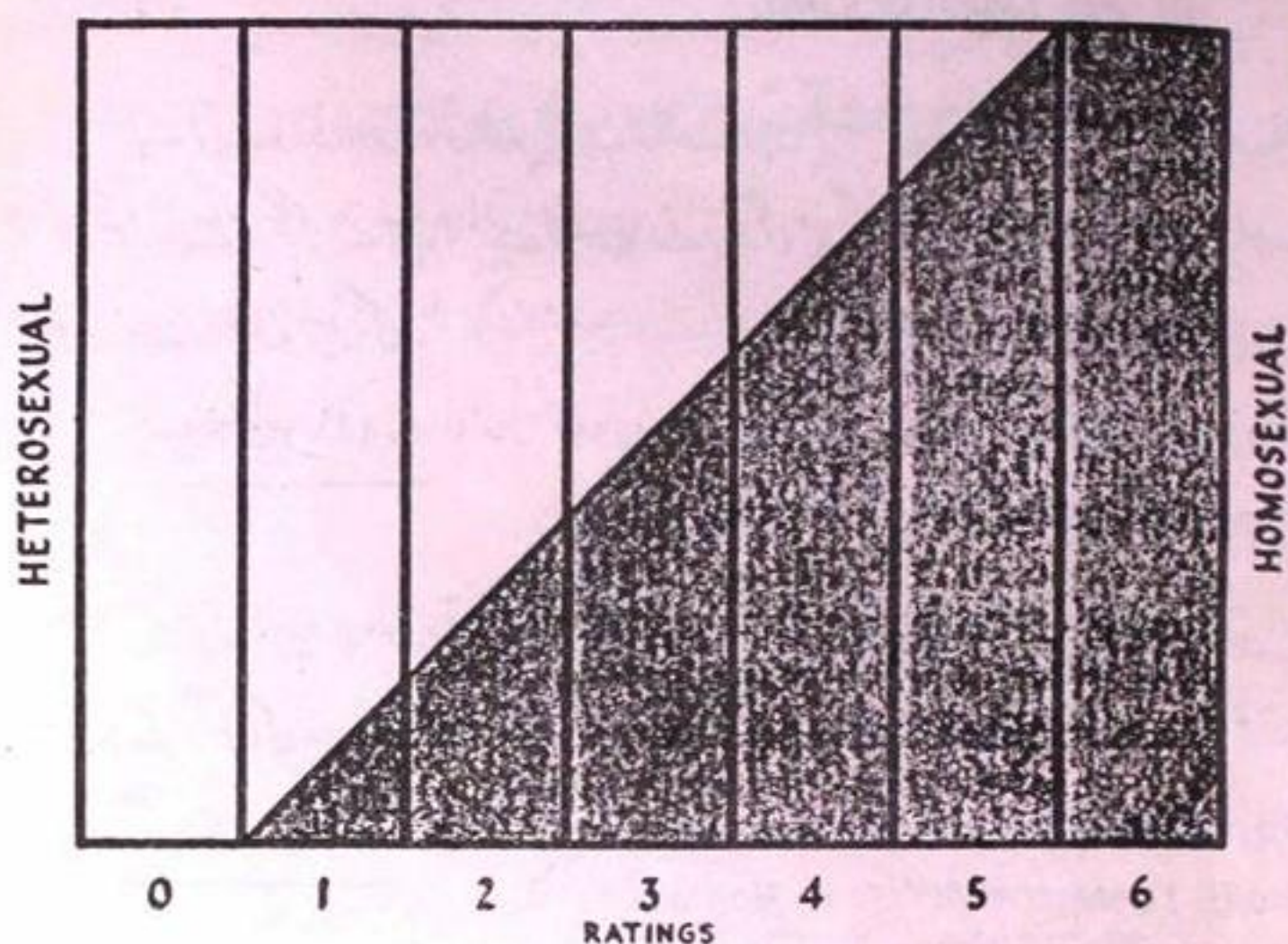
Figure 161. Heterosexual-homosexual rating scale

Based on both psychologic reactions and overt experience, individuals rate as follows:

0. Exclusively heterosexual with no homosexual
1. Predominantly heterosexual, only incidentally homosexual
2. Predominantly heterosexual, but more than incidentally homosexual
3. Equally heterosexual and homosexual
4. Predominantly homosexual, but more than incidentally heterosexual
5. Predominantly homosexual, but incidentally heterosexual
6. Exclusively homosexual

کنزی نے لوگوں کے جنسی میلانات کو سمجھنے کے لئے انہیں سات گروہوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ ان کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

گروہ نمبر (۰) - EXCLUSIVELY HETROSEXUAL — NO HOMOSEXUAL

ایسے لوگ ذہنی اور جسمانی طور پر جنسِ مخالف کو ہی پرکشش پاتے ہیں اور انہی کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں نے زندگی میں کبھی بھی اپنی ہی جنس کے افراد سے جنسی لذت حاصل نہیں کی۔

گروہ نمبر (۱) - PREDOMINANTLY HETEROSEXUAL — INCIDENTAL HOMOSEXUAL

ایسے لوگ بنیادی طور پر تو ہیٹروسیکشول ہوتے ہیں لیکن زندگی میں ایک یا دو دفعہ اپنی ہی جنس کے لوگوں کی قربت سے جنسی لذت حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔

گروہ نمبر (۲) - PREDOMINANTLY HETEROSEXUAL — MORE THAN INCIDENTLY HOMOSEXUAL

ایسے لوگ بنیادی طور پر ہیٹروسیکشول ہوتے ہیں لیکن اپنی جنس کے لوگوں کے ساتھ بھی وقتاً فوقتاً جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے تعلقات جنسِ مخالف سے اپنی جنس کے لوگوں کی نسبت زیادہ قریبی اور متواتر ہوتے ہیں۔

گروہ نمبر (۳) - EQUALLY HETEROSEXUAL AND HOMOSEXUAL

ایسے لوگ اپنی جنس اور جنسِ مخالف کو یکساں طور پر پرکشش پاتے ہیں اور دونوں گروہوں سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔

گروہ نمبر (۴) - PREDOMINANTLY HOMOSEXUAL MORE THAN INCIDENTLY HETEROSEXUAL

ایسے لوگوں کی زندگی کا مرکز اپنی جنس کے لوگ ہوتے ہیں لیکن وہ جنس مخالف سے بھی

جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔

گروہ نمبر (۵)۔ PREDOMINANTLY HOMOSEXUAL - INCIDENTAL HETEROSEXUAL

یہ لوگ بنیادی طور پر ہوموسیکشول ہوتے ہیں لیکن زندگی میں ایک یا دو دفعہ جنسِ مخالف کے افراد کے ساتھ بھی جنسی تعلقات قائم کر چکے ہوتے ہیں۔

گروہ نمبر (۶)۔ EXCLUSIVELY HOMOSEXUAL

ایسے لوگ کلّی طور پر ہوموسیکشول ہوتے ہیں۔ ان کی تمام زندگی اپنی ہی جنس کے لوگوں کے ساتھ جنسی تعلقات میں گزرتی ہے۔ وہ جنسِ مخالف کے افراد کو نہ تو پرکشش پاتے ہیں اور نہ ہی ان سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔

کنزی اور اس کے رفقاء نے جب اپنے انٹرویوز اور مشاہدات کا تجزیہ کیا تو مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچے جو ان کی کتاب میں شامل ہیں۔

گروہ ۶ میں شامل لوگ

۸ فیصد ایسے تھے جنہوں نے تین سال یا زیادہ عرصہ ہم جنسی تعلقات میں گزارا تھا۔

۴ فیصد ایسے تھے جو کلّی طور پر ہوموسیکشول زندگی گزار رہے تھے۔

گروہ ۵ + ۶ کی تعداد ۱۰ فیصد تھی

گروہ ۴ + ۵ + ۶ کی تعداد ۱۳ فیصد تھی

گروہ ۳ + ۴ + ۵ + ۶ کی تعداد ۱۸ فیصد تھی

گروہ ۲ + ۳ + ۴ + ۵ + ۶ کی تعداد ۲۵ فیصد تھی

گروہ ۱ + ۲ + ۳ + ۴ + ۵ + ۶ + کی تعداد ۳۰ فیصد تھی

تحقیق نے بتایا کہ شمالی امریکہ میں عوام میں سے ۳۷ فیصد لوگ ایسے تھے جنہوں نے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ایک دفعہ اپنی ہی جنس کے افراد کے ساتھ جنسی معراج (ORGASM) تک پہنچے تھے۔

کنزی اپنے تجزیے کے آخر میں کہتا ہے کہ وہ قوم جس کے تقریباً ۴۰ فیصد لوگ ہم جنسی تعلقات اختیار کر چکے ہیں انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کے خلاف جبر و تشدد اور ظلم کریں۔ اس کا کہنا ہے کہ ہمیں کسی پر انگلی اٹھانے سے پہلے اپنے گریبان میں خود جھانکنا چاہئے۔ ہمیں کسی اور کو مجرم یا گنہ گار قرار دینے سے پہلے حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا چاہئے۔ کنزی کا خیال ہے کہ ہم منافقت کی زندگی گزارتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی زندگی منظرِ عام پر آجاتی ہے اس لئے وہ معتوب ہوتے ہیں جبکہ اکثر لوگ وہی کام چھپ چھپ کر کرتے ہیں اس لئے منافقت کا نقاب اوڑھے رہتے ہیں۔

کنزی نے ہوموسیکشول لوگوں کے لئے ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔

جب میں کنزی کی کتاب پڑھ رہا تھا تو مجھے یہ شعر یاد آ رہا تھا۔

مارو مجھے پتھر کہ ہوں آلودۂ عصیاں
لیکن وہ کرے پہل نہیں جو کہ گنہگار

ﭖ

جب ہم ہوموسیکشوئلیٹی کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس موضوع کے بہت سے پہلو اور پرت ہیں۔ انفرادی بھی، معاشرتی بھی، داخلی بھی، خارجی بھی، شعوری بھی، لاشعوری بھی اور ہر پہلو کا مطالعہ ہمیں اپنی کم علمی کا احساس دلاتا ہے۔

جب ہم ماہرین سے یہ پوچھتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں ہوموسیکشوئلیٹی کیا ہے تو ہمیں دو گروہ ملتے ہیں۔ پہلا گروہ اس کے صرف جنسی پہلو کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہوموسیکشوئلیٹی ایک ہی جنس کے دو افراد کے درمیان جنسی تعلقات کا نام ہے جبکہ دوسرا گروہ جنس کے ساتھ ساتھ دو انسانوں کے درمیان ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی پر بھی زور دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہوموسیکشول انسان جنسِ مخالف کی بجائے اپنی ہی جنس کے لوگوں کو شریکِ حیات بنانا چاہتے ہیں اور ان کے دکھوں اور سکھوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں ہوموسیکشول طرزِ زندگی کو صرف جنس تک محدود کر دینا ناانصافی ہے۔

مغرب میں اس وقت دونوں گروہوں کے ماننے والے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان گروہوں کے نقطۂ نظر کا اندازہ اس پیراگراف سے لگایا جا سکتا ہے:

"MY CONCEPT OF LESBIAN AND GAY AS DEFINED BY AN ESSENTIAL EROTICISM DIFFERS FROM DEFINATIONS OFFERED IN RECENT YEARS BY A NUMBER OF LESBIAN FEMINISTS. FOR EXAMPLE, HISTORIAN BLANCHE COOK DEFINED "LESBIANS" AS "WOMEN WHO LOVE WOMEN, WHO CHOOSE WOMEN TO NURTURE AND SUPPORT AND TO FORM A LIVING ENVIRONMENT IN WHICH TO WORK CREATIVELY AND INDEPENDENTLY."

وجوہات:

جب ہم ماہرین سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ آخر ہوموسیکشول ہوموسیکشول کیوں ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم آج تک اس سوال کا جواب نہیں دے سکے کہ ہیٹروسیکشول ہیٹروسیکشول کیوں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابھی ہم جنسی رجحانات کو پوری طرح سمجھ نہیں پائے اس لئے مختلف محققین کی آرا بہت مختلف ہیں اور وہ اس طرزِ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

میں اس موقع پر چند ماہرین کی آرا پیش کرتا ہوں

(ا) حیاتیاتی وجوہات:

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشویلٹی کا تعلق جینیز (GENES) سے ہے اور بعض لوگ پیدائشی طور پر ہوموسیکشول ہوتے ہیں۔ اس خیال کی حمایت میں وہ تحقیقات پیش کی جاتی ہیں جن میں جڑواں بھائیوں اور بہنوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ کیلمین (KELLMAN) نے یہ ثابت کیا کہ یکساں جڑواں بچوں (UNIOVULAR TWINS) میں سے اگر ایک بچہ ہوموسیکشول ہے تو دوسرے بچے کے بھی ہوموسیکشول ہونے کے ۱۰۰ فیصد امکانات ہیں۔ دیگر ماہرین کا خیال ہے کہ وہ تحقیق سائنس کے اعلیٰ معیار پر پوری نہیں اترتی۔ اور دیگر محققین نے ان مشاہدات کو قبول نہیں کیا ہے۔

محققین کا دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ حمل کے ابتدائی مراحل پر بعض ہارمونز (HARMONES) بچے کو اس طرح متاثر کرتے ہیں کہ اس کی جنسی ترجیح اپنی ہی جنس کے انسانوں کے لئے ہوتی ہے۔ دیگر محققین اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔

(ب) **خاندانی وجوہات:**

بعض محققین نے خاندانی ماحول اور عوامل پر توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ لڑکے جو بڑے ہو کر ہم جنس بنتے ہیں وہ اپنی ماؤں کے بہت قریب ہوتے ہیں اور اپنے باپوں سے بہت دور۔ ان کی جذباتی اور جنسی شناخت (IDENTIFICATION) باپ کی بجائے ماں سے ہوتی ہے اس لئے نہ صرف ان کی عادات ماؤں کی طرح ہوتی ہیں بلکہ وہ اپنی ماؤں کی طرح مردوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔

دیگر محققین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشویلیٹی میں خاندانی عوامل اہم ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان پر حد سے زیادہ توجہ مرکوز کرنا دانشمندی نہیں۔ ان کے خیال میں ہوموسیکشویلیٹی کا ارتقاء بہت پیچیدہ اور گنجلک عمل ہے۔ انہیں یہ بھی اعتراض ہے کہ ایسی تحقیق بہت کم لوگوں کی زندگیوں کے مشاہدات پر منحصر تھی۔ انہیں یہ بھی شک ہے کہ اگر ہم ہیٹروسیکشول لوگوں کے خاندانوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں تو ہمیں شاید وہاں بھی ایسے ہی عوامل کارفرما نظر آئیں۔

(ج) **نفسیاتی وجوہات:**

جن ماہرین نے ہوموسیکشویلیٹی کے نفسیاتی وجوہات پر غور کیا ہے ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ بچے تین سے پانچ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے جنسِ مخالف کے والدین میں دلچسپی لینے لگتے ہیں اور اسی دلچسپی میں لاشعوری طور پر ایک جنسی رنگ بھی ہوتا ہے اسی لئے بیٹے کہتے ہیں کہ ہم بڑے ہو کر اپنی ماؤں سے شادی کریں گے اور بیٹیاں کہتی ہیں کہ وہ بڑی ہو کر باپوں سے شادیاں کریں گی۔ فرائڈ نے اپنے ایڈیپس کمپلکس (OEDIPUS COMPLEX) کی بحث میں اسی موضوع پر زور دیا ہے۔ اس لئے اگر بچوں کی ذہنی پرورش میں کچھ کمی رہ جائے تو ان کی بلوغت کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔

فرائڈ کا خیال تھا کہ ہوموسیکشویلیٹی جنسی ارتقا کی پہلی سیڑھی ہے اور ہیٹروسیکشویلیٹی دوسری۔ اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ جو لوگ ہوموسیکشول ہیں وہ جنسی اعتبار سے بالغ نہیں ہوتے لیکن وہ اسے بیماری نہیں سمجھتا تھا۔

ماہرینِ نفسیات میں ابھی تک اس موضوع پر اتفاق رائے نہیں ہوا۔

(د) **متوازن سوچ :**

وہ ماہرین جو کسی ایک مکتبۂ فکر سے تعلق نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ ہمیں جذبات کی رو میں بہہ کر کسی ایک نقطۂ نظر کو قبول نہیں کرنا چاہیئے بلکہ ایک متوازن نقطۂ نظر رکھنا چاہیئے۔ ایسا نقطۂ نظر جو حیاتیاتی، خاندانی، معاشرتی اور نفسیاتی عوامل کو اہمیت تو دے لیکن خواہ ایک کو دوسرے پر فوقیت نہ دے۔ ان کا خیال ہے کہ ابھی تک جو تحقیق ہوئی ہے اس نے ہمیں جوابوں کے بجائے سوال زیادہ دیئے ہیں اور اب بھی ہم کم علمی کی تاریک راہوں میں بھٹک رہے ہیں۔

طرزِ زندگی :

بعض ماہرین نے ہوموسیکشول لوگوں کے طرزِ زندگی کی تحقیق کی ہے اور یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ ان کا طرزِ حیات ہیٹروسیکشول لوگوں سے کس طرح مختلف ہوتا ہے۔

ایک اہم ریسرچ میں ۶۸۶ ہوموسیکشول مردوں کے طرزِ حیات کا مطالعہ کیا گیا اور جب ان کے نتائج کا تجزیہ کیا گیا تو یہ پتہ چلا کہ ان میں سے :

۵ر۱۷ فیصد CLOSED COUPLES تھے۔ ان لوگوں نے ایک ہی محبوب کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ جنسی وفاداری کو اہمیت دیتے تھے۔

۹ر۱۴ فیصد OPEN COUPLES تھے۔ انہوں نے اپنے محبوبوں سے جنسی وفاداری کو اہمیت نہیں دی۔ انہیں اپنے محبوب کے علاوہ دوسرے انسانوں سے رومانوی تعلقات قائم کرنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

۵ر۱۲ فیصد DYSFUNCTIONAL تھے جن کی زندگی سنجیدہ نفسیاتی مسائل کا شکار تھی۔

۱۶ فیصد ASEXUAL تھے جن کی جنسی تعلقات میں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔

ان کے علاوہ باقی لوگوں کو کسی گروہ میں ڈالنا مشکل تھا۔

دیگر محققین کا خیال ہے کہ چونکہ معاشرتی طور پر ابھی بھی ہوموسیکشول اپنے تعلقات

کو صیغۂ راز میں رکھنے پر مجبور ہیں اور لوگوں کے منفی ردِّ عمل سے خائف رہتے ہیں اسلئے ان کے تعلقات درپردہ ہوتے ہیں یعنی ماہرین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشول لوگوں کے محبوب بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنے محبوبوں سے عارضی تعلقات قائم کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایڈز (AIDS) کی بیماری کے عام ہونے نے ہوموسیکشول لوگوں میں سے جنسی روابط کی تعداد کو کم کر دیا ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی سنجیدہ تحقیق سامنے نہیں آئی۔

تشخیص:

جب ماہرینِ نفسیات ان لوگوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہم جنسی تعلقات قائم کر چکے ہوتے ہیں تو مندرجہ ذیل چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہیں:

i: کیا یہ تعلق عارضی ہے یا اس شخص کا طرزِ زندگی ہے۔

ii: کیا یہ تعلق صرف بلوغت سے پہلے کی زندگی میں موجود تھے یا بلوغت کے بعد بھی قائم رہے۔

iii: کیا ان تعلقات میں مجبوری کا عنصر شامل تھا۔ وہ لوگ جنہیں جنسِ مخالف کے افراد نہیں ملتے جیسے جیل کی فضا میں تو وہ بعض دفعہ ہم جنسی تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔

iv: بعض لوگ نظریاتی طور پر ہم جنسی کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں ان میں وہ فیمنسٹ (FEMINIST) شامل ہیں جو مردوں سے تمام تر قربت کے رشتے منقطع کر چکی ہیں اور صرف عورتوں سے جذباتی اور جنسی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کئے ہوتے ہیں۔

v: بعض لوگ کسی اور ذہنی مرض مثلاً (SCHIZOPHRENIA) کا شکار ہوتے ہیں اور ہم جنسی تعلقات صرف اسی مرض کا عارضہ ہوتے ہیں۔

vi: بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشویلٹی کی تشخیص میں تصورات (FANTASIES) کو بھی اتنی ہی اہمیت دینی چاہئے جتنی کہ ہم اعمال BEHAVIOURS کو دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک اسکول کے غسلخانے میں دو کم سن لڑکے (TEENAGER BOYS) آپس میں عقبی مباشرت کرتے پکڑے گئے۔ اسکول کے پرنسپل نے انہیں ہم جنسی کے الزام میں سزا دی اور پھر انہیں ماہرِ نفسیات کے پاس بھیج دیا۔ ماہرِ نفسیات کے انٹرویو کے دوران لڑکوں نے بتایا کہ وہ مباشرت کے دوران یہ تصور کر رہے تھے کہ وہ کسی لڑکی سے مباشرت کر رہے ہیں۔ ماہرِ نفسیات نے تشخیص کی کہ وہ لڑکے بنیادی طور پر ہوموسیکشول نہیں تھے لیکن چونکہ انہیں لڑکی کا قرب میسّر نہیں تھا اس لئے وہ ایسے جنسی افعال کے مرتکب ہوتے ہیں جو ہوموسیکشول تھے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشول لوگ اپنی تصوراتی زندگی (FANTASY LIFE) میں اپنی ہی جنس کی قربت کو جنسِ مخالف کی قربت پر ترجیح دیتے ہیں اور اس سے لذت حاصل کرتے ہیں۔

مغرب میں ماہرینِ نفسیات کا رویہ پچھلی دو دہائیوں میں بہت بدلا ہے ایک طویل عرصے تک ماہرِ نفسیات ہوموسیکشولیٹی کو ایک ذہنی مرض سمجھتے تھے لیکن جب سے ہوموسیکشول لوگوں کا دباؤ بڑھا ہے A.P.A (AMERICAN PSYCHIATRIC ASSOCIATION) نے اسے امراض کی فہرست سے خارج کیا ہے۔ اکثر ماہرِ نفسیات نے اسے ایک طرزِ زندگی کے طور پر قبول کر لیا ہے۔

اب صرف وہ ہوموسیکشول زیرِ علاج ہوتے ہیں جو خود ماہرِ نفسیات سے رجوع کریں اور کسی داخلی یا خارجی تضاد کا شکار ہوں اور اس کے لئے علاج یا مدد کے خواہاں ہوں۔ اس لئے وہ لوگ جو ڈاکٹروں کے زیرِ علاج ہیں ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے اور معاشرہ انہیں صحتمند لوگوں کی طرح قبول کرتا جا رہا ہے۔

بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ ہوموسیکشول لوگوں کے مسائل اور تضادات میں بھی ان کے خاندانوں، دوستوں، رفقاءِ کار اور عوام کا بہت حصہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جوں جوں معاشرہ انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھے گا ان کی نفسیاتی الجھنوں میں کمی ہوتی جائے گی۔

سگمنڈ فرائڈ (FREUD) کا خط
ایک امریکی ماں کے نام

۹؍ اپریل ۱۹۳۵ء

محترمہ!

مجھے آپ کے خط سے اندازہ ہوا ہے کہ آپ کا بیٹا ہوموسیکشول ہے۔ آپ نے اپنے خط میں یہ لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ میں اس بارے میں سوچتا رہا کہ ایسا کیوں ہے۔ آپ نے آخر اس لفظ کو استعمال کرنے سے کیوں احتراز کیا ہے؟ مجھے اندازہ ہے کہ کسی کا ہوموسیکشول ہونا کوئی فائدے یا فخر کی بات نہیں لیکن اس میں کوئی گناہ یا شرم یا بیماری کا پہلو بھی نہیں نکلتا۔ ہمارے خیال میں یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں بعض لوگوں کا جنسی ارتقا ایک خاص مقام پر آ کر رک جاتا ہے۔ اگر ہم تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں کئی عظیم اور مشہور لوگ ملیں گے جو ہوموسیکشول تھے۔ اس فہرست میں افلاطون، مائیکل انجلو اور لیونارڈو ڈاونسی جیسی اہم شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ میری نگاہ میں کسی انسان کو اس کی ہوموسیکشول زندگی کی وجہ سے مجرم سمجھنا ایک غیر منصفانہ عمل ہوگا۔ اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہ آئے تو آپ ہیولاک ایلس کی کتابیں دیکھ سکتی ہیں۔

اگر آپ مجھ سے کسی ایسے علاج کی امید رکھتی ہیں جس سے آپ کا ہوموسیکشول بیٹا ہیٹروسیکشول بن جائے تو اس کا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ بعض لوگوں میں پہلے سے ہیٹروسیکشول رجحانات پائے جاتے ہیں جو علاج کے بعد ابھر کر سامنے آجاتے ہیں لیکن اکثر لوگوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ علاج کے نتائج کا پہلے سے اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔

جہاں تک آپ کے بیٹے کے لئے تحلیلِ نفسی کی افادیت کا سوال ہے تو وہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے اگر آپ کا بیٹا ذہنی طور پر پریشان ہے، لاشعوری تضادات کا شکار ہے

اور اپنی معاشرتی زندگی میں تبدیلیاں لانا چاہتا ہے تو تحلیلِ نفسی اسے ذہنی سکون اور ایک صحت مند زندگی گزارنے میں مدد دے سکتی ہے چاہے وہ ہوموسیکشول رہے یا بدل جائے۔ اگر آپ اس کا علاج مجھ سے کرانا چاہتی ہیں تو اسے ویننا (VIENNA) آنا پڑے گا۔ میرا امریکہ آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

آپ اس سلسلے میں جو بھی فیصلہ کریں مجھے اس کی خبر ضرور دیجیے گا۔

خلوص اور نیک تمناؤں کے ساتھ

فرائڈ

نوٹ:

(یہ خط ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر کنزی کو جو ہوموسیکشولیٹی پر تحقیق کر رہے تھے ایک ماں نے بھیجا تھا۔ اس خط پر اس ماں نے یہ بھی لکھ دیا تھا۔ "ایک عظیم اور نیک شخص کا خط۔ ایک ممنون ماں کی طرف سے")

اردو ادب
کے
آئینے میں
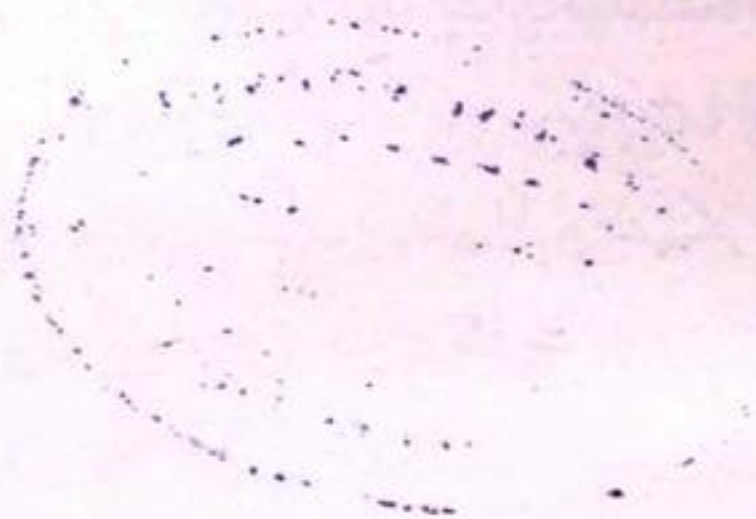
ایک لیسبین خط

(اردو کا خط انگریزی کے نام)

خالد سُہیل
کینیڈا

پیاری انگریزی!

میں ایک طویل عرصے سے کوشش کر رہی تھی کہ اپنے دلی جذبات کا اظہار کروں لیکن میری مشرقی شرم و حیا آڑے آتی رہی۔ میری تم سے کئی دفعہ تنہائی میں ملاقات بھی ہوئی اور کئی دفعہ تم نے مجھ سے حالِ دل بھی پوچھا لیکن جب بھی اظہارِ محبت کا موقع آیا میری زبان یا تو لڑکھڑا گئی یا اس میں لکنت پیدا ہو گئی۔ میرے لئے یہ بہت مشکل مرحلہ ہے۔ بقول منیر نیازی:

مجھے تم سے محبت ہے
بس اتنی بات کہنے کو
لگے بارہ برس مجھ کو

بات دراصل یہ ہے کہ جب بھی تم میرے حُسن کی تعریف کرتی ہو اور میری محبوبانہ اداؤں کو سراہتی ہو تو مجھے اپنی کم سنی کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ شاید تم یہ سمجھو

کہ میں ناتجربہ کار ہوں لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ میں تمہارے عشق سے پہلے عربی اور فارسی کی زلف کی اسیر ہو چکی ہوں۔ فرق یہ ہے کہ چونکہ ان دونوں کا تعلق بھی مشرق سے تھا اس لئے ہم ایک دوسرے کے اشارے کنایے سمجھتے تھے اور ہم ایسی زبان میں اپنے شوق کی داستان سناتے تھے کہ دوسروں کو ہمارے جذبات کی شدت کا اندازہ نہ ہو۔ شاید اسی لئے میں بہت اچھی شاعری کر لیتی ہوں کیونکہ تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں مجھے ملکہ حاصل ہے۔ اگر تم میری زبان سمجھ پاتی تو میں تمہاری شان میں غزلیں اور نظمیں لکھتی لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ تمہیں شاعری کی نسبت سائنس سے زیادہ لگاؤ ہے اور تم زندگی کو حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھنے، سوچنے اور بیان کرنے میں مہارت رکھتی ہو۔ میں ابھی تک نوجوانی کے رومانوی ماحول میں زندگی گزارتی ہوں اور حقیقتوں کی بہ نسبت خوابوں کو زیادہ پسند کرتی ہوں۔ میری زندگی میں جب جسمانی اور ذہنی قربتوں کا ذکر آتا ہے تو میں پریشان ہو جاتی ہوں۔

میں جس مشرقی ماحول اور برادری میں پلی بڑھی ہوں وہ بہت روایتی اور مذہبی ہے۔ میرے رشتہ دار ہمیشہ گناہ و ثواب کے مسائل میں الجھے رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنس کے موضوع پر گفتگو، بے حیائی اور بے شرمی کے رجحانات کو ترغیب دیتی ہے۔ اس لئے وہ کسی شخص یا ادیب کو بھی اس پر کھل کر گفتگو نہیں کرنے دیتے۔

آج سے چند دہائیاں پیشتر جب عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور "لحاف"، "ٹھنڈا گوشت" اور "بو" جیسے افسانے لکھے تو ان پر فحاشی اور عریانی کے الزام لگائے گئے اور مقدمے چلائے گئے۔ عصمت تو ان دکھوں کو سہہ گئی لیکن منٹو نے اپنے روح کے کرب کو شراب میں گھول کر پینا شروع کر دیا اور جوانی کی موت مر گیا۔ شاعری میں بھی لوگ جب تک ذوق اور داغ کے انداز میں شاعری کرتے رہے محفوظ رہے لیکن جب مصطفیٰ زیدی نے براہِ راست شہناز گل کے حوالے سے غزلیں اور نظمیں لکھنی شروع کیں اور جنسی جذبات کو موضوعِ سخن بنایا تو

فن کار خود نہ تھی مرے فن کی شریک تھی
وہ روح کے سفر میں بدن کی شریک تھی
اس پہ کھلا تھا باب وفا کا ورق ورق
بستر کی ایک ایک شکن کی شریک تھی

تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بھی منٹو کی طرح اتنے کچھ کے سہے گا کہ جوانی کی موت مر جائے گا۔ اسی لئے اس نے لکھا تھا کہ ؂

اب جی ورودِ سوز دروں سے گزر گیا
اچھا وہی رہا جو جوانی میں مر گیا

اگرچہ منٹو کے افسانے سب چھپ چھپ کر پڑھتے ہیں لیکن آج بھی انہیں نصاب میں شامل نہیں کرتے۔

یہ چھپ چھپ کر ہر کام کرنا میری برادری کا خاصہ ہے۔ سب کام رازدارانہ انداز میں کئے جاتے ہیں۔ لوگوں میں اپنی زندگی کی حقیقتوں کو برسرِ عام پیش کرنے کی ہمت نہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ چھپ چھپ کر کام کرنے کی فضا گناہوں کو ترغیب دیتی ہے۔ اس لئے وہ جنسی تعلقات بھی رات کی تاریکی میں سرانجام دیتے ہیں اور دن چڑھے گونگے ہو جاتے ہیں۔

میں جب تمہیں جنس کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے دیکھتی ہوں تو مجھے رشک آتا ہے شاید تمہاری مغربی ماحول میں پرورش نے تمہیں آزاد خیالی اور خود اعتمادی بخشی ہے۔ تم PENIS کا ذکر کرتی ہو تو میرے ذہن میں آلۂ تناسل کا لفظ آتا ہے۔ تم VAGINA کہتی ہو تو میرے ذہن میں اندامِ نہانی کی اصطلاح ابھرتی ہے لیکن جب تم ORGASM کو موضوعِ سخن بناتی ہو تو میرے ذہن میں کوئی لفظ، کوئی ترکیب، کوئی تشبیہہ، کوئی استعارہ نہیں ابھرتا ___ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ نہ تو مجھے اور نہ ہی میری قوم کے مردوں اور عورتوں کو ORGASM کا تجربہ ہوا ہے ___ ایسا نہیں ہے لیکن ہم نے کبھی اس کا اقرار نہیں کیا۔ کیوں کہ ہمارے یہاں جنسی تعلقات کا

مقصد افزائش نسل رہا ہے اس لئے لذت حاصل کرنا گناہ قرار دیا گیا ہے اور وہ لوگ جو جنسی تعلقات سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں ان میں سے اکثر احساس گناہ میں مبتلا رہے ہیں۔ جنسی تعلقات تو ایک طرف میری برادری کے اکثر لوگ اب بھی حیض کے لئے آنچل میلا ہونا اور حمل کے لئے پاؤں بھاری ہونا کہنا پسند کرتے ہیں۔

لیکن اب میں جوان ہو گئی ہوں اور بالغ ہو گئی ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی زندگی کی حقیقتوں کا کھل کر اقرار کروں گی۔ میں نے جب سے تم سے تعلقات قائم کئے ہیں کھلی فضا میں سانس لینا شروع کیا ہے۔ میں نے اپنے دوستوں کو خاص کر جو مغرب میں جا بسے ہیں ترغیب دی ہے کہ ایسے الفاظ اور تراکیب تخلیق کریں جن سے جنسی تعلقات کے بارے میں کھل کر گفتگو ہو سکے۔ ہم کب تک کبوتروں کی طرح آنکھیں بند کئے بیٹھے رہیں گے۔ میں نے پچھلے دنوں پڑھا تھا کہ مغرب کے چند نوجوانوں نے اس منزل کی طرف چند قدم بڑھائے ہیں۔ ان کی تحریروں میں:

ORGASM کے لئے جنسی معراج

ANAL INTERCOURSE کے لئے عقبی مباشرت

ORAL INTERCOURSE کے لئے دہنی مباشرت

جیسے الفاظ نظر آتے ہیں جو ایک امید افزا شگون ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ بعض روایت پسند لوگوں کی طبیعتوں پر یہ الفاظ گراں گزریں گے لیکن یہ ان کے لئے چیلنج ہوگا۔ وہ یا تو یہ تراکیب استعمال کریں گے یا ان سے بہتر لے کر آئیں گے۔

مجھے یہ بھی احساس ہے میری جھولی میں دوست، محبوب، منگیتر اور بیوی جیسے الفاظ تو ہیں لیکن جب تم BOY FRIEND اور GIRL FRIEND کا ذکر کرتی ہو تو میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ میرے پاس ان کے لئے کوئی متبادل الفاظ نہیں ہیں۔ میں نے ایک دفعہ کوشش کی تھی کہ اپنی ہمسائی فارسی سے اس کے الفاظ دختر دوست اور پسر دوست مستعار لے لوں لیکن میرے قبیلے کے لوگوں کو وہ الفاظ پسند نہ آئے۔ انہیں شاید ڈر تھا کہ ان کی جوان بیٹیاں اور جوان بیٹے گھروں سے بھاگ جائیں گے ویسے

جب سے میں نے پنجابی سے دوستی کی ہے اس کی بے تکلف شخصیت کا مجھ پر اثر ہونے لگا ہے اور میرے لکھنوی مزاج میں کچھ تبدیلی آنے لگی ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ جب میں پنجابی کے الفاظ استعمال کرتی ہوں تو میرے رشتہ دار میری زبان کی صحت پر اعتراض کرنے لگتے ہیں اور اس طرح میرے خاندان کی روایت پسندی میرے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے اور میں اپنے قلبی جذبات کا کھُل کر اظہار نہیں کر سکتی۔

میری محبوب انگریزی!

میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن جب بھی اس کا اظہار کرنا چاہتی ہوں تو شرم و حیا کا دامن ہاتھ سے چھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ میرے پاس مباشرت اور ہمبستری جیسے الفاظ ہیں لیکن تمہارے پاس TO MAKE LOVE TO جیسی خوبصورت ترکیب ہے تو کیوں نہ میں آج تم سے تمہاری ہی خوبصورت ترکیب میں کہوں "LET'S MAKE LOVE TONIGHT"۔

تمہاری محبوبہ

اُردو

کچے دھاگے

خالد سہیل

میں ہر روز شام کو جورج سے ملنے ہسپتال چلا جاتا، گھنٹوں اس کے سرہانے بیٹھا رہتا اور پھر دل شکستہ گھر لوٹ آتا۔ بعض دفعہ تو تھکاوٹ اتنا نڈھال کر دیتی کہ سر میں درد ہونے لگتا۔ گھر میں شمسہ میرے سر کو دباتی۔ مجھے دودھ کے ساتھ اسپرین کی دو گولیاں دیتی اور میں سو جاتا لیکن پھر آدھی رات کو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور بقیہ رات کروٹیں بدلتے گزار دیتا۔

"جورج کی بیماری تمہیں بھی بیمار کر دے گی۔" شمسہ مجھے سمجھاتی لیکن میں اس کی باتوں کو نظر انداز کر دیتا۔ ان تین مہینوں میں جس کی ہر شام میں نے جورج کے کمرے میں گزاری تھی۔ اس کا نہ کوئی اور دوست نہ رشتہ دار اور نہ ہی رفیق کار اس کی تیمارداری کرنے آیا تھا۔ جورج کی بیماری اسے گھن کی طرح کھا گئی تھی اور اسے بسترِ مرگ پر گھسیٹ لائی تھی۔

"کیا میرا تو یہ حشر نہ ہوگا؟" مجھے یہ خیال آتا تو میرے سراپا میں کپکپی دوڑ جاتی۔

میں نے جارج کو زینہ بہ زینہ زندگی کی قبر میں اترتے دیکھا تھا۔ اس کے من کے سورج کو، جو ابھی پوری طرح چمکا بھی نہ تھا گرہن لگ گیا تھا اس کی آنکھیں، جو

ہر لمحہ مسکراتی رہتی تھیں، روٹھ گئی تھیں، اس کے گال، جو شرارت سے سُرخ رہتے تھے اندر کو دھنس گئے تھے۔ اس کی گردن جو خم دار تھی، سوکھی شاخ بن گئی تھی، اس کے ہونٹ جو بوسوں سے شاداب رہتے تھے، ویران ہو گئے تھے۔ اس کا سراپا جو خوبصورتی اور وجاہت کی زندہ مثال ہوا کرتا تھا، ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔

اس کی زندگی کا درخت پھلوں، پھولوں اور پتیوں سے محروم ہو گیا تھا اور اپنی عریانی اور بے لبسی پر نادم تھا۔

اس کی سانسیں اکھڑی اکھڑی رہتیں۔

موت اپنا دامن وا کیے اس کا انتظار کر رہی تھی اور وہ ہسپتال کے کمرے میں لیٹا زندگی کو الوداع کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں جب پہلی دفعہ جورج سے ملا تھا تو اس کی ذہانت اور ظرافت سے متاثر ہوا تھا۔ ہم کچھ دوست ایک پارٹی میں لطیفے سنا رہے تھے جب کسی نے کہا "سنا ہے جورج بھی اس محفل میں آیا ہے۔ اس سے ملے عرصہ بیت گیا ہے۔ اس کے قہقہے دور سے پہچانے جاتے ہیں" تو اچانک جورج آ گیا۔

"Think of the devil and there he blows"

جورج نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا اور سب سے ہاتھ ملانے لگا۔

"میں Devil ہوں، لوگ مجھے جورج کہتے ہیں۔"

"میں پیغمبر ہوں اور لوگ مجھے شعیب کہتے ہیں۔" میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا "پھر تو ہم دونوں کی خوب نبھے گی۔"

وہ دراز قد انسان تھا، قدرے فربہ جسم، گھنگریالے سنہرے بال، چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت۔

"انگریزی زبان بہت متعصب ہے۔" وہ پھر بولا

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا

"اسے مردوں نے اور وہ بھی اسٹریٹ (STRAIGHT) مردوں نے وضع کیا ہے"۔
"میں سمجھا نہیں۔"
"انگریزی میں جب HE کہتے ہیں تو اس میں عورتیں شامل ہوتی ہیں لیکن جب SHE کہتے ہیں تو اس میں مرد شامل نہیں ہوتے۔"
"اور اسٹریٹ مردوں کی کسطرح؟"
اگر انگریزی گے (GAY) مردوں نے بنائی ہوتی تو اس میں 'BACKWARD EXPRESSION جیسے BEHIND MY BACK اور BACK SEAT DRIVER کے مفہوم مختلف ہوتے۔
"لیکن اردو کا بھی یہی حال ہے۔"
"وہ کس طرح؟" جورج متوجہ ہوا
"اس میں بھی مردانہ وار مقابلہ اور پیٹھ پیچھے برائی جیسے EXPRESSIONS ہیں۔
اور ہم لوگ ہنس دئے ہیں جیسے ہم دونوں کا ویولینتھ (WAVELENGTH) ایک جیسا ہو
اس کے بعد جورج مجھ سے بات کرنے لگا۔ گفتگو کے دوران پوچھنے لگا۔
"آپ کون سا کھیل کھیلتے ہیں؟"
"ٹینس"
"میرے پاس ایک ٹی شرٹ (T-SHIRT) ہے۔ میں وہ آپ کو دوں گا۔"
اُس کی کیا خصوصیت ہے؟"
"اس پر لکھا ہے FOR TENNIS PLAYERS
LOVE MEANS NOTHING
اور ہم مسکرا دیے۔ جورج کہنے لگا کہ وہ بھی ٹینس کھیلتا ہے اور اسے ایک ساتھی کی تلاش ہے۔ چنانچہ ہم نے اکٹھے کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس وقت اندازہ نہ تھا کہ

میں انسانی رشتوں کی کس پگڈنڈی پر چل پڑا ہوں۔

اگلے چند مہینے ہم ہر ہفتے ٹینس کھیلنے لگے۔ ایک ہفتہ وہ میرے گھر آجاتا اور دوسرے ہفتے میں اس کے گھر چلا جاتا۔ جورج نہایت دلچسپ آدمی تھا۔ وہ ہر ہفتے کوئی نیا شوشہ چھوڑتا۔ ایک دن کہنے لگا۔

"انگریزی زبان گوروں نے بنائی ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"وہ ناپسندیدہ چیز کو کالا بنا دیتے ہیں۔"

"مثلاً"؟

"بلیک مارکیٹ (BLACK MARKET) بلیک منی (BLACK MONEY) اور بلیک شیپ (BLACK SHEEP)

ہندستان میں کالی بلی کا راستہ کاٹ جانا بدشگونی سمجھا جاتا ہے اور صدقہ دیتے وقت کالا بکرا ذبح کیا جاتا ہے۔"

جورج کو اقلیتوں کا بڑا خیال تھا۔ چاہے وہ عورتیں ہوں، کالے ہوں یا گے (GAY) لوگ۔ ان سب کے لئے ان کا ہمدرد دل دھڑکتا رہتا تھا۔ اس کی ہنسی مذاق کے پیچھے ایک نہایت ہی مخلص اور سنجیدہ دوست چھپا ہوا تھا۔

وہ ایک دفعہ مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اسے سیخ کباب کھلائے جو اسے بہت پسند آئے۔ وہ انہیں پاکستانی ہاٹ ڈاگ کہا کرتا تھا۔ پھر میں نے اسے لسی پیش کی وہ بھی اسے بہت پسند آئی۔ میں نے چینی ڈال کر اور اس نے نمک ڈال کر پی۔

ایک دفعہ میری والدہ نے مجھے دو ململ کے کرتے بھیجے تو ان میں سے ایک میں نے جورج کو تحفے میں پیش کر دیا۔ وہ اسے لیکر کافی دیر تک ناچتا رہا۔ پھر بولا۔

"پاکستانی عورتیں مردوں کو بھائی بنا لیتی ہیں۔ تم بھی کہیں یہ حماقت نہ کر لینا۔"

"وہ تو عزت کی بات ہے۔"

"عزت کی نہیں منافقت کی بات ہے۔"

اور ہم دونوں ہنس دئے۔

ایک دن جب ہم ٹینس کھیل رہے تھے تو میں فرش پر پھسل گیا اور میرے پاؤں میں موچ آ گئی۔ میری کمر کے پٹھے بھی کھنچ گئے۔ اس نے فوراً مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور کار میں ڈال کر اپنے گھر لے گیا۔ پہلے اس نے میرے جوتے اور موزے اتارے، میرے پاؤں پر مرہم لگائی، پھر میری ٹانگ پر مالش کی اور آخر میں مجھے بستر پر لٹا کر میرے سارے بدن کو مساج (MASSAGE) کیا۔

نہ جانے وہ میری تھکاوٹ تھی، اس کا لمس تھا یا ہمارے رشتے کی حدت کہ نہ صرف میرے جسم کا درد دور ہو گیا بلکہ میرے سراپا میں ایک بے نام سی لہر دوڑ گئی۔ ہماری قربتوں نے نیا موڑ لیا اور جب اس نے میرے سراپا کو اپنے بوسوں سے چھوا تو میں ایک نئی لذت سے سرشار ہوا۔ ایسی لذت جو عورتوں کی قربت کی لذت سے مشابہ بھی تھی اور مختلف بھی۔

جورج کہنے لگا کہ ایک دور وہ ہوا کرتا تھا جب انسان آدھا مرد تھا اور آدھی عورت۔ یونانی دیومالا میں اس کا ذکر آیا ہے اور پھر انسان پر خداوند زیوس کا قہر نازل ہوا اور وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس دن سے عورت مرد کی اور مرد عورت کی تلاش میں ہے لیکن جورج کا خیال تھا کہ ہر عورت میں مرد اور ہر مرد میں عورت پوشیدہ ہے۔

اس شام جورج کے لمس سے میرے اندر کی عورت انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی جس سے مجھے حیرانی بھی ہوئی تھی اور پریشانی بھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے گھر کے تہہ خانے سے ایک خزانہ نکل آیا ہو لیکن ایسا خزانہ جس کے چاروں طرف سانپ پھنکار رہے ہوں۔

اس واقعہ کے بعد کئی دفعہ جارج میرے ہاں اور میں اس کے ہاں رات رکا۔ ہمارے رشتے میں دوستی اور محبت آپس میں بغل گیر ہو گئے تھے۔

اور پھر ایک دن جذبات کا شیش محل چکنا چور ہو گیا

جورج نے مجھے ایک ایسی محفل میں جانے کی دعوت دی جس میں صرف گیز (GAYS) اور لیسبینز (LESBIANS) مدعو تھے۔ میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ شخص جو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا سیخ پا ہو گیا۔

"آخر تم کیوں نہیں جانا چاہتے"۔ اس نے پوچھا۔

"میرا جی نہیں چاہتا۔ تمہارا اور میرا رشتہ ذاتی ہے۔ ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت کیا ہے۔"

"کیا تم اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ پارٹیوں میں جاتے تھے یا نہیں۔"

"ہاں جاتا تھا"

"تو میرے ساتھ جانے میں کیا حرج ہے۔"

"تم ہمارے تعلقات کو مشتہر کرنا چاہتے ہو"

"شعیب!" وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح کمرے میں تیز تیز چل رہا تھا۔ "خلوص کسی سے نہیں ڈرتا۔

عشق بے خوف ہوتا ہے
انسانی رشتے قربانیوں سے پنپتے ہیں
اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ عشق
نہیں ہوس ہے ہوس"

"تم میرے خلوص کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہو۔
میں اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔"

اور میں اٹھ کر چلا آیا۔

اس واقعہ کے بعد نہ میں جورج کے ہاں ٹھہرا اور نہ ہی جورج نے میرے ہاں رات گزاری۔

ہمارے تعلقات جو دوستی سے شروع ہوئے تھے دوستی پر ہی آکر رک گئے۔

جورج کا خیال تھا کہ میں مغربی دنیا کے لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے گھبرا رہا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ میرے دل میں ابھی مشرقی دنیا کے بیسیوں بُت چھپے بیٹھے تھے۔

کئی مہینے گزر گئے۔ اس دوران جورج کو بِل (BILL) مل گیا اور میری شمسہ سے ملاقات ہو گئی۔

شمسہ اگرچہ ایک مذہبی گھرانے میں پلی بڑھی تھی لیکن اس کی یونیورسٹی کی تعلیم، زندگی کے تجربات اور دنیا کی سیر نے اسے ایک وسیع النظر انسان بنا دیا تھا۔

ایک دن میں نے شمسہ سے کہا "میں چاہتا ہوں تم میرے دوست جارج سے ملو۔"

"اس کے بارے میں کچھ بتاؤ"

"وہ نہایت نفیس انسان ہے، مخلص دوست ہے، اسکول ٹیچر ہے اور گے (GAY) ہے۔"

"کیا اکیلا رہتا ہے؟"

"نہیں اپنے لوَر (LOVER) بِل کے ساتھ۔ مین چاہتا ہوں کہ کسی دن جورج کو ڈنر پر بلاؤں۔"

"ضرور! جورج کو اکیلے کیوں بلاتے ہو، بل کو بھی بلالو۔"

میں شمسہ کے اس جواب سے حیران ہوا تھا۔ میں نے شمسہ کو UNDERESTIMATE کیا تھا۔ وہ میری توقعات سے زیادہ فراخدل تھی۔

شمسہ جورج اور بل سے ملی۔ اس نے دونوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ ان کی پزیرائی کی بلکہ جب میں جورج سے تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔ وہ بل سے گپ لگا رہی تھی۔ دونوں شمسہ سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے جاتے ہوتے اسے کھانے پر بھی بلایا تھا۔

ویسے تو میں جورج سے اکثر ملتا رہتا لیکن کبھی کبھار ہم چاروں بھی اکٹھے

ہو جاتے اور کافی گپ شپ رہتی۔

آخر ایک دن جورج نے مجھے اپنے گھر بلا لیا۔

وہ اکیلا بیٹھا رو رہا تھا۔ میں نے کبھی جورج کو اس حالت میں نہ دیکھا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"ڈاکٹروں نے بتایا کہ مجھے ایڈز ہو گیا ہے۔"

"کب بتایا؟"

"آج ہی۔"

مجھ پر جیسے بجلی گری۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن مجھے جورج کے ساتھ ساتھ اپنی اور شمسہ کی فکر بھی دامن گیر ہو گئی۔

"ابھی کسی کو بتانا نہیں" جورج نے درخواست کی۔

"اچھا"

"بل کو بھی نہیں"

"اچھا"

مجھے پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ جورج مجھ پر بل سے زیادہ اعتبار کر رہا تھا۔ "ایک لحاظ سے دوست محبوب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔" میں نے سوچا۔

میں اگلے دن اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ سو چکا تھا جسے ایڈز ہو گیا ہے۔

میں چند دن تک گم صم رہا۔ شمسہ نے کئی دفعہ پوچھا لیکن میں نے طبیعت کی خرابی اور سر درد کا بہانہ کر دیا۔ وہ بھی تھک ہار کر چپ ہو گئی۔

چند مہینوں کے بعد جورج کو ہسپتال داخل ہونا پڑا اور پھر اس کا راز سورج بن کر سب کے سروں پر چمکا لیکن وہ سورج عذاب کا سورج تھا جس نے سب رشتے جلا کر راکھ کر ڈالے۔

سب سے پہلے اسکول والوں کو پتہ چلا کہ جورج کو ایڈز ہو گیا ہے اور اسے اسکول سے نکال دیا گیا۔ اس نے لاکھ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کسی کو چھونے سے ایڈز نہیں ہوتا لیکن اس کی بات کوئی سننے والا نہیں تھا۔ بچوں کے والدین نے احتجاج کیا۔ اخبار میں خبریں چھپیں اور اسے برطرف کر دیا گیا۔

خبر کا چھپنا تھا کہ جورج کے خاندان کو پتہ چلا اور اس کے والدین نے اسے عاق کر دیا۔ اس کے والد کا خط آیا جس میں لکھا تھا "ہمیں امید نہ تھی کہ ایک دن تم شہر میں ہمیں یوں بدنام کرو گے۔"

آہستہ آہستہ اس کے دوست اس سے کنارہ کش ہو گئے اور آخر کار بل بھی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

میں نے شمسہ کو بتایا تو وہ بولی "بے چارہ بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا ہے۔"

شمسہ کی ہمدردی سے مجھے ایک دفعہ پھر حیرانگی ہوئی۔ وہ میری توقعات سے زیادہ رحمدل تھی۔

جورج کو جس دن ہسپتال جانا تھا وہ ایک سوگوار دن تھا۔ میں اور جورج کافی دیر تک ہسپتال کے ویٹنگ روم میں بیٹھے رہے۔ پہلے تو ڈاکٹر اور نرس بڑی ہمدردی سے ملے لیکن جوں ہی انہیں پتہ چلا کہ جورج ایڈز کا مریض ہے ان کے چہروں پر سرد مہری کا غلاف چڑھ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے اپنے چاروں طرف دیواریں کھڑی کر لی ہوں۔

پہلے جورج کو دوسری منزل کے ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ اس کی طبیعت روز بروز دگرگوں ہوتی جا رہی ہے تو اسے چوتھی منزل پر ایڈز (AIDS) وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔

میں ہر شام اس سے ملنے جاتا لیکن اکثر اوقات وہ یا تو سو رہا ہوتا یا بے ہوش ہوتا۔ میں اس سے زیادہ اس کی نرس سنتھیا سے بات چیت کرتا جو بہت ہمدرد عورت تھی اور اس کا خاص خیال رکھتی تھی۔

سنتھیا نے مجھے بتایا کہ جورج بہت چڑچڑا ہو گیا تھا اور بات بات پر کاٹ

کھانے کو دوڑتا تھا لیکن پھر کہنے لگی "وہ تمہیں بہت عزیز رکھتا ہے۔"

"تم کیسے جانتی ہو؟"

"تمہارا نام لیتا ہے تو اس کے بیمار چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔"

میں سنتھیا کے رویّے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ میں اس سے پوچھنے لگا۔

"تمہیں یہاں کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"ہسپتال میں تو پندرہ سال ہو گئے ہیں لیکن ایڈز وارڈ میں پانچ سال۔ میں اسی دن سے یہاں کام کر رہی ہوں جس دن سے یہ وارڈ کھلا تھا۔"

"ان پانچ سالوں میں کیا کوئی فرق آیا ہے؟"

"بہت فرق۔ مریضوں میں بھی۔ نرسوں میں بھی۔ مریضوں کے خاندانوں میں بھی اور عوام میں بھی۔"

"کس قسم کا فرق"؟

پہلے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ گے (GAY) لوگوں کی بیماری ہے، افریقہ سے آئی ہے اور جنسی تعلقات سے پھیلتی ہے۔ آہستہ آہستہ انہیں اندازہ ہوا کہ وہ امریکہ میں بھی اتنی ہی ہے جتنی افریقہ میں اور یہ صرف جنسی تعلقات سے ہی نہیں جسم کی کسی رطوبت (BODY FLUID) سے بھی پھیل سکتی ہے۔ اس وقت ہمارے وارڈ میں پانچ بچے بھی داخل ہیں۔ ان میں سے دو ہیموفیلیا (HEMOPHILIA) کے مریض ہیں جنہیں خون سے یہ بیماری ملی ہے اور تین بچے تو ماں کے پیٹ سے یہ بیماری لے کر آتے ہیں۔"

"لوگوں کے رویے میں کیا فرق آیا ہے۔"

"لوگوں کو آہستہ آہستہ احساس ہو رہا ہے کہ یہ لوگ نہ تو مجرم ہیں نہ گنہگار یہ مریض ہیں اور انہیں ہمدردی کی ضرورت ہے۔ غصے اور نفرت کی نہیں۔"

ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ جورج جاگ گیا۔ میں نے اور سنتھیا نے مل کر اس کی مدد کی اور وہ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے زرد بیمار چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔

"مجھے تمہاری لسی بہت یاد آتی ہے۔ اگلی دفعہ لے کر آنا۔ تم میٹھی پینا۔ میں نمکین پیوں گا۔"

"بہت اچھا۔"

"اور میرا کرتا بھی لے کر آنا"

"لیکن تم تو بھائی نہیں بننا چاہتے تھے۔"

"چلو بہن بنا لینا"

اور ہم دونوں مسکرا دیے۔ پھر وہ اچانک بہت جذباتی ہو گیا۔

"شعیب! میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

"میں نے بھی۔"

"تم نے کیا سیکھا ہے" اس نے پوچھا

"محبت کرنے کے لئے انسان کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اور تم نے۔"

"دوستی محبت سے بھی عظیم تر جذبہ ہے۔"

اور پھر وہ منہ موڑ کر لیٹ گیا۔ تکیہ میں اس کے آنسو جذب ہو رہے تھے۔

وہ جورج اور میری آخری گفتگو تھی۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ جورج چند دنوں کا مہمان ہے۔

اگلے دن سنتھیا نے مجھے بتایا کہ جورج کی خواہش تھی کہ میں چند دن کے لئے کام سے چھٹی لے لوں اور اس کے پاس رہوں تاکہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو اس کے پاس موجود رہوں۔

اس شام میں شمہ کی گود میں سر رکھے رو رہا تھا۔

"تم کیوں رو رہے ہو" شمہ نے پوچھا

"میرے دل پر بھاری بوجھ ہے۔ میرا دوست مر رہا ہے۔"

"شعیب! مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں۔ تم نہایت ہی خود غرض انسان ہو۔"

میں اس حملے کے لئے تیار نہ تھا۔

"تم خود غرض ہی نہیں بہت بزدل اور ذلیل بھی ہو۔"

"خیریت"۔ میں حیران پریشان تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں کوئی بے وقوف لڑکی ہوں۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ جورج تمہارا دوست ہی نہیں محبوب بھی تھا۔"

"وہ کیسے؟"

"پہلے دن ہی جو میں ان سے ملی تھی میں نے بل کی آنکھوں میں تمہارے لئے حسد کی چنگاریاں دیکھ لی تھیں اور میں اتنی نادان بھی نہیں کہ یہ نہ سمجھ سکوں کہ جب سے جورج کو ایڈز ہوا ہے تم ہمیشہ کنڈوم (CONDOM) کیوں استعمال کرتے ہو۔ اگر تم میں ذرا بھی ہمت اور جرأت ہوتی تو تم مجھ سے کھل کر بات کرتے۔ میں نے تم سے کئی دفعہ پوچھا لیکن تم نے موضوع بدل دیا۔"

"میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے ایڈز ٹسٹ کرایا ہے اور وہ منفی ہے۔"

میرے سر پر گھڑوں پانی پھر گیا۔

"میں کئی ہفتوں سے غصے کی آگ میں جھلس رہی تھی۔ کئی دفعہ سوچا کہ تم جیسے ذلیل آدمی کو چھوڑ کر چلی جاؤں لیکن ......"

اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلے دن شمہ نے آ کر میری گردن میں بازو ڈال دیئے۔

"لیکن ......؟" میں نے پوچھا

"مجھے تم سے محبت ہے اور جورج سے ہمدردی۔ میں نے اپنا ٹسٹ بھی کرایا ہے۔ وہ بھی منفی ہے۔"

"میں ڈر رہا تھا ...."

"کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

میں خاموش رہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم دفتر سے چھٹی لو اور جورج کی جی بھر کے تیمار داری کرو"

"لیکن ..... لیکن ....."

میری زبان میں ہکلاہٹ پیدا ہونے لگی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے ہمدردانہ انداز سے پوچھا

"بعض دفعہ ایڈز کی بیماری کئی سالوں کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔"

"جب ہم اس دریا پر پہنچیں گے تو اسے بھی پار کر لیں گے۔"

میں نے شمسہ کو گلے سے لگا لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے شمسہ نے اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے میری روح کا کانٹا نکال دیا ہو ٭

٭٭٭

میں آج آپ سے آخری بار ملنے آیا ہوں اور اگر یہ کہوں کہ ملنے آئی ہوں تو زیادہ سچ ہو گا۔

آپ ماہرِ نفسیات ہیں اور میں ایک مریض اور اس ملاقات کا وقت میرا ہے۔ آپ خود ہی کہا کرتی ہیں کہ میں اس وقت کو جس طرح چاہے استعمال کروں۔ جس موضوع پر چاہے تبادلۂ خیال کروں، جس مسئلے کو چاہے چھیڑوں اور اگر خاموش رہنا چاہوں تو یہ بھی میرا اختیار ہے۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ آپ مذاق کر رہی ہیں لیکن آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہوا کہ آپ سچ کہتی ہیں۔ آپ ہمدرد ہیں اس لئے میں بار بار آپ سے ملنے آتا ہوں اور اسی لئے آج بھی ملنے آیا ہوں۔ آج میرا جی چاہتا ہے کہ اس ملاقات میں میرے جی میں جو کچھ آئے کہہ دوں اور آپ بس سنتی رہیں۔ نہ مجھے کوئی مشورہ دیں اور نہ نصیحت کریں۔ میں مشوروں اور نصیحتوں سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔

میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں موت کا خیال زندگی کے تصور سے زیادہ حسین نظر آتا ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ میری گفتگو کے دوران مجھے روکیں یا ٹوکیں۔ میرے جی میں جو آئے۔ میرے دماغ میں جو آئے مجھے کہنے دیجئے۔ پہلی اور آخری بار

مجھے سب کچھ کہہ لینے دیجئے۔ مجھے دل کا سارا غبار، ساری بھڑاس، سارا درد نکال لینے دیجئے۔ آپ میری تھیراپسٹ ہی نہیں انسان بھی ہیں۔ آپ مجھے برسوں سے جانتی ہیں۔ میں ہر ماہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور اپنی دکھ بھری کہانی سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ تحمل سے سنتی رہتی ہوں لیکن نہ تو آپ کچھ کر سکتی ہیں اور نہ میں کچھ کر سکتا ہوں اس لئے کیوں نہ آج ہی اس حقیقت کا اقرار کرلیں کہ ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔

اگر آج میری زبان لڑکھڑا جائے یا خیالات بے ترتیب ہو جائیں یا موضوعات بدل جائیں تو معاف کردیں۔ انسان جذباتی ہو جائے تو پریشان خیالی بھی در آتی ہے لیکن یہ بھی انسانی فطرت ہے۔ اگر زندگی پریشان ہو تو اس کا اثر جذبات اور خیالات پر بھی پڑتا ہے۔

آج آپ بس سنتی رہیں ایک دوست کی طرح، ایک ہمدرد کی طرح کیونکہ میری زندگی میں آپ واحد انسان ہیں جسے میں اپنا غم خوار سمجھتا ہوں اور اب میں اپنی ساری کہانی آخری بار سنا دینا چاہتا ہوں۔ ایسی کہانی جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ جو نہ جانے کہاں سے شروع ہوئی تھی اور نہ جانے کہاں ختم ہوگی۔

میری زندگی اون کا وہ گچھا ہے جسے کسی بلّی نے کھیلتے کھیلتے الجھا دیا ہو۔

آپ بس میری باتیں سنتی رہیں۔ اگر بور بھی ہو جائیں تو برداشت کرلیں۔ انسانی زندگی کے بعض حصے بورنگ بھی ہوتے ہیں لیکن ہمیں برداشت کرنے پڑتے ہیں جیسے زندگی میں بورنگ دوستوں اور بورنگ رشتہ داروں سے بھی نباہ کرنا پڑتا ہے۔

پچھلے کئی سالوں سے میں آپ کی ہمدردی، حوصلہ افزائی اور مدد کے باوجود میری حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ میری زندگی دلدل کی طرح ہے۔ جتنا اوپر کی طرف جانا چاہتا ہوں اتنا ہی اندر دھنستا چلا جاتا ہوں۔ اس لئے اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اوپر اٹھنے اور باہر نکلنے کی سعی ہی نہ کروں۔ جب تباہ ہونا ہی ٹھہرا تو آج تباہ ہوئے یا کل۔

جب میں آپ سے ملا تھا تو میرا ایک گھر بھی تھا اور میری ملازمت بھی تھی لیکن میں پریشان تھا، غم زدہ تھا۔ آج برسوں کی ریاضت کے بعد ناامیدی کا تو وہی حال ہے

بلکہ یہ اور بڑھ گئی ہے۔ اب نہ میرا کوئی گھر ہے اور نہ کوئی ملازمت۔ میں ایک بیسمنٹ اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں۔ اکیلا۔ تن تنہا۔ جیسے حشرات الارض سردیوں میں زیرِ زمین مہینوں گزار دیتے ہیں لیکن انہیں تو موسم گرما کے آنے کی امید ہوتی ہے مگر مجھے تو وہ امید بھی نہیں رہی۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ مسکرا رہی ہیں۔ آپ کی مسکراہٹ میں شفقت کیساتھ ساتھ قدرے طنز بھی ہے۔ آپ کبھی کبھار سمجھتی ہوں کہ میں اپنا غم بیان کرتے کرتے شاعرانہ انداز اختیار کر لیتا ہوں یا اس میں افسانویت پیدا کر دیتا ہوں لیکن یہ خوشی سے نہیں مجبوری سے ہوتے ہیں کیوں کہ الفاظ انسانی غم کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتے اس لئے تشبیہوں اور استعاروں کی بیساکھیاں ڈھونڈ لاتے ہیں تاکہ اس کے سہارے چند قدم اور چل سکیں۔

میں آج آپ کو اس لئے بھی اپنی کہانی سُنا رہا ہوں کیوں کہ آپ نے کہا تھا کہ ماہر نفسیات ہونے کے ناتے آپ مریضوں کی کہانیوں کا ریکارڈ رکھتی ہیں۔ میری بھی خواہش ہے کہ میری بپتا بھی کہیں ریکارڈ ہو جائے۔ نہ جانے مجھ سے پہلے اس دنیا میں مجھ جیسے کتنے آئے اور گزر گئے اور کچھ ریکارڈ نہ ہو سکا۔ اگر میں کوئی ادیب یا فنکار ہوتا تو اپنی سوانح خود ہی لکھ لیتا لیکن میں ایک مظلوم و مجبور انسان ہوں جس کے پاس نہ دولت ہے، نہ وسائل اور نہ ہی ٹیلنٹ (TALENT)۔ اگر ٹیلنٹ ہے بھی تو کسی نقطے پر مرکوز نہیں۔ انسانی صلاحیتیں بھی تو سورج کی شعاعوں کی طرح ہوتی ہیں۔ اگر ایک نقطے پر مرکوز نہ ہوں تو آگ پیدا نہیں کر سکتیں۔ میرا یہ خیال تھا کہ شاید آپ کی ذات میرے لئے محدّب عدسے کا کام کرے گی لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ آج میں اپنے رشتے کا ماتم بھی کرنے آیا ہوں کیوں کہ آج کے بعد ہمارا رشتہ بھی نہ رہے گا۔ میں نہ رہوں گا تو میرے سارے رشتے بھی نہ رہیں گے۔ وہ ایک دن ختم ہونے ہی تھے۔ آج نہیں تو چند مہینے بعد سہی۔

میں نے پھر کسی دکھی شاعر کا شعر پڑھا تھا

میں آج مرتا کہ دو چار دس مہینے بعد
یہ سانحہ تو بہر حال ہونے والا تھا

اب میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے چہرے پر بھی غم کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ بھی میرے دکھ میں شریک ہیں لیکن ساتھ ہی بے بس بھی ہیں۔ ایک انسان آخر کب تک دوسرے انسان کو تسلیاں دیتا رہے۔ موت کا ہاتھ زندگی کے ہاتھ سے زیادہ مضبوط رہا ہے۔ زندگی موت کے دو لمحوں کے درمیان طویل یا مختصر سفر ہی کا تو نام ہے۔ آپ کہیں گی کہ آج کچھ زیادہ ہی قنوطی ہو گیا ہے۔ کبھی کبھار تو مزاح بھی پیدا کیا کرتا تھا۔ مزاح جو ایک ایسا ہتھیار ہے جو موت کے خلاف بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔ موت عقل اور دلیل کی نسبت مزاح سے زیادہ ڈرتی ہے اور عارضی طور پر پسپا بھی ہو جاتی ہے۔ بہر حال یہ میرا خیال ہے۔ اسی لئے مزاح نگار در حقیقت اندر سے بہت غمگین ہوتے ہیں۔

میں ذرا پانی کے چند گھونٹ پی لوں کیوں کہ آج مجھے بہت سی باتیں کرنی ہیں اور آپ کو سننی ہیں۔

مجھے وہ سہ پہر بخوبی یاد ہے جب پہلی دفعہ میں آپ سے ملنے آیا تھا۔ میں کسی ماہرِ نفسیات سے پہلے کبھی نہ ملا تھا اور نہ ہی میں جانتا تھا کہ ماہرِ نفسیات ہوتے کون ہیں۔ مجھے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ سائیکالوجسٹ (PSYCHOLOGIST) اور سائیکاٹرسٹ (PSYCHIATRIST) میں کیا فرق ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں ماہرِ نفسیات کے لفظ کے ساتھ جو واحد تصور ابھرتا تھا وہ ہپناٹزم کا تھا۔ آپ کے پاس آنے کا مشورہ مجھے میرے گاؤں کے ڈاکٹر نے دیا تھا۔ شاید اس کا علم اور تجربہ اور میرے غم اور کیفیت کے آگے گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ اور بے چارہ کرتا بھی کیا۔ خود بھی تو مجبور تھا وہ۔ سارا دن نزلہ، زکام، کھانسی اور بخار کا علاج کیا کرتا تھا۔ میرے مصائب و آلام کے ساتھ اس کا واسطہ پڑا تو گھبرا گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے ترس بھی آتا۔ وہ مجھے اس بچے کی طرح لگتا جسے ٹینس کی گیند کھیلتے کھیلتے اچانک فٹ بال مل جائے اور اس کی سمجھ

میں نہ آئے کہ اس سے کیسے کھیلے۔

شروع میں تو اس نے میری بہت مدد کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ میں نے ہی تو اسے اپنے دل کا پورا حال نہ سنایا تھا کیونکہ میں اپنے راز اپنے آپ سے بھی چھپائے پھرتا تھا۔ میری بیوی نے میری حالتِ ناگفتہ بہ دیکھ کر ڈاکٹر کو فون کیا تھا اور میرے لئے اپوائنٹمنٹ (APPOINTMENT) لی تھی اور میں اپنی بیوی کا دل رکھنے کے لئے چلا گیا تھا۔ میں سارا راستہ سوچتا رہا تھا کہ اسے کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔

بہرحال وہ سوال پوچھتا رہا اور میں جواب دیتا رہا۔ اس کے سوال بھی سطحی تھے اور میرے جواب بھی۔ کسی سے صحیح سوال پوچھنا جواب دینے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ آج تک شاید انسان نے سوال پوچھنے کا فن نہیں سیکھا۔ اگر کسی سنار سے کوئی لوہار بیسیوں سوال بھی پوچھ لے تو سونے کی حقیقت نہ جان پائے گا۔ میرے ڈاکٹر کا بھی یہی حال تھا۔ اسے میری جسمانی صحت، میری بھوک، میری خوراک اور میرے وزن کا زیادہ خیال تھا۔ آخر میں کہنے لگا کہ تمہیں ڈیپریشن (DEPRESSION) کی بیماری ہے پھر اس نے مجھے کسی طبی کتاب کے چند اوراق پڑھ کر سنائے جن کا مفہوم یہ تھا کہ ذہن کے خلیوں میں جب چند کیمیائی مادے کم ہوتے ہیں تو انسان ڈیپرس (DEPRESS) ہو جاتا ہے اور اس کا علاج ایسی ادویہ سے کیا جاتا ہے جو اینٹی ڈیپریسنٹس (ANTI-DEPRESSENTS) کہلاتی ہیں۔ اس نے مجھے دو ہفتے کا نسخہ لکھ کر دیا۔ پہلی رات ایک گولی، دوسری رات دو، تیسری رات تین اور پھر ہر رات چار۔ میں نے چند دن تو وہ گولیاں کھائیں لیکن جب میرے ہونٹ خشک، آنکھوں کے آگے اندھیرا اور جسم پر رعشہ طاری ہونے لگا تو میں نے وہ گولیاں کھانی بند کر دیں۔ ڈاکٹر کہنے لگا کہ وہ سائیڈ ایفکٹس (SIDE-EFFECTS) ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر بہتر نہیں ہو سکتا تو کم از کم بدتر تو نہ ہوں۔ میں نے دوائیاں کھانی بند کر دیں لیکن ڈاکٹر کو نہ بتایا۔

آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ میں بہت نادان تھا کیونکہ میں اپنی امید کو اپنے سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ امید سادگی، بیوقوفی یا تجربہ کاری کا ہی دوسرا نام ہے۔

جب چند ہفتوں کے علاج کے بعد میرے کرب میں جسے ڈاکٹر نے اپنی سہولت کے لئے ڈیپریشن (DEPRESSION) کا نام دے رکھا تھا کچھ کمی نہ آئی تو وہ پریشان ہوا اس کے بعد اس نے جب میری زندگی کو ذرا گہرائی سے جاننا چاہا تو اسے اندازہ ہوا کہ میں اور میری بیوی ایک ہی گھر میں دو ہمسایوں کی طرح رہتے ہیں۔ کہنے لگا تمہاری ڈیپریشن کی وجہ ازدواجی کشیدگی ہے۔ پھر اس نے میری بیوی کو بلایا اور تفصیلی گفتگو کی۔ وہ بھی اسی ڈاکٹر کا حوصلہ تھا کہ باہر مریض بیٹھے رہتے اور وہ ہماری کہانیاں سنتا رہتا۔ آخر جب اسے اندازہ ہوا کہ اس کی ملاقات ایسے دو انسانوں سے ہوئی ہے جو ایک دوسرے سے محبت تو کرتے ہیں لیکن ایک دوسرے کے ساتھ رہ نہیں سکتے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ہماری جنسی زندگی نہ ہونے کے برابر ہے تو وہ کہنے لگا کہ تم نامرد (IMPOTENT) ہوتے جا رہے ہو اور چونکہ نامردی کی بیشتر اوقات وجہ نفسیاتی ہوتی ہے اس لئے تمہیں کسی ماہرِ نفسیات سے مشورہ کرنا چاہئے۔

چونکہ اس گاؤں میں کوئی ماہرِ نفسیات نہ تھا اس لئے اس نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا۔ دراصل اس طرح وہ خود چین کی نیند سونا چاہتا تھا۔

میں جب بس میں بیٹھا پہلی دفعہ آپ سے ملنے آیا تو میں نے سوچا کہ بیچارے ڈاکٹر کا بھی کیا قصور۔ جب تک میں خود اپنے دل کا حال نہ بتاؤں گا ڈاکٹروں کو کیا خاک سمجھ میں آئے گا۔ وہ کوئی خدا تو ہے نہیں کہ دلوں کا حال جانیں۔ ویسے یہ خدا کا نام میں نے عادتاً لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر واقعی خدا ہوتا تو انسانوں کے دلوں کا حال ایسا نہ ہوتا۔ بہرحال میں نے بس میں آتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کو صاف صاف دل کا حال سناؤں گا کیوں کہ اس وقت تک میرا ایمان تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کی مدد کر سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ آپ بھی

مجھے نامرد ثابت کردیں میں خود ہی کیوں نہ آپ کو بتا دوں کہ میں ایک عورت ہوں۔

آپ سے مل کر میں بہت خوش ہوا تھا۔ آپ کے لہجے کی متانت اور چہرے کی مسکراہٹ مجھے بہت پسند آئی تھی اور اس دن کے بعد میرے ذہن میں ماہرِ نفسیات کے الفاظ کے ساتھ ہپناٹائز کی بجائے مہربان آنکھوں اور شفیق چہرے کا تصور پیدا ہونے لگا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ آپ نے کیا سوال پوچھے اور میں نے کیا جواب دیئے لیکن اتنا ضرور تھا کہ میں نے حالِ دل سنایا اور آپ نے حالِ دل سُنا۔

میں نے آپ کو صاف صاف بتا دیا کہ میں ایک عورت ہوں۔ لیکن مرد کے جسم میں محصور ہوں۔ میرے اندر کی عورت باہر آنا چاہتی ہے لیکن میرا جسم ــ وہ قید ہے۔ وہ کوٹھری ہے ــ وہ قبر ہے جس نے اسے زندہ درگور کر رکھا ہے۔ چونکہ میں نے پہلے کبھی کسی کو سچی کہانی نہ سنائی تھی اس لئے میرے الفاظ لڑکھڑا لڑکھڑا گئے تھے لیکن نہ آپ نے مجھے ٹوکا تھا نہ روکا تھا جیسے آج آپ خاموشی سے سن رہی ہیں اور میں اپنی بپتا سنا رہا ہوں۔

میں نے پہلی دفعہ کسی دوسرے انسان کے سامنے اپنی عورت کو ننگا کیا تھا۔

آپ سنتی رہیں اور بڑی دیر تک سنتی رہیں آخر میں آپ نے کہا کہ آپ کے دو رفیق کار، دو سائیکالوجسٹ بھی میرا انٹرویو لیں گے، کچھ ٹسٹ دیں گے اور اس کے بعد میں آپ کے چیف کے ساتھ ملوں گا۔ اس دن مجھے سائیکالوجسٹ اور سائیکاٹرسٹ کے فرق کا پتہ چلا تھا۔ آپ نے کہا کہ معاملہ پیچیدہ ہے لیکن مایوس ہونے کی بات نہیں۔ آپ مجھ سے پہلے مجھ جیسے کئی مریضوں کا علاج کر چکی ہیں۔

میں نے پہلے تو سوچا کہ اس مرضِ لاعلاج کا کیا علاج ہو سکتا ہے لیکن بہرحال خاموش رہا۔ اپنی کم فہمی اور لاعلمی پر انکسار کرنا ہی اچھا لگتا ہے۔

پہلی ملاقات کے بعد جب میں بس میں واپس اپنے گاؤں جا رہا تھا تو مجھے خیال

آیا کہ میں آپ کو بہت سی باتیں بتانا بھول گیا تھا۔ آخر ایک ملاقات میں ایک پریشان خیال انسان کیا کیا بتا سکتا ہے۔ اگر ایک زخم ہو تو انسان دکھائے اور جب سراپا جسم ہی زخم بن جائے تو کوئی کیا کرے۔ باقی باتوں کے علاوہ مجھے ایک خواب بار بار یاد آرہا تھا جو میں بتانا بھول گیا تھا۔

میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ میں ایک صحرا۔ لق ودق صحرا میں بھاگا۔ سرپٹ بھاگا جا رہا ہوں اور بہت سے لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں صرف ان کی آوازیں سن سکتا ہوں۔ میں نہ تو انہیں دیکھ سکتا ہوں اور نہ ہی مڑ کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ بھاگتے بھاگتے جب میں نڈھال ہو جاتا ہوں تو مجھے اپنے سامنے ایک گنبد نظر آتا ہے لیکن بغیر دروازے کے۔ میں جب اس کے گرد چکر لگاتا ہوں تو اس کے عقب میں ایک دروازہ ابھرتا ہے اور میں اس میں داخل ہو جاتا ہوں۔ میرے داخل ہوتے ہی دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔ میں اس گنبدِ بے در میں محفوظ محسوس کرتا ہوں اور سکھ کا سانس لیتا ہوں۔ میرا تعاقب کرنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان کی آوازیں آنی بند ہو جاتی ہیں۔ لیکن پھر ایک آواز ابھرتی ہے ۔ ایک نسوانی آواز۔ سرگوشی کے انداز میں اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ گنبدِ بے در آسیب زدہ ہے جس میں وہ نسوانی آواز ہمیشہ کے لئے محصور کر دی گئی ہے۔ میں چیخنے لگتا ہوں اور میری نیند کھل جاتی ہے۔ میں اپنے سراپا کو پسینے میں شرابور پاتا ہوں۔

گھر پہنچا تو میری بیوی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اسے میں نے انٹرویو کی تفاصیل تو نہ بتائیں لیکن اتنا ضرور بتایا کہ مجھے ایک ہمدرد تھیراپسٹ مل گیا ہے جس نے مجھے امید دلائی ہے۔ میری بیوی کو بھی امید بندھی لیکن وہ بھی میری نادانی تھی۔ کسی انسان کو امید دلانا اسے تین منزلہ مکان کی چھت پر کھڑا کرنے کی طرح ہے۔ ایسی چھت جس پر بہت زیادہ پھسلن ہو جہاں سے وہ جلد یا بدیر گر پڑتا ہے اور پھر اس کا صحیح سلامت بچ جانا یا ہڈی پسلی تڑوا دینا اس کی قسمت پر منحصر ہوتا ہے۔

مجھے اپنی بیوی پر پیار بھی آتا اور ترس بھی۔ وہ ایک مخلص عورت اور محبت

کرنے والی بیوی تھی۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پلی بڑھی تھی جہاں ہر شخص خوف کی چادر اوڑھے زندہ رہتا تھا۔ اس کا باپ الکوہولک (ALCOHOLIC) تھا اور گالی گلوچ سے مار پیٹ تک سب جائز سمجھتا تھا اس لئے اس کے گھر والے اپنے گھر بھی کم ہی آتے تھے اور اجنبیوں کی طرح رہتے تھے۔ میری بیوی پیار کو ترسی ہوئی تھی۔ اس لئے جب مجھ سے ملی تو ایسے جیسے کسی صحرا نورد کو مدتوں کی مسافت کے بعد شیریں پانی کا چشمہ مل جائے۔ وہ مجھ سے پہلی دفعہ گلے ملی تو کہنے لگی کہ بیس ۲۵ سال کے بعد کسی سے گلے ملی ہوں لیکن وہ بھی کیا سادہ تھی اور میں بھی کیا سادہ تھا کہ یہ جانتے ہوئے کہ قربتیں فرقتوں کی تمہید ہوتی ہیں اس نے مجھے اپنی زندگی کا سارا حال سنا دیا۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن سب کچھ سنانے کے بعد بھی وہ نہ بتا سکا جو بتانا چاہئے تھا۔

آخر برسوں کے بعد بھی آپ کو دل کا حال سُنا دیا اسے نہ بتا سکا۔

میں ساری رات تکیے میں منھ چھپائے روتا رہا۔ اپنی بے وفائی پر، اپنی بیوی سے اپنے آپ کو چھپانے پر لیکن آنسو برسوں کی ناانصافیوں کا ازالہ کہاں کرتے ہیں۔ وہ تو بس دل کو تسلی دینے کے لئے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی بیوی سے جب بھی پوچھا تھا کہ تم مجھے چھوڑ کر کیوں نہیں چلی جاتیں تو وہ کہتی " میں تم سے محبت کرتی ہوں اور ویسے بھی نہ تم مجھے گالیاں دیتے ہو نہ مارتے پیٹتے ہو، نہ شراب پیتے ہو نہ جوا کھیلتے ہو" وہ ہر دفعہ اپنا مقابلہ اپنی ماں سے اور میرا مقابلہ اپنے باپ سے کرتی اور اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی لیکن وہ بھی تو ناانصافی تھی۔ میں اسے سمجھاتا کہ میں اسے کوئی خوشی نہیں دیتا اور بیماری کی عدم موجودگی کو صحت نہیں کہتے۔ نہ اس میں مجھے چھوڑنے کی ہمت تھی نہ مجھ میں بھاگ جانے کا حوصلہ اس لئے ہم ان دو پرندوں کی طرح تھے جو اپنی مرضی سے پنجرے میں قید تھے۔ دروازہ کھلا تھا لیکن ہم پھر بھی محصور تھے۔ ظلم یہ کہ ہم کسی پر الزام بھی تو نہ دھر سکتے تھے اور پھر الزام تراشی سے ملتا بھی کیا۔

ہم برسوں اپنی تنہائیوں کے صحرا میں پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہمارے بستر پر

گیکٹس اُگ آئے تھے اور ہم علیحدہ علیحدہ خواب گاہوں میں سونے لگے۔ میرے شہوانی جذبات آہستہ آہستہ کم ہوتے گئے اور صرف کرسمس یا ایسٹر پر ہمبستری کرتے جیسے تشنج زدہ رشتہ دار عید بقر عید پر گلے ملتے ہیں۔ مجھے ان لمحوں میں احساس ہوتا رہا کہ زندگی میں ہیلو کہنا کتنا آسان ہے اور الوداع کہنا کتنا مشکل۔ رشتہ جوڑنا آسان ہے رشتہ توڑنا مشکل لیکن وہ تو برسوں پہلے کی بات ہے۔ اب تو میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ آپ کو الوداع کہنے آیا ہوں لیکن پھر بھی یہ کڑوا گھونٹ پینا مشکل ہے اسی لئے میں اتنی باتیں کر رہا ہوں۔ ویسے تو میں کسی لمحے بھی اٹھ کر رخصت حاصل کر سکتا ہوں لیکن نہیں۔ انسان کو الوداع بھی ڈھنگ سے کرنا چاہئے کیونکہ بعض دفعہ الوداع کا لمحہ ذہنوں کے کینوس پر نقش ہو جاتا ہے اور برسوں یاد رہتا ہے۔

مسئلہ صرف میرا اور میری بیوی کا ہی نہ تھا۔ اس پورے گاؤں کا تھا جس میں میں جوان ہوا تھا۔ میرا گاؤں ایک ایکسٹنڈڈ فیملی (EXTENDED FAMILY) کے جنگل کی طرح تھا جو روایت کے سانپوں سے بھرا پڑا تھا۔ پورے گاؤں کی آبادی پانچ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ آدھا گاؤں مچھلیاں پکڑتا تھا اور آدھا گاؤں ان دو فیکٹریوں میں کام کرتا تھا جن میں ان مچھلیوں کی صفائی ہوتی تھی۔ میری بیوی عورتوں کی فیکٹری میں اور میں مردوں کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اس گاؤں کے ہر شخص کو سارے گاؤں کے راز معلوم تھے۔ سب جانتے تھے کہ کس کا باپ شرابی ہے اور کس کی ماں شترِ بے مہار، کس کا بیٹا رات کو بستر میں پیشاب کرتا ہے اور کس کا چچا پاگل خانے میں داخل ہوا تھا۔ ان حالات میں انسان چاہے بھی تو اپنی زندگی پر پردہ نہ ڈال سکتا تھا۔ ایسے گاؤں میں اخبار کی بھی ضرورت نہ تھی کیوں کہ اہم خبریں سرگوشیوں کی صورت میں خود ہی گاؤں بھر میں پھیل جاتی تھیں۔

میں ایسے ماحول سے گھبراتا تھا بلکہ بعض دفعہ تو مجھے وحشت ہونے لگتی تھی، میں کنویں کا مینڈک تھا اور شاید وہی میرا مقدر تھا۔

اسی لئے میں نے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ میری بیوی اپنی سہیلیوں سے

ملنے جاتی تو میں تہہ خانے میں چلا جاتا اور اپنی تنہائی سے بغلگیر ہو جاتا۔ میرا تنہائی کے لمحوں سے عجیب و غریب رشتہ تھا۔

میں ان سے محبت بھی کرتا تھا اور نفرت بھی

وہ میرے قاتل بھی تھے اور مسیحا بھی

جب میری بیوی چلی جاتی تو میں دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے بیسمنٹ میں چلا جاتا اور عورتوں کی طرح اسکرٹ، بلاؤز، پینٹی ہوز (PENTY HOSE) ہائی ہیل کے جوتے اور سُرخی پوڈر لگا کر آئینے میں دیکھتا اور چند لمحوں کے لئے سکون محسوس کرتا کیوں کہ سکون کے لمحے ہمیشہ عارضی ہوتے ہیں اور زندگی کی بے ثباتی کا ثبوت۔

میں نے وہ کپڑے، وہ جوتے، وہ میک اپ کا سامان کلوزٹ (CLOSET) میں چھپا کر رکھتے تھے اپنے ذاتی کاغذات کے ساتھ۔ میری بیوی کو ان کی بالکل خبر نہ تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے گھر کے تہہ خانے میں اس کی زندگی کا سب سے بڑا راز چھپا ہے۔ ایسا راز جسے نہ وہ جانتی تھی اور نہ ہی شاید جاننا چاہتی تھی۔

میں پہلی دفعہ سائیکالوجسٹ سے ملنے آیا تو بہت مایوس ہوا۔ اس کا رویہ اس موٹر مکینک کی طرح تھا جو گاڑی کو ہتھوڑے مار مار کر یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کس حصے کو مرمت کی ضرورت ہے۔ اس نے مجھ سے سیکڑوں بے وقوفی کے سوال پوچھے اور بیسیوں فارم پُر کرنے کو دئے۔ میں انہیں کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔ میرے خون اور پیشاب کی بھی آزمائش ہوئی ایکسرے بھی لئے گئے اور پھر مجھے کچھ بتائے بغیر گھر بھیج دیا گیا۔ مجھے اپنا بوڑھا باپ یاد آیا جس کے کینسر سے مرنے سے پہلے بیسیوں ٹسٹ ہوئے تھے اور وہ پھر بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے مجھے روح کا کینسر ہو اور ابھی طب نے اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ اس کی تشخیص یا علاج کر سکیں۔

بہرحال ایک مہینے کے بعد کانفرنس بلائی گئی جس میں آپ بھی شامل تھیں، دو

سائیکالوجسٹ بھی اور آپ کا پروفیسر بھی۔ وہ پروفیسر شاید ناکام سرجن تھا کیوں کہ اس کی گفتگو میں ڈکٹیٹرانہ جاہ وجلال تھا۔ وہ تھا تو کافی صاحبِ علم اور تجربہ کار لیکن اس کی باتوں میں نرم گفتاری کی خوشبو نہ تھی۔ یہ تو شکر ہوا کہ اس پروفیسر سے بار بار نہ ملنا پڑا۔ اس پروفیسر نے صاف صاف لفظوں میں مجھے اپنی تشخیص اور علاج بتلائے۔ کہنے لگا "تمہیں ایسی بیماری ہے جس کا نام تو (TRANSEXUALISM) ہے لیکن بد قسمتی سے اس کا SEX سے کوئی تعلق نہیں۔ مسئلہ دراصل GENDER کا ہے لیکن لوگ ابھی تک SEX اور GENDER کا فرق سمجھ نہیں پائے۔ اس بیماری کا مطلب یہ ہے کہ کئی لوگوں کا جسم ایک جنس کا ہوتا ہے لیکن وہ اندر سے دوسری جنس کا محسوس کرتے ہیں اس لئے ساری عمر عجیب عذاب میں زندہ رہتے ہیں۔ مرد خود کو عورت محسوس کرتے ہیں اور عورتیں مرد۔ اور عمر بھر سیکس کی تبدیلی (SEX CHANGE) کے OPERATION کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔

اس نے جب SEX CHANGE کے آپریشن کا نام لیا تو میری آنکھوں میں خوشی اور امید کے سورج طلوع ہونے لگے۔ وہ لمحہ شاید میری زندگی کا حسین ترین لمحہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پروفیسر کہے گا کہ اب ہم تمہارا آپریشن کرا دیں گے اور تم بقیہ زندگی ایک عورت بن کر گزار سکو گے لیکن ان سوچوں کو گرہن لگتے زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ کہنے لگا کہ اگر تم آپریشن کرانا چاہتے ہو تو ہم اس کا انتظام تو نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارا ادارہ ریسرچ کا ہے علاج کا نہیں لیکن ہم اپنے سیکڑوں مریضوں میں سے چند ایک کی سفارش کرتے ہیں اور وہ سفارش صرف ان لوگوں کی ہوتی ہے جو عورت بن کر دو سال ملازمت کر چکے ہوں اور عورتوں کا لباس پہن کر معاشرے میں زندگی بھی گزار چکے ہوں۔

"لیکن ایک مرد کو عورت کی ملازمت کون دے گا جب تک کہ اس کا آپریشن نہ ہو جائے۔" میں نے سوال کیا۔

"خیر میں تفاصیل نہیں جانتا"۔ اس کے لہجے میں عجیب کھردراپن تھا۔

ایسے موقعوں پر جہاں انسان کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہو رہا ہو انسان لہجے کے

اتار چڑھاؤ کو بھی شدت سے محسوس کرتا ہے۔

اس لمحے آپ رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئیں۔ آپ نے حالات بدلتے اور مجھے بیسیوں سوال کرنے کے لئے پر تولتے دیکھا تو فرمایا "میں تفاصیل تمہیں خود سمجھا دوں گی۔"

چند لمحوں کے بعد وہ پروفیسر تو چلا گیا اور میں خلاؤں میں گھورتا رہ گیا۔ اس پروفیسر نے ایک امید کی کرن تو دکھائی تھی لیکن وہ کرن کسی اور کرہ ارض سے آتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک ایسا ٹوٹا ہوا ستارہ تھا جو اندھیروں سے ابھر کر اندھیروں میں ہی ڈوب گیا تھا۔

پھر آپ مجھے اپنے دفتر میں لے گئیں اور بڑی شفقت اور ہمدردی سے سمجھایا کہ وہ پروفیسر بہت سخت گیر اور اکھڑ مزاج کا ہے۔ بہت سے لوگ اس سے نالاں ہیں لیکن چونکہ وہ بہت قابل ہے اس لئے اس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا اور میں سوچنے لگا کہ قابل لوگ اتنے بدمزاج اور خوش مزاج لوگ اتنے سادہ لوح کیوں ہوتے ہیں۔ میں نے اس دن آپ سے ذکر کیا کہ میرا پہلا مسئلہ میری بیوی ہے اسے حقیقتِ حال بتانا میرے بس کی بات نہیں۔ میں تہہ خانے میں چوروں کی طرح چند لمحے عورتوں کے کپڑے پہن کر سکون حاصل کرتا ہوں تو ہفتوں احساسِ جرم میں مبتلا رہتا ہوں۔

آپ نے مشورہ دیا کہ میں اگلی دفعہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر آؤں تاکہ آپ اس سے تفصیلی گفتگو کر سکیں۔

میں سر کھجاتا ہوا گھر چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے زندگی کے چند اہم فیصلے کرنے ہیں یا تو میں احساسِ تنہائی اور احساسِ گناہ کی آگ میں سلگتا رہوں یا اپنی بیوی کے آگے دل کھول کر رکھ دوں

"لیکن اس کا حشر کیا ہو گا" دل کے ایک کونے سے سوال ابھرتا

"جو ہو گا دیکھا جائے گا" دوسرے کونے سے جواب آتا

میں اسی داخلی مکالمے سے سر پٹختا گھر پہنچا۔ میری بیوی حسبِ دستور منتظر تھی۔

مجھ میں اس دن بھی سب کچھ بتانے کا حوصلہ نہ تھا۔

"آخر آج کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"ماہرِ نفسیات نے اگلی دفعہ تمہیں بلایا ہے۔"

"آخر کیا کہنا چاہتا ہے"

"میں نہیں جانتا"۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن ــ میری زبان پر جیسے چھالے پڑ گئے تھے۔

اپنی بیوی کے ساتھ گزارے ہوئے دس سال میری زندگی کے اہم باب تھے اس نے میری بہت سے خوبصورت لوگوں سے ملاقات کرائی تھی اور پھر مجھے اس کا بھانجا یاد آگیا جو اس وقت پانچ سال کا تھا اور بہت کھلنڈرا تھا۔ وہ شاید میری زندگی کی واحد مسکراہٹ تھا۔ وہ مجھ سے ملتا تو میری سوگوار روح میں گدگدی ہوتی اور میرا صدیوں سے مرجھایا ہوا چہرہ انار کے دانے کی طرح کھل اٹھتا۔ وہ شہزادہ اتنا چالاک تھا کہ اسکول سے چھوٹی موٹی پہیلیاں سن کر آتا اور پھر مجھ سے ان کا جواب پوچھتا۔ ایک دن کہنے لگا۔

"انکل WHAT DID THE WALL SAY TO THE CEILING?

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگا۔

SEE YOU IN THE CORNER

اور ہم دونوں ہنس دیے۔ اسے آنکھ مچولی کھیلنے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ جب بھی میرے ساتھ پارک میں کھیلنے جاتا تو کسی جھاڑی یا کسی درخت کے پیچھے چھپ جاتا اور میں اسے تلاش نہ کر پاتا تو وہ بہت خوش ہوتا۔

میری بیوی مجھے اس کے ساتھ کھیلتے دیکھتی تو اس کے دل میں ماں بننے کی خواہش کروٹیں لینے لگتی۔ وہ ایک دفعہ غلطی سے حاملہ ہو بھی گئی تھی لیکن پھر اس کا

خود ہی اسقاط بھی ہو گیا تھا۔ میں اس دن جتنا خوش تھا میری بیوی بھی اتنی ہی افسردہ تھی۔ میں کسی بچے یا بچی کو اس دنیا میں لانے کا خواہش مند نہ تھا۔ میری صلیب پہلے سے ہی بہت بھاری تھی۔ میری بیوی ایسی باتیں سنتی تو سمجھتی کہ میں اسے نا اہل ماں سمجھتا ہوں۔ میں نے جتنی تردید کرنے کی کوشش کی اس کے دل میں وہ خیال اتنا ہی جڑ پکڑتا گیا۔ آخر میں نے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کرنا ہی چھوڑ دیا۔

مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ میری بیوی کے لئے یہ حقیقت جاننا کہ میں ایک عورت ہوں آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے سے کم نہ ہوگا۔ لیکن پھر میں سوچتا کہ نئی بستی تعمیر کرنے کے لئے پرانی بستی تباہ کرنی ہی پڑتی ہے اور محل بنانے کے لئے جھونپڑے کو گرانا ہی پڑتا ہے۔

لیکن میں بھی کتنا سادہ تھا۔ نہ جانے کتنی پرانی بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں لیکن نئی بستیاں نہیں بن پاتیں۔ جھونپڑے گر جاتے ہیں، لوگ بے گھر ہو جاتے ہیں لیکن محل نہیں بن پاتے۔ میری بیوی کا آپ سے ملنا میری زندگی کا ایک موڑ تھا جس کے بعد میری زندگی کی گاڑی جو کچے راستے پر ہچکولے کھاتی جا رہی تھی بالکل پٹڑی سے ہی اتر گئی۔ اس میں قصور نہ آپ کا تھا، نہ اس کا نہ میرا۔ ایسے حالات میں الزام حالات پر دھرنا ہی دانش مندی کی دلیل سمجھا جاتا ہے لیکن دانشمند یہ بھی جانتے ہیں کہ حالات ہمارے ہی بوتے ہوئے بیج ہیں جن کی فصلیں کاٹتے ہم بہت گھبراتے ہیں۔

میری بیوی آئی اور آپ نے اسے میرے سامنے بتایا کہ وہ مرد جس سے اس نے مرد سمجھ کر شادی کی تھی درپردہ عورت ہے اور ایسے شخص کو ہم نفسیات کی زبان میں TRANSEXUAL کہتے ہیں۔

پہلے میری بیوی نے آپ کو دیکھا، پھر مجھے، پھر آپ کو، پھر مجھے۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا لیکن جب آپ نے بتایا کہ اس کے تہہ خانے کی ایک الماری اس کی گواہ ہے۔ جب آپ نے اس کا بھی ذکر کیا کہ میں برسوں سے تہہ خانے میں اتر کر اور اسکرٹ بلاوز، اونچی ہیل کی جوتی اور میک اپ پہن کر سکون کے چند لمحے حاصل کرنے

کی کوشش کرتا رہا ہوں تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور آتش فشاں پھٹ پڑا۔ جذبات کا لاوا چاروں طرف بہنے لگا۔ ان جذبات میں غصہ اور نفرت زیادہ تھی ہمدردی کم۔ وہ مجھ سے کہنے لگی۔ "تم ذلیل ہو، کمینے ہو، بے غیرت ہو۔ تم نے مجھے ہمیشہ دھوکے میں رکھا۔ تم میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہو۔ تم برسوں جھوٹ بولتے آئے ہو۔ تم نے مجھے ہمیشہ اندھیرے میں رکھا ہے۔"

وہ اتنے غصے میں تھی کہ پنجرے میں بند شیرنی کی طرح کمرے میں تیز تیز چلنے لگی۔ اگر اجازت ہو تو میں بھی ذرا چہل قدمی کر لوں۔ چلتے ہوئے باتوں اور خیالات میں ایک خاص قسم کا تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔

انٹرویو کے آخر میں میری بیوی نے فیصلہ سنا دیا کہ وہ مجھے گھر نہیں لے جائے گی۔ میرے پاس کوئی اور جگہ جانے کی نہ تھی چنانچہ آپ نے مجھے چند دنوں کے لئے ہسپتال میں داخل کر لیا۔ آپ نے جب میری بیوی سے دوبارہ آنے کی درخواست کی تھی تو وہ غصے میں دروازہ دھڑام سے بند کرتے ہوئے چلی گئی تھی۔

وہ بہت بھاری پتھر تھا جسے آپ نے اٹھانے کی ہمت کی تھی۔ میں تو اسے چھو کر ہی چھوڑ دیتا تھا۔

بظاہر یوں لگتا تھا کہ حالات بدتر ہو گئے تھے لیکن مجھے امید تھی کہ در پردہ حالات بہتر ہو جائیں گے لیکن بعض دفعہ حالات اتنے ہی خراب ہوتے ہیں جتنے کہ لگتے ہیں لیکن ہم انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ امید ہماری آنکھوں کو خیرہ کئے رہتی ہے۔

میرا چند دنوں کے لئے ہسپتال میں داخل ہونا بھی میری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا۔

میں نہیں جانتا کہ آپ کو یہ سب باتیں یاد ہیں کہ نہیں۔ شاید آپ کے حافظے میں محفوظ نہ رہی ہوں۔ ویسے ان واقعات کو بھی تو برسوں بیت گئے ہیں لیکن وہ سب باتیں میرے دل پر آج تک نقش ہیں اور میں آخری بار آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔

ویسے ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد مجھ پر جو بیتی اور جن جن مریضوں اور مریضاؤں سے ملاقات ہوئی اس کی شاید آپ کو خبر نہ ہو۔ آپ تو دن میں دو گھنٹوں کے لئے آتی تھیں لیکن میں وہاں ۲۴ گھنٹے رہتا تھا۔

میری جب آپ سے اگلی ملاقات ہوئی تو آپ نے دو مشورے دیئے۔ پہلا مشورہ یہ تھا کہ میں عورتوں کی پلز (PILLS) کھانی شروع کر دوں کیونکہ ان میں نسوانی ہارمونز (HARMONES) ہوتے ہیں۔ آپ نے مجھے سمجھایا کہ ان سے میری جلد اور میرے بال بدلنے میرے پستان بڑھنے اور ٹیسٹیکلز (TESTICLES) گھٹنے شروع ہو جائیں گے۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے اسی دن سے پلز کھانی شروع کر دی۔

آپ کا دوسرا مشورہ تھا گروپ تھیراپی میں شمولیت کا۔ میں اس کے لئے ہچکچایا تھا۔ مجھے سمجھ نہ آیا تھا کہ چند مریض مل کر ایک دوسرے کی کیسے مدد کر سکتے ہیں لیکن جب آپ نے چند مہینے آزمانے کو کہا تو میں راضی ہو گیا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی کافی ہوتا ہے۔

اس گروپ میں میری ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جو میرے احاطۂ عقل سے بہت باہر رہتے تھے۔

چند دنوں کے بعد جب میری بیوی دوبارہ آئی تو غصے نے سنجیدگی کا روپ دھار لیا تھا اور وہ کاغذ پر بہت سے سوال لکھ کر لائی تھی۔ اس دن میں آپ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ مجھے اس دن اندازہ ہوا تھا کہ آپ ایک اچھی تھیراپسٹ ہی نہیں ایک اچھی معلمہ بھی ہیں۔ آپ نے بلیک بورڈ پر میری بیوی کو جو باتیں سمجھائی تھیں وہ مجھے آج تک یاد ہیں۔

آپ نے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ انسان کی جنسی زندگی بہت پیچیدہ ہوتی ہے اور بہت سے مراحل سے گزرتی ہے۔ اگر کوئی شخص چند بنیادی باتوں سے واقف نہ ہو تو وہ جنسی زندگی کی نشوونما کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتا ہے۔

پھر آپ نے اس ارتقا کے مختلف مدارج کی تشریح کی تھی۔

آپ نے سمجھایا تھا کہ کسی بچے کا لڑکی یا لڑکا ہونا اس کی جینز (GENES) پر منحصر ہوتا ہے جو اس کے کروموسومز (CHROMOSOMES) کا حصہ ہوتی ہیں۔ عورتوں میں دو ایکس (XX) اور مردوں میں ایک ایکس اور ایک وائی (XY) کروموسومز ہوتے ہیں۔ اس پہلے مرحلے پر ہم اسے (GENETIC SEX) کہتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ بچوں کے جنسی اعضا کی نشوونما کا ہوتا ہے جسے ہم (ANATOMIC SEX) کہتے ہیں۔ لڑکیوں میں OVARIES اور UTERUS اور لڑکوں میں PENIS اور TESTICLES تشکیل پاتے ہیں۔ اس دن مجھے بھی پہلی دفعہ پتہ چلا تھا کہ سب FOETUS بنیادی طور پر مادہ ہوتے ہیں لیکن وہ FETUS جو Y کروموسوم سے متاثر ہوتے ہیں وہ آہستہ آہستہ نر کا روپ دھار لیتے ہیں اور لڑکے بن کر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اس تبدیلی میں نقص رہ جائے تو پھر HERMAPHRODITE جنم لیتے ہیں جن میں نر اور مادہ آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ شاید انہی لوگوں کو لوگ ہیجڑا کہہ کر بلاتے ہیں۔

تیسرے مرحلے سے بچہ تین اور پانچ سال کی عمر کے دوران گزرتا ہے اس وقت بچے کو یہ شعور ہونے لگتا ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی اور اس کی عادات و اطوار، اس کے شوق، پسند و ناپسند میں اس کا عکس نظر آنے لگتا ہے۔ یہ وہ موڑ ہوتا ہے جہاں سے مردانگی اور نسوانیت کا احساس شروع ہوتا ہے۔ یہ شناخت کا مرحلہ GENDER IDENTITY) کہلاتا ہے۔ اور یہی شناخت کا مرحلہ تھا جو میرے مسائل کی بنیاد تھا۔ اگر کسی انسان کا جسم لڑکوں کا ہو اور وہ خود کو لڑکی محسوس کرے یا جسم لڑکی کا ہو اور وہ لڑکا محسوس کرے تو ہم اسے TRANSEXUAL کہتے ہیں۔

چوتھا مرحلہ جنسی کشش کا ہوتا ہے جو بلوغت کی عمر تک پرورش پاتا رہتا ہے اور SEXUAL ORIENTATION کہلاتا ہے۔ اکثر نوجوان مخالف جنس کو پرکشش پاتے ہیں اور HETEROSEXUAL کہلاتے ہیں۔ لیکن بعض نوجوان اپنی ہی جنس کے افراد کو ترجیح دیتے ہیں اور HOMOSEXUAL کہلاتے ہیں۔ یہ مسئلہ TRANSEXUAL

سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ایک TRANSEXUAL کا اپنے آپ کو عورت سمجھ کر دوسرے مرد کو پسند کرنا ایک HOMOSEXUAL کے دوسرے مرد کو پسند کرنے سے بالکل مختلف جذبہ ہوتا ہے۔

پانچواں مرحلہ SEXUAL PERFORMANCE کا ہوتا ہے۔ اگر مرد جنسی عمل میں ناکام رہے تو ہم اسے IMPOTENT کہتے ہیں اور اگر عورت ناکام رہے تو FRIGID کہلاتی ہے۔

میری بیوی بیسیوں سوال پوچھتی رہی۔ آپ تحمل سے جواب دیتی رہیں اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔

آپ نے یہ بھی بتایا کہ ایک گروہ TRANSVESTITES کا ہوتا ہے جو جنس بدلنا تو نہیں چاہتا لیکن کبھی کبھار چند گھنٹوں کے لئے جنسِ مخالف کے کپڑے پہننا چاہتا ہے تاکہ جنسی لذّت حاصل کر سکے۔ یہ گروہ بھی TRANSEXUAL سے مختلف ہوتا ہے کیوں کہ TRANSEXUALS جنسِ مخالف کے کپڑے پہن کر جنسی حظ محسوس نہیں کرتے اور وہ چند گھنٹوں کے بجائے عمر بھر کے لئے وہ کپڑے پہننا چاہتے ہیں۔

مجھے اس دن پتہ چلا کہ میری بیوی مدتوں سے یہ سوچ رہی تھی کہ میں اس کے ساتھ اس لئے نہیں سوتا کہ وہ موٹی ہے اور ORAL SEX پسند نہیں کرتی ـــ میں نے سوچا انسان اپنے ضمیر اور دل پر کتنے بوجھ اٹھائے پھرتا ہے۔ آپ کی گفتگو سے اس کی روح کے بہت سے کانٹے نکل گئے اور غلط فہمیوں کی دھند چھٹ گئی۔

میری بیوی نے آپ کا شکریہ تو ادا کیا لیکن یہ فیصلہ بھی صادر کر دیا کہ اس دن کے بعد وہ میرے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہے گی۔ میں بھی اس لمحے کا برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک تکلیف دہ لمحہ تھا اور انتظار کسی لمحے کی تکلیف کو کم تو نہیں کرتا۔

انٹرویو کے بعد میری بیوی رخصت ہو گئی۔ وہ نہ تو گلے ملی اور نہ ہی اس نے الوداعی بوسہ دیا۔ بس نظریں جھکائے کمرے سے نکل گئی اور میں چند دن اور ہسپتال کی

قید میں پڑا رہا۔

اس شام میں ہسپتال میں ایک لمبی سیر کے لئے نکلا تھا تاکہ اپنے غم غلط کر سکوں میرا ذہن آوارہ بادلوں کی طرح ادھر ادھر پھرتا رہا۔ مجھے آپ کی یہ بات بہت دلچسپ لگی کہ انسانی FOETUS بنیادی طور پر عورت کا ہوتا ہے جب وہ Y کروموسوم سے متاثر ہوتا ہے تو مرد کا روپ دھارنا شروع کر دیتا ہے اور اگر متاثر نہ ہو تو عورت کا ہی رہتا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے یہی حال انسانی تاریخ اور معاشرے کا تھا۔ ایک وہ دور تھا جب ساری دنیا کا نظام MATRIARCHIAL تھا۔ انسان دیویوں کی پوجا کرتے تھے، ماں کا تصور سب سے مقدم تھا۔ لوگ اپنی زبان کو مادری زبان اور اپنے علاقے کو مادرِ وطن کہہ کر پکارتے تھے۔ بچے ماں کے نام سے پہچانے جاتے تھے لیکن آہستہ آہستہ نظام بدلتا گیا اور ساری دنیا PATRIARCHIAL بنتی گئی۔ مردوں نے انسانی روایات اور اقدار کو بدلنا شروع کر دیا۔ بچے ماں کی بجائے باپ کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ GODDESSES کے مہربان ماؤں کے تصور کو بدل کر GOD کے جابر باپ کے تصور کو عام کیا گیا۔ ایسا خدا جس نے جہنم کے تصوّر کو جنم دیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ یہودی آج بھی اسی بچے کو یہودی سمجھتے ہیں جس کی ماں یہودی ہو اور مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ قیامت کے دن بچے ماں کے نام سے پکارے جائیں گے لیکن اس دنیا میں عورتیں دوسرے درجے کی شہری بن چکی ہیں۔

میرا خیال تھا کہ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا کہ میری روح عورت کی تھی جو Y کروموسوم سے متاثر نہ ہوئی تھی جسم مرد کا بن گیا تھا اور روح عورت کی ہی رہی تھی۔

ہسپتال میں میرے سامنے دو ایسے مسئلے تھے جن کا فوری حل تلاش کرنا ضروری تھا۔ آپ کی مہربانی کہ آپ نے دونوں کا حل تلاش کرنے میں مدد کی۔ جہاں تک ملازمت کا تعلق تھا آپ نے سرٹیفیکیٹ لکھ دیا کہ میں بیمار ہوں۔ آپ نے یہ بھی پوچھا تھا کہ وجہ کیا لکھوں۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر TRANSEXUAL لکھا تو پورے گاؤں کو خبر ہو جائے گی اور میرا جینا حرام ہو جائے گا۔ چنانچہ آپ نے DEPRESSION لکھ دیا۔ وہ تشخیص بے ضرر تھی میرے گاؤں کا ڈاکٹر بھی ایک دفعہ لکھ چکا تھا۔

دوسرا مسئلہ رہائش کا تھا۔ میری بیوی اتنے غصے میں تھی اور میں اتنا دل برداشتہ کہ ہم دونوں ایک چھت تلے جمع نہ ہو سکتے تھے اور کسی اور خاندان کے ساتھ رہنا میرے لئے مناسب نہ تھا۔ آخر آپ کے سوشل ورکر نے مشورہ دیا کہ میں اپنا گاؤں چھوڑ کر ساتھ والے بڑے گاؤں میں منتقل ہو جاؤں۔ اس میں ایک دس منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی جس میں ایک بیسمنٹ اپارٹمنٹ خالی تھا۔ وہ شاید اس علاقے کی سب سے اونچی بلڈنگ تھی کیونکہ ایک دفعہ اخبار میں کسی نے سوال کیا تھا کہ اس پورے علاقے میں کوئی اونچی عمارتوں سے چھلانگ لگا کر خودکشی کیوں نہیں کرتا تو ایک ڈاکٹر نے جواب دیا تھا کہ اس علاقے میں اونچی عمارات ہیں ہی نہیں اس لئے لوگ پانی میں ڈوب مرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ویسے تو اس واقعہ کو کئی سال بیت گئے ہیں لیکن میری نگاہوں میں وہ سب مناظر آج بھی تروتازہ ہیں۔

ہسپتال میں اور گروپ تھیریپی میں میری ملاقات ایسے مردوں اور عورتوں سے ہوئی جو مجھ سے بھی بھاری صلیب اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہے تھے۔

میں نے بیسمنٹ اپارٹمنٹ کرایے پر لے لیا اور معمولی سا فرنیچر خرید کر منتقل ہو گیا۔ وہ میری زندگی کا سب سے اہم موڑ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ موڑ مجھے شہرِ ناامیدی کی تنگ اور تاریک گلیوں سے نکال کر امید کی روشن شاہراہوں پر لے جائے گا۔ لیکن ہوا یوں کہ میری تنہائی کا کرب بڑھنے لگا۔ مجھے اپنی بیوی بہت یاد آتی۔ وہ میری بیوی ہی نہ تھی میری دوست بھی تھی اور اس کی جدائی میرے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ آخر میں نے گھٹنے ٹیک دیئے اور اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا۔ میں اس کی گود میں سر رکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا —— کچھ دیر کے بعد میری بیوی کا بھی دل پسیج گیا اور اس کی تلخی بھی آنسو بن کر ٹپکنے لگی۔ ہم دونوں مل کر کافی دیر تک روتے رہے جیسے اپنے رشتے کی لاش پر ماتم کر رہے ہوں۔

دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو ہم نے بھولی بسری یادوں کے سائے میں شام گزاری۔ میں نے اسے بچپن اور نوجوانی کے بہت سے واقعات سنائے۔ ایسے واقعات جو میں اسے پہلے

سنلتے گھبراتا تھا۔ رشتے ٹوٹ جائیں تو ایک نئی آزادی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس شام ہماری قربتوں اور جدائیوں کے رنگ مٹتے اور نکھرتے رہے۔ اگرچہ اس شام کی تفاصیل دھند میں لپٹی ہوئی ہیں لیکن ایک بات مجھے آج تک یاد ہے۔ میری بیوی کو اس شام اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کے اسقاط میں، جسے وہ ہمیشہ ایک بھیانک خواب سمجھا کرتی تھی، ایک سکون کا پہلو پوشیدہ ہے۔ ہم دونوں کو اندازہ ہوا تھا کہ انسان درحقیقت کتنا سادہ ہے۔ وہ اپنی زندگی کے رازوں سے بھی واقف نہیں۔ وہی چیزیں جنہیں وہ عذابِ جاں سمجھتا رہتا ہے انہی کی کوکھ سے خوشبو کے گلاب بھی جنم لیتے ہیں۔

میں واپس لوٹا تو سبک محسوس کر رہا تھا لیکن تنہائی کی فصیل بلند سے بلند تر ہو گئی تھی۔ ایک قید خانے کا دروازہ دوسرے قید خانے میں کھل گیا تھا۔

میں اگلے چند مہینے گروپ اٹینڈ (ATTEND) کرتا رہا۔ آپ کے گروپ کی دنیا ہی علیحدہ تھی۔ اس کے بارے میں میرے سب خدشات بے بنیاد نکلے۔ میں نے اس گروپ میں انسانی معجزے رونما ہوتے دیکھے۔ نہ تو لوگ اپنے زخموں سے پردہ اٹھاتے شرماتے تھے اور نہ ہی دوسرے لوگ ان پر مرہم رکھتے ہچکچاتے تھے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ دوسروں کے غموں کو دور کرنے کی کوشش میں انسان اپنے غم بھول جاتا ہے۔ شاید لوگ اسی لئے ماہرِ نفسیات ہوتے ہوں کہ ان کے اپنے دکھ اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ وہ عمر بھر دوسروں کے دکھوں میں پناہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔

آپ کہتی ہوں گی کہ میں نے طنزیہ لہجہ اپنا لیا ہے۔ طنز کا خندہ زہر خند ہوتا ہے اسی لئے طنز اپنا کام کر جاتا ہے جو مزاح کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔

مجھے گروپ میں چند مہینے کی شمولیت سے اس گاؤں کی یاد آ گئی تھی جس میں آگ لگ گئی تھی۔ سب لوگ گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ صرف ایک لنگڑا اور ایک اندھا شخص باقی رہ گیا تھا۔ جب سب جا چکے تو لنگڑے نے اندھے سے کہا۔ "آخر تم مجھے اپنے کندھوں پر بٹھا لو تو ہم دونوں گاؤں سے بھاگنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں تمہاری آنکھیں بن جاؤں گا، تم میرے پاؤں۔"

وہ مریض بھی اپنی جلتی زندگیوں سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ ایک مریض کے مسائل دوسرے کی آنکھیں بن گئے تھے۔

میں پہلے کئی ہفتے تو دوسروں کے مسائل سنتا رہا۔ انہوں نے جب بھی مجھے دعوت دی میں نے اس بچے کی طرح محسوس کیا جو دریا کے اتھلے حصے میں تو کھڑا ہو سکتا ہو لیکن گہرے پانی میں کودنے سے گھبراتا ہو۔ اگرچہ آپ سب نے میری حوصلہ افزائی کی اور یقین دلایا کہ آپ کے پاس لائف جیکٹ (LIFE JACKET) ہے۔ اگر میں ڈوبنے لگوں گا تو آپ مجھے بچالیں گے، لیکن مجھے آپ لوگوں پر اعتماد نہ تھا۔ عین ممکن ہے کہ مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہ ہو۔ اسی لئے میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھ رہا تھا لیکن جوں جوں میں دوسروں کے اندر کی آگ محسوس کرنے لگا میرے اندر کی برف بھی پگھلنے لگی۔

سب سے پہلے میں نے اس کالی عورت کی داستان سنی جو ایک کالے مرد کے ساتھ رہتی تھی اور تین بچوں کی ماں تھی۔ پندرہ سال کی ازدواجی زندگی میں اس نے اپنی انا پر نہ جانے کتنے زخم اور چرکے سہے تھے۔ اس کا خاوند اتنا جابر تھا کہ اگر وہ رات دو بجے بھی آتا اور اس کی بیوی کھانا گرم کرنے میں دیر کرتی تو وہ سیخ پا ہو جاتا۔ وہ اتنا شور مچاتا کہ کئی دفعہ بچے جاگ جاتے۔ ایک دو دفعہ تو اس نے میز سے پلیٹیں اٹھا کر دیوار پر دے ماری تھیں۔

وہ عورت ہمیشہ سہمی سہمی رہتی۔ اسے خبر نہ تھی کہ اس کا شوہر کس بات پر خفا ہو جائے گا۔ بچے بھی باپ سے خائف رہتے۔ سب لوگ اسے BULL IN A CHINA SHOP کہہ کر پکارا کرتے اور وہ اس پر فخر کرتا۔

پندرہ سال کے بعد اسے ایک گوری عورت مل گئی جو اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ اس کالی عورت پر اس شام قیامت ٹوٹی جس شام اسے احساس ہوا کہ وہ نہ صرف اس گوری عورت کو پسند کرتی ہے بلکہ اسے جنسی طور پر پرکشش بھی پاتی ہے۔ وہ گوری عورت بھی شادی شدہ تھی اور اپنے دو بچوں اور خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک دو عورتوں کے ساتھ جنسی طور پر ملوث ہو چکی تھی لیکن اس کالی عورت

کے تعلقات میں جو شدت تھی وہ اس نے پہلے محسوس نہ کی تھی۔ وہ آگ جو برسوں راکھ تلے سلگتی رہی تھی آخر کار بھڑک اٹھی تھی۔ کالی عورت کے لئے یہ جاننا کہ وہ لیسبیئن (LESBIAN) ہے ایک نئے خدا پر ایمان لانے کے طرح تھا۔ وہ ہفتوں بلکہ مہینوں اپنے جذبات کو دبانے یا چھپانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ہمارے جذبات اپنا علیحدہ ذہن رکھتے ہیں اور خود مختار ہوتے ہیں۔ ہماری عقل چاہے جتنے دلائل پیش کرے وہ نہیں مانتے۔ عقل کو جلد یا بدیر جذبات کے آگے گھٹنے ٹیکنے ہی پڑتے ہیں۔ آخر ان دو چاہنے والیوں نے اپنے شوہروں کو الوداع کہا اور پانچ بچوں کو لے کر اکٹھے رہنے لگیں۔

اس شام میرے دشتِ حیرت میں چند درخت ابھر آئے جن کے سائے میں میں کافی دیر تک سکون سے لیٹا رہا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی زندہ ہیں جن کے مسائل مجھ سے بھی زیادہ گنجلک ہیں۔ میں ان دونوں عورتوں کی بہادری پر رشک کرتا رہا بلکہ ان سے ہمت مستعار لیتا رہا۔ شاید یہ اسی مستعار ہمت کا فیضان تھا کہ میں نے اگلے گروپ میں اپنی روح کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا اور اپنے ماضی سے پردے اٹھانے شروع کر دیئے۔

وہی ماضی — جو ہمارے حال کے چاند پر بادلوں کی طرح چھایا رہتا ہے۔

وہی ماضی — جو ہمارے پاؤں کی بیڑیاں بن جاتا ہے۔

وہی ماضی۔ جس کے ناخنوں سے ہم حال اور مستقبل کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس جدوجہد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات تو گتھیاں نہیں سلجھتیں انگلیاں ضرور لہولہان ہو جاتی ہیں۔

گروپ کے دوستوں کو میں نے اپنے بچپن کی باتیں سنائیں۔ ان کھلونوں کی باتیں جو مٹی کے تھے۔ شاید اسی لئے زندگی کی تیز ہواؤں کو برداشت نہ کر سکے اور ٹوٹ گئے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ سب بچوں کے کھلونے مٹی کے ہوتے ہوں کہ لیکن اب تو بچوں

کے کھلونے اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ انسان بڑھاپے میں بھی ان کے ساتھ کھیل سکتا ہے۔

میں نے گروپ کے ساتھیوں کے سامنے اپنے خاندان کو بھی ننگا کر دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے جس گھرانے میں پرورش پائی تھی اس پر میرے والد کا آسیب چھایا رہتا ہے ۔ میرے والد ۔ جو ایک پولس افسر تھے ۔ ان کی نگاہ میں بچوں کو بس دیکھنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا بات کرنے کے لئے نہیں۔ اگر کوئی بچہ رو رہا ہوتا تو وہ ایسے چیختے جیسے جنگل میں شیر دھاڑتا ہے اور ہم سب معصوم خرگوشوں اور پرندوں کی طرح سہم جاتے تھے۔

ان کے مقابلے میں میری والدہ بہت مہربان تھیں۔ جب والد چیختے چنگھاڑتے تو وہ اپنا دامن وا کر دیتیں اور ہم سب بچے ان کی آغوش میں سر چھپا لیتے۔ وہ ہمیں سہارا تو دیتیں لیکن والد کے خلاف کچھ نہ کہتیں۔ وہ سارے ظلم ساری عمر مسکراتے ہوئے برداشت کرتی رہیں۔

بچوں میں سب سے بڑا میرا بھائی تھا۔ پھر میری بہن۔ میں سب سے چھوٹا تھا میرے باپ اور بھائی میں ہمیشہ ٹھنی رہتی۔ میرا بھائی بغاوت کرتا تو والد اسے کچلنے کی کوشش کرتے۔ ایک دو دفعہ تو میرے والد نے میرے بھائی کو غصے میں ایسا دھکا دیا کہ اس کا سر دیوار سے جا ٹکرایا اور اس سے خون بہنے لگا۔

میں ایسے موقعوں پر سہم جایا کرتا تھا اور اپنے والد سے خوفزدہ رہتا تھا۔

میرے گھر میں میری بہن میری سہیلی تھی۔ میں اس کے کپڑے بڑے شوق سے پہنتا تھا اور ایک دن اس کی طرح بننا چاہتا تھا۔

میں شاید پانچ چھ سال کا ہوں گا کہ مجھے احساس ہوا تھا کہ میرا جسم تو لڑکوں کا تھا لیکن میں اندر سے لڑکی تھا۔ میں اپنی "تو تو" دیکھ کر بہت حیران ہوتا۔ میں بچپن میں اپنے PENIS کو "تو تو" کہا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دن جب میں نے اپنی والدہ سے کہا تھا " اماں! اگر میری "تو تو" نہ ہوتی تو میں لڑکی لگتا۔" وہ بہت برہم ہوئی تھیں اور مجھے ایسی باتیں کرنے سے منع کیا تھا لیکن اس سے میرے جذبات نہیں بدلے تھے۔

میں دل میں محسوس کرتا تھا کہ میں اپنی بہن کی طرح ہوں اپنے بھائی کی طرح نہیں۔
مجھے ٹرکوں اور ٹرینوں سے کھیلنے کے بجائے گڑیوں سے کھیلنے کا زیادہ شوق تھا۔
میں دن رات بے کل رہتا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آتا کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا ہو رہا ہے۔ آخر ایک دن میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس میں مجھے دو تصویریں نظر آئیں۔ ایک عورت کی تھی اور ایک مرد کی اور نیچے لکھا تھا کہ یہ عورت مرد تھی لیکن اب آپریشن کرا کر عورت بن گئی ہے۔ میں نے وہ تصویریں کاٹ لیں اور اپنے کمرے کی میز کی دراز میں سنبھال کر رکھ لیں۔ میرے دل میں گدگدی ہوئی کہ ایک دن میں بھی عورت کی طرح زندگی گزار سکوں گا۔ میں شاید اس وقت دس سال کا تھا۔ وہ شام میری زندگی کی اہم شام تھی۔ میں اس رات بڑے سکون سے سویا تھا۔

لیکن میں کتنا نادان تھا۔ آخر ایک بچہ تھا۔ بچوں کے ذہنوں میں کتنے خواب ہوتے ہیں جو ہمیشہ خواب ہی رہتے ہیں۔ تعبیروں کا لبادہ نہیں اوڑھ سکتے۔ کتنی آرزوئیں ہوتی ہیں جو دربدر بھٹکتی رہتی ہیں، کتنی تمنائیں ہوتی ہیں جو دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر خودکشی کر لیتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے اپنی شناخت بدلنی چاہی، اپنی ذات بدلنی چاہی لیکن لوگوں نے میری راہ میں کانٹے بچھا دئے۔ میں اپنے آپ کو DEFINE نہیں کر سکتا تھا۔ لوگ مجھے DEFINE کر رہے تھے۔ میں جب بھی کہتا کہ میں عورت ہوں تو وہ میرا مذاق اڑاتے، مجھے پاگل سمجھتے اور سچی بات یہ ہے کہ پاگل پن کے خوف نے ہی مجھے پاگل کر دیا تھا۔

اسکول اور کالج کے زمانے میں بھی میں خاموشی کی چادر اوڑھے پھرتا رہتا تھا۔ میرے دوست، میرے ہم جماعت لڑکیوں کی باتیں کرتے، ان کا مذاق اڑاتے تو میرے خون میں ابال آنے لگتا۔ مجھے یہ محسوس ہوتا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ میں نے آہستہ آہستہ ان دوستوں سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن وہ پھر بھی نہ مانے۔ جب انہوں نے مجھے کبھی بھی عورتوں میں دلچسپی کا اظہار نہ کرتے دیکھا تو سمجھنے لگے کہ میں ہوموسیکشول (HOMOSEXUAL) ہوں۔

ایک دن میں گھر جا رہا تھا کہ اسکول کی گلی کی نکڑ پر چند اسکول کے بدمعاش لڑکے کھڑے تھے۔ میں قریب سے گزرا تو انہوں نے فقرے کسے۔ "یہ گے (GAY) ہے۔" فیگٹ (FAGGOT) کہیں کا" "مجھے تو کیور (QUEER) لگتا ہے۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ سارے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور میں ان کی طرف لپکا۔ باقی لڑکے تو بھاگ گئے لیکن ایک میرے قابو میں آگیا۔ میں نے اس پر تھپڑوں، مکوں اور ٹھڈوں کی بارش کر دی۔ مجھے ہوش اسوقت آیا جب اس کے سر سے خون کی لکیر اس کے چہرے تک آگئی۔ میں نے اسے دور دھکا دیا اور خاموشی سے گھر کی طرف چل دیا۔

اس واقعہ کے بعد کسی نے بھی اسکول میں نہ چھیڑا بلکہ لڑکے راستہ کترا کر گزر جاتے۔

لیکن میں اپنے آپ سے گھبرا گیا تھا۔ میں اپنے اندر نفرتوں کے بہتے ہوئے لاوے سے ڈر گیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد میں نے غصہ سے توبہ کر لی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس قسم کا حادثہ دوبارہ پیش آیا تو یا تو میرا مدِمقابل قتل ہو جائے گا یا میں جیل کی کوٹھری میں پہنچ جاؤں گا۔ قیدِ تنہائی تو میں ویسے ہی گزار رہا تھا۔ قیدِ بامشقت کی کوئی خواہش نہ تھی۔

میں گروپ میں اپنا حال سناتا چلا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ اپنی بپتا سنا چکا تو قدرے سبک محسوس کرنے لگا۔ گروپ کے لوگ میری باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اجنبیوں کے سامنے اپنی داستانِ حیات سنائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے لیکن انہوں نے میرے سامنے ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا بلکہ دو ممبروں نے تو گروپ کے بعد مجھے گلے سے لگا لیا۔

میں نے سوچا ہم لوگوں سے خواہ مخواہ گھبراتے ہیں۔ نجانے کتنے اجنبی اور بیگانے ایسے ہیں جو ہمارے دوست بن سکتے ہیں لیکن ہم انہیں کبھی قریب آنے کا موقع ہی نہیں

دیتے۔

میں اپنی کہانی سُنا چکا تو گروپ کا ایک نوجوان آگے بڑھا۔ شاید میری باتیں سن کر اسے بھی اپنی روح کو ننگا کرنے کا حوصلہ ہوا تھا کیوں کہ اس دن تک وہ اپنے جسم کو ہی جا بے جا ننگا کرتا رہا تھا اور اس سلسلے میں گرفتار بھی ہو چکا تھا۔ اس کے بارے میں مختلف مواقع پر مختلف عورتوں نے پولس کو فون کیا تھا اور ایک دن پولس نے اسے بغیر پتلون کے پکڑ لیا تھا۔ وہ بتانے لگا کہ پارکنگ لاٹ میں جا کر کار پارک کر دیا کرتا تھا اور پھر اپنی پتلون اتار کر گاڑی میں بیٹھ جایا کرتا تھا۔ کئی دفعہ عورتیں جب اپنی کاروں میں واپس لوٹتیں تو اسے ننگا دیکھتیں۔ اس کے بعد وہ بھی گاڑی چلانے لگتا اور وہ عورتیں بھی گھبرا کر چل دیتیں۔ آخر بعض عورتوں نے اس کی کار کا نمبر نوٹ کر لیا اور پولس میں رپورٹ لکھوا دی۔

میری کبھی ایسے شخص سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لئے میں متجسّس تھا۔ میں نے اس کے ماضی میں جھانکنا چاہا تو وہ کہنے لگا کہ جس طرح تم نے کھل کر بات کی ہے میں بھی کھل کر بات کروں گا۔ پھر وہ یادوں کی بیساکھیوں پہ چلتا ہوا اس دور میں پہنچ گیا جب وہ ایک ٹین ایجر (TEENAGER) تھا اور موسیقی کا شیدائی تھا۔ وہ ان دنوں دوستوں کے ساتھ مل کر گانے لکھا کرتا تھا اور پھر انہیں گٹار پر بجایا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے والدین کے گھر کے بیسمنٹ میں رہا کرتا تھا۔

ایک رات وہ تین بجے تک ایک گانے پر محنت کرتا رہا لیکن بات نہ بنی۔ وہ اپنے گانوں میں نئی روح پھونکنا چاہتا تھا لیکن کامیاب نہ ہو پایا تھا۔ اچانک اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کئے اور جب سب کپڑے اتار چکا تو گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ اس رات، رات کے تاریک جنگل میں کھو جانا چاہتا تھا۔ چاروں طرف اتنی تاریکی تھی کہ اسے اپنا سایہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ وہ مختلف گلیوں اور بازاروں میں گھومتا، بلڈنگوں کے گرد چکر لگاتا ایک گھنٹے کے بعد واپس آ گیا۔ اس کا سراپا پسینے میں شرابور تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے زندگی میں پہلی دفعہ کسی سوئے

ہوئے مگرمچھ کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کا نوالہ نکال لیا ہو۔ شہر میں اسے کسی نے نہ دیکھا تھا حتیٰ کہ اس کے والدین کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی۔ اس رات کے بعد اس کا حوصلہ اتنا بڑھا کہ وہ مہینے میں ایک دفعہ رات کی تاریکی میں اتر جاتا۔ اکثر اوقات وہ مہینے کی تاریک ترین رات کا انتظار کرتا۔

چند مہینوں کے بعد اس کی ہمت اتنی بڑھی کہ اس نے اپنے دوستوں کو بھی مشورہ دیا اور وہ بھی دن کی روشنی میں۔ اس دن وہ سب چرس پیئے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کپڑے اتار کر بلڈنگ کے گرد ایک چکر لگایا۔ اتفاقاً انہیں ایک بوڑھی عورت نے دیکھ لیا۔ اس کے دوست تو بہت گھبرائے اور توبہ کی لیکن وہ جس راستے پر چل پڑا تھا وہاں سے واپس لوٹنا مشکل تھا۔

لیکن زندگی کے کئی راستوں کی طرح وہ راستے ایسی منزلوں پر جا نکلے جو بیک وقت خوف اور لذت کی علامت تھے۔ اسے شاید DANGEROUS LIVING کا شوق تھا۔ آخر وہ اس دشتِ حیرت میں پہنچ گیا جہاں واپس مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جایا کرتے ہیں۔ وہ خود اس طرزِ زندگی سے بیزار تھا لیکن بے بس بھی محسوس کرتا تھا۔ آخر جس دن پولیس نے اسے گرفتار کر کے جیل کی کوٹھڑی میں بند کیا اس دن اس نے سکھ کا سانس لیا۔ اب وہ خلوصِ دل سے اپنی زندگی کو بدلنے کا فیصلہ کر سکتا تھا۔

میں اس دن واپس لوٹا تو رات بھر سوچتا رہا کہ میں کتنا سادہ ہوں، کتنا کم علم ہوں۔ زندگی کے نجانے کتنے ایسے رخ ہیں، ایسی گلیاں ہیں، ایسے راستے ہیں، ایسی شاہراہیں ہیں، ایسے راز ہیں جن سے میں ناواقف ہوں۔ مجھے اس دن ایسا لگا جیسے زندگی کی سطح کے نیچے بیسیوں تاریک جہاں آباد ہیں۔ میں تو صرف ایک ہی شہرِ گمنام میں بھٹکتے ہوئے گھبرا گیا تھا۔ لوگ نہ جانے کن کن آسیب زدہ شہروں سے ہو کر آئے تھے اور پھر یا تو جیل خانوں میں یا پاگل خانوں میں بند کر دیے گئے تھے۔

گروپ میں شامل ہو کر مجھے کچھ سکون ہوا تو لیکن میرے مسائل میں کمی نہ آئی۔ میں اور میری بیوی اجنبیت کی دیواروں کو چاٹتے رہے۔ ایک دن کہنے لگی کہ لوگ

سیکڑوں سوال پوچھتے ہیں۔ میں انہیں بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں لیکن تمہارا نام آتا ہے تو میری زبان گنگ ہوجاتی ہے۔ ہمارے راز مشترک ہیں۔ جب دو لوگ زندگی کا ایک حصہ اکٹھے گزارتے ہیں تو اس کی حیثیت جوائنٹ بینک اکاونٹ (JOINT BANK ACCOUNT) کی ہوجاتی ہے ۔۔ ایک شخص کی غیر موجودگی میں ساری گفتگو لنگڑی ہوجاتی ہے۔

مجھے لگتا کہ وہی عورت جو برسوں میری شریکِ حیات تھی اب مجھ سے ہاتھ ملانے کو بھی تیار نہ تھی۔ میری بیوی، بیوی کم اور ہمسائی زیادہ لگتی تھی۔ میرے سینے میں بھی ایک دھڑکتے ہوئے دل کی جگہ ایک برف کا تودہ رکھا تھا۔ آخر مجھ سے پوچھنے لگی کہ جب لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ تم اپنی بیوی سے کیوں جدا ہوئے تو تم کیا کہتے ہو۔ میں نے کہا کہ اول تو لوگ مجھ سے پوچھتے ہی نہیں کیونکہ میں لوگوں سے دور رہتا ہوں اور اگر پوچھیں بھی تو میں کہتا ہوں۔ "IT DIDN'T WORK OUT"۔ اور موضوع بدل دیتا ہوں۔ مجھے احساس تھا کہ میری بیوی میری وجہ سے مجبور تھی اور میں اس کی وجہ سے اور ہم دونوں عالمِ بے بسی میں معجزوں کے منتظر تھے۔ ایسے معجزے جو آسمانوں سے اترنے بند ہو چکے ہیں۔

میرے اور میری بیوی کے تعلقات اس مداری کی پٹاری بن گئے تھے جس سے کبھی سانپ نکل آتے ہیں، کبھی پھول اور کبھی ڈگڈگی۔ شاید فطرت ڈگڈگی بجا رہی تھی اور ہم دونوں بندروں کی طرح ناچ رہے تھے۔

میرے عورت ہونے کے اعلان کے بعد جو پنڈورا باکس (PANDORA'S BOX) کھلا تھا اس میں صرف بیوی کے مسائل نہ تھے ملازمت کے مسائل بھی تھے۔ مجھے فیکٹری سے خط آنے لگے کہ تمہارے ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ تم (DEPRESSION) کا شکار ہو۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ تم کب تک صحتیاب ہوگے۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ میری بیماری کو حسبِ ضرورت لمبا کرتی رہیں۔ یہ علیحدہ بات کہ طفل تسلیاں بھی دیتے رہے۔ آپ نے کبھی مرض کو لاعلاج نہ قرار دیا اور میں نے کبھی PERMANENT DISABILITY

کی درخواست نہ دی۔ اپنی مالی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں جہاں کوئی زور سے بھی کھانستا ہے تو پورے گاؤں کو پتہ چل جاتا ہے۔ میرا یہ اقرار کرنا میرے اور میری بیوی کے لئے شہد کی مکھی کے چھتے کو چھیڑنے سے کم نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ کے پروفیسر نے کہا تھا کہ وہ میرے آپریشن کے لئے اس وقت تک سفارش نہ کرے گا جب تک میں نے عورتوں کی طرح دو سال تک زندگی نہ گزاری ہو۔

عورتوں کی طرح زندگی گزارنے کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ میں عورتوں کا لباس پہن کر گھر سے باہر نکلوں۔ گھر سے قدم باہر رکھنے کی سوچتے ہی میرے قدم دو دو من کے ہو جاتے۔

میں ایک مدت سے عورتوں کے ہارمونز (HARMONES) کھا رہا تھا۔

میں نے بال بڑھا لئے تھے۔

میری جلد نرم اور ملائم ہو رہی تھی۔

میرے پستان بھی اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگے تھے۔

لیکن پھر بھی میں گھر سے باہر نکلتے ڈرتا تھا۔ میں نے بیسیوں بار کوشش کی کہ گھر سے رات کی تاریکی میں شہر کے جنگل بھی کھو جاؤں لیکن خوف کی زنجیریں اتنی بھاری تھیں کہ میں اس خیال سے ہی پتھر کا بن جاتا۔

آخر آپ نے ایک مشورہ دیا جو مجھے بہت پسند آیا۔ ہیلووین (HALLOWEEN) آنے والی تھی۔ ہیلووین کی رات ان بیڑیوں کو توڑنے کا اچھا موقع تھا جن سے میں برسہابرس سے بلکہ یوں کہوں تو زیادہ بہتر ہو کہ قرن ہا قرن سے الجھ رہا تھا۔ اسی دوران میری بیوی کے بھانجے نے جس سے میں کبھی کبھار ملتا تھا اور جس کی ملاقات سے میرے دل کے ویرانوں میں بے موسم کے پھول کھل اٹھتے تھے کہنے لگا کہ وہ ہیلووین کی رات کو میرے ساتھ ٹرک یا ٹریٹ (TRICK OR TREAT) پر جانا چاہتا ہے۔ وہ میرے لئے ایک سنہرا موقع تھا۔

ہیلووین کی رات مجھے بہت پسند تھی۔ ایسی رات جس میں نہ صرف فرشتے،

شیطان، پریاں اور چڑیلیں گلیوں اور بازاروں میں گھومتے نظر آتے تھے بلکہ لوگوں کو اپنی خواہشوں، آرزوؤں اور تمناؤں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس شام میں نے عورتوں کا لباس زیب تن کیا اور بھانجے کو ننھے فرشتے کے کپڑے پہنائے اور میں شام کے دھندلکے میں اس ننھے فرشتے کے ساتھ ان گلیوں اور بازاروں میں گھوما جہاں مجھے دن کی روشنی میں ان کپڑوں میں گھومنے کی حسرت تھی۔

وہ ننھا فرشتہ میرا مسیحا نکلا

میں اس واقعہ کے بعد جو حادثے سے کم نہ تھا چند دن تک ہواؤں میں اڑتا رہا لیکن وہ خوشی بھی میری ہر خوشی کی طرح چند روزہ تھی۔

اس ننھے فرشتے نے جب گھر والوں کو خوشی خوشی بتایا کہ میں عورت بنا تھا تو حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ وہ گاؤں جہاں چہ میگوئیوں کی آگ پہلے سے سلگ رہی تھی۔ اس خبر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ننھے فرشتے کی نانی نے کہا کہ مسئلہ صرف ہیلووین کی رات کا نہیں۔ وہ شخص اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے اور ہو سکتا ہے کہ بعض پاگلوں کی طرح خطرناک بھی ہو اس لئے تمہارا بچہ اس کی صحبت میں محفوظ نہیں۔

بس پھر کیا تھا — وسوسوں کے ناگ گاؤں کے جنگل میں اتر گئے اور شکوک و شبہات کا زہر کینسر کے سیلز (CELLS) کی طرح رشتہ داروں کے سراپا میں پھیل گیا۔ انہوں نے مجھ سے اس بچے کی مسکراہٹ چھین لی جو میری زندگی کے صحرا کا تنہا بادل تھی۔

اس واقعہ کے بعد میں رات کی تاریکی میں گھر سے عورتوں کے کپڑے پہن کر نکلنے لگا لیکن میرے کرب کی ٹیسیں شدید سے شدید تر ہونے لگیں۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں نے بیوی سے جدائی کے بعد جو خواب دیکھے تھے ان کی حیثیت ایک پاگل کی بڑ سے زیادہ نہ تھی مجھ میں خود ہی اتنی ہمت نہیں تھی کہ بزدلی کے سینے میں خنجر گھونپ دیتا اور ایک چوراہے پر کھڑا ہو کر اعلان کرتا کہ میں ایک عورت ہوں اور عورت کی طرح زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

ہیں آپ کے پاس آتا، دل کا غبار نکالتا اور چلا جاتا۔ آپ کی حیثیت اس سرجن کی طرح تھی جو ہر ہفتے مریض کے زخموں اور ناسوروں سے پیپ نکال دیتا ہے اور پھر وہ پیپ دوبارہ بھرنی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔ اسی لئے یہ میری آخری ملاقات ہے۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ آپ مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتی رہیں کہ میں منزل کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہوں۔ آپ مجھے خرگوش اور کچھوے کی مثال دیتی رہیں لیکن مجھے اس سست رفتاری سے خوف آتا رہا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میرے مصائب کی رات اتنی لمبی ہے کہ میری موت کی منزل میری خوشیوں کی سحر سے قریب تر ہے۔

لیکن پھر وہی ہوا۔ میں تھا اور زندگی کا دامِ فریب، جہاں مایوسیوں کی تاریکی حد سے بڑھی امید کی کوئی کرن کسی کونے سے نکل آئی۔

ہمارے گروپ میں ایک مہمان کا اضافہ ہوا لیکن وہ مہمان باقی سب مہمانوں سے جدا تھا۔ اس کی ہمت، اس کی شجاعت، اس کا حوصلہ، اس کی لگن اور اس کا نقطۂ نظر سب کے لئے ایک تازیانہ تھا۔

وہ عجیب و غریب شخص تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے خاندان کی خاردار جھاڑیوں میں ایک سبزۂ بیگانہ کی طرح پلا بڑھا تھا۔ وہ دوسروں کی آنکھوں میں اپنے آپ کو تلاش کرتا رہا تھا۔ آخر ایک دن وہ اپنی تلاش میں گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک بیگ میں جینز کی دو قمیض اور پتلونیں ڈالیں اور چل دیا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کا رختِ سفر جتنا کم ہو اتنا ہی وہ ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔

وہ دنیا کے کونے کونے میں پھرا۔ مختلف شہروں میں۔ بستیوں میں۔ جنگلوں میں۔ صحراؤں میں گھوما اور اپنے مشاہدات و تجربات کو اپنی ذات میں جذب کرتا رہا۔

اس کا کہنا تھا کہ وہ ایسی بستیوں کو دیکھ کر آیا ہے جہاں مرد اور عورتیں ایک ہی گھر۔ ایک ہی گاؤں اور ایک ہی شہر میں رہ کر بھی علیحدہ علیحدہ دنیاؤں میں بستے ہیں۔ لڑکیوں کے اسکول علیحدہ۔ لڑکوں کے کالج علیحدہ۔ عورتوں کے کام کاج کی جگہ علیحدہ۔

مردوں کے کھیل کے میدان علیحدہ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اپنے گھروں میں قید ہو گئے تھے اور قوانین وروایات نے شہروں کو جیلوں میں بدل دیا تھا۔

بعض شہروں میں مرد اور عورتیں ایک دوسرے کی قربت سے اتنے محروم ہوئے تھے کہ ہم جنسی میں مبتلا ہو گئے تھے حتیٰ کہ بچوں کی عصمت بھی محفوظ نہ رہی تھی، ان علاقوں میں کئی اساتذہ اور کئی مذہبی رہنما پکڑے گئے تھے جنہوں نے بچوں کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ایسے دیہاتوں سے گزرا تھا جہاں جہالت کی ملکہ کی حکمرانی تھی۔

نوجوان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے جسموں سے کیا اپنے جسموں سے بھی ناواقف تھیں۔ وہ اب بھی سمجھتے تھے کہ مشت زنی سے انسان کی نظر کمزور ہو جاتی ہے۔ عورتیں مردوں کو بوسہ دینے سے حاملہ ہو جاتی ہیں۔ حیض میں مباشرت کرنے سے انسان پاگل ہو جاتا ہے۔

وہ یہ نہ جانتے تھے کہ عورتیں مہینے میں صرف دو یا تین دن حاملہ ہو سکتی ہیں۔ وہاں عورتوں کے آج بھی ختنے کئے جاتے تھے۔ اور لوگ بعض انسانوں کو ہیجڑا کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

اس نے ہزاروں بے اولاد عورتوں کو پیروں، فقیروں کی قبروں پر نمک کھلاتے، جھاڑو دیتے اور منتیں مانتے دیکھا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ جب لوگ زندہ انسانوں کو چھوڑ کر مردہ قبروں سے امیدیں لگائے بیٹھے رہیں تو انسانوں کی زندگیوں میں قبروں کی تاریکی اترتی ہے۔ انسان آنکھیں رکھنے کے باوجود نابینا، کان رکھ کر بھی بہرے اور زبان رکھ کر بھی گونگے ہو جاتے ہیں اور اپنے فرسودہ عقائد کے دھندلکوں میں ایسے کھوتے ہیں کہ درخت گنتے گنتے جنگل ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

اس مردِ جہاں دیدہ کا یہ فلسفۂ حیات تھا کہ زندگی میں کوئی چیز بغیر قربانی کے حاصل نہیں ہوتی اسی لئے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ گھر واپس آکر اپنی کار، اپنا مکان اور

اپنی جائیداد بیچ دے گا تاکہ اتنی دولت جمع کر سکے کہ جنس بدلنے کا آپریشن کرا سکے۔ اس نے دنیا کے ایسے سنٹروں کی فہرست تیار کر لی تھی جہاں ڈاکٹروں اور نرسوں کی خدمات، ڈالروں سے خریدی جا سکتی ہیں اور جہاں ڈالر کی کنجی بہت سے تالوں کو کھول دیتی ہے۔

مجھے اس شخص کی جو بات سب سے اچھی لگی وہ اس کا ذہنی مریضوں کو زندگی کے سوتیلے بچے کہہ کر بلانا تھا۔ ایسے سوتیلے بچے جن سے فطرت اور خدا نے ہی نہیں بلکہ انسانوں نے بھی آنکھیں موڑ لی تھیں۔

میں اس ہم سفر کی باتیں سننے کے بعد کئی دن تک سو نہ سکا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں جس راستے پر چل رہا ہوں اس کی منزل تک پہنچنے کے لئے جن قربانیوں کی ضرورت ہے ان سے میرا دل خالی ہے اور جن ڈالروں کی ضرورت ہے ان سے میری جیب تہی ہے۔

آخر میں گاؤں چھوڑ کر شہر چلا آیا اور اس کی گہما گہمی میں کھو گیا۔ میرا خیال تھا کہ انسان شہر میں گمنامی کی زندگی گزار سکتا ہے۔ شہروں کی بھیڑ میں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ نفسا نفسی کا وہ عالم ہوتا ہے کہ ہمسایہ ہمسایے کو نہیں پہچانتا۔ اور وہ ماحول جو عام لوگوں کے لئے سوہانِ روح ہوتا ہے زندگی کے سوتیلے بچوں کے لئے رحمت کا کام کرتا ہے۔

میں شہر تو چلا آیا لیکن نانِ شبینہ کا محتاج ہو گیا۔ گاؤں میں عورتوں کی طرح کام کرنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اس فیکٹری میں کام کرتا جس میں میری بیوی کام کرتی تھی جو میرے ضمیر کو گوارا نہ تھا۔

میں جس دن سے شہر آیا ہوں بے روزگاری کی چادر اوڑھے پھر رہا ہوں۔ میری زندگی گلیوں کے کتوں سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ بے روزگاری انسان کو ذلیل و خوار ہی نہیں کرتی اس کی روح کو بھی داغدار کر دیتی ہے۔

میں جو خواب لے کر گاؤں سے چلا تھا وہ شہر کی دیواروں سے ٹکرا کر چکنا چور

ہو گئے۔ ہر گلی میں خوف۔ ہر سڑک پر ہراس اور ہر موڑ پر ذلت میری راہ روکے کھڑے تھے۔

کہاں وہ گاؤں جہاں میں واحد TRANSEXUAL تھا اور کہاں یہ شہر جہاں انہوں نے دو کلب بنا رکھے ہیں۔ میں کئی دفعہ ان سے ملنے گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں لیکن کشتی آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہے۔ نجانے کتنے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور کتنوں نے خودکشی کی آغوش میں پناہ لی تھی۔

آخر مجھے اندازہ ہوا کہ آپ کے پروفیسر کی باتیں فریب سے زیادہ نہ تھیں۔ آپ کا ادارہ علاج کا ادارہ نہ تھا۔ ریسرچ کا ادارہ تھا جو ہر سال بیسیوں ریسرچ پیپر چھاپ کر خوش ہو جاتا تھا۔ آپ کا کام مریضوں کو جھوٹی تسلیاں دینا تھا۔ اور لوگوں کو حتی الامکان اپنے کرب کو برداشت کرنا سکھانا تھا۔

میری ناامیدیاں اور مایوسیاں غصے اور نفرت کا روپ دھارنے لگیں اور میں کھمبوں اور راہ چلتے کتوں کو ٹھوکریں مارنے لگا۔

ہارمونز کھانے کا اثر یہ ہوا کہ میرے پستان بڑھ گئے، آواز قدرے نسوانی ہو گئی لیکن پھر میرے سارے جسم پر دانے نکل آئے۔ میں انہیں کھجاتا تو خون نکلنے لگتا۔ آپ مرہم دیتے تو چند دنوں کے لئے افاقہ ہو جاتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے میرا سراپا ناسور بن گیا ہو۔

میں نے ڈرائیورز لائسنس (DRIVER'S LICENCE) بدلنا چاہا تو وہ میرا نام تو بدلنے کو تیار ہو گئے لیکن انہوں نے میری جنس کو اس وقت تک بدلنے سے انکار کر دیا جب تک کہ میں آپریشن نہ کرا لوں۔

پھر ایک دن میں نے اخبار میں ایک TRANSEXUAL کی دردبھری کہانی پڑھی جو مذہبی جنون کا شکار تھا۔ اس کی اپنے ہمسایہ سے ہاتھاپائی ہوئی تھی جو اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس پر مقدمہ چلا تو جج نے اسے دو مہینے جیل کی سزا دی۔ اس نے مردوں کی جیل میں جانے سے انکار کر دیا۔ وہ عورتوں کی جیل میں جانا چاہتا تھا

اور جب اسے زبردستی مردوں کی جیل میں بند کیا گیا تو چند دنوں بعد وہ اپنا PENIS کاٹتے ہوئے لہو میں لتھڑا ہوا پکڑا گیا۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے اسے پاگل خانے بھیج دیا۔ ہسپتال میں ڈاکٹر نے اس سے اس حرکت کی وجہ پوچھی تو اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر دیا جس پر انجیل کی یہ آیت لکھی تھی:

"THERE ARE EUNUCHS BORN THAT WAY FROM THEIR MOTHER'S WOMB, THERE ARE EUNUCHS MADE SO BY MEN AND THERE ARE EUNUCHS WHO HAVE MADE THEMSELVES THAT WAY FOR THE SAKE OF KINGDOM OF HEAVEN." (MATHEW : 19:12)

ڈاکٹر نے اس شخص کو بتایا کہ اس آیت کا اشارہ رہبانیت کی طرف تھا نہ کہ خود کو خصی کرنے کی طرف لیکن اس شخص نے اس آیت کی وہ تفسیر قبول نہ کی اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ آسمانی کتابوں کی آیتوں کی تفسیر پر بھلا کب اتفاق رائے ہوا ہے۔

وہ ہسپتال میں بھی مصر تھا کہ اسے عورتوں کے حصے میں رکھا جائے۔

میں جانتا ہوں کہ آپ میری باتیں سن کر تھک گئے ہیں۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ ایک دو باتیں اور ہیں۔ اس کے بعد میں رخصت ہو جاؤں گا۔ میں آپ کے صبر و تحمل کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔

تقریباً دو ہفتے پہلے میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فنکار ایک بت بنا رہا ہے۔ وہ مرد کا بت ہے لیکن اس کے مداح ایک عورت کا بت چاہتے ہیں، چنانچہ وہ بت کا PENIS ہتھوڑے کی ضربوں سے توڑ دیتا ہے اور اس کی جگہ بت کے پستان بنا دیتا ہے اور ایک خوبصورت مجسمہ تیار کر دیتا ہے۔

میں نے اگلے دن اپنے PENIS میں ایک کیتھٹر ڈال دیا اور اسے آہستہ آہستہ کاٹنا شروع کر دیا۔ لیکن ایک مرحلے پر میں بیہوش ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو میں ہسپتال میں تھا۔

انسان بعض دفعہ اتنا مجبور محسوس کرتا ہے کہ خودکشی اختیار و ارادہ کی آخری علامت

بن جاتی ہے۔

میں اس حادثے کے اثر سے ابھی پوری طرح نکلا نہ تھا کہ مجھے کل خبر ملی کہ وہ ننھا فرشتہ جسے مدتوں پہلے خاندان نے مجھ سے جدا کر دیا تھا لیوکیمیا (LEUKEMIA) سے مر گیا ہے اور مجھے کسی نے خبر تک نہ دی۔

وہ مجھے اس سے دور رکھ سکتے تھے اس کی قبر سے نہیں۔ آج صبح جب مجھے چند لوگوں نے جگایا تو مجھے احساس ہوا کہ میں ننھے فرشتے کی قبر پر ساری رات سویا رہا تھا۔

اچھا اب میں چلتا ہوں۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اتنا وقت دیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے ان پریشان خیالات کو کہیں محفوظ کر لیں گی۔

لیکن جانے سے پہلے میں اپنی آخری خواہش، آخری آرزو، آخری تمنا یا یوں کہیں کہ آخری وصیت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب آپ مجھے ننھے فرشتے کے پہلو میں دفن کریں تو میری قبر پر جلی حروف سے لکھ دیں کہ:

اس جگہ ایک ایسی عورت دفن ہے جسے ساری عمر
لوگ مرد سمجھتے رہے

چونکہ یہ میری آخری ملاقات ہے اس لئے کیوں نہ ہم پہلی اور آخری دفعہ گلے مل لیں۔

اچھا اب میں چلتا ہوں۔ آپ کی طویل خاموشی میرا سہارا بھی تھی اور اس بات کی دلیل بھی کہ:

کس کو فرصت کہ مجھ سے بحث کرے
اور ثابت کرے کہ میرا وجود
زندگی کے لئے ضروری ہے۔

٭٭٭

خالد سہیل

کردار:

۱: جارج ___ ایڈز کا مریض جو بستر مرگ پر ہے!

۲: فرنانڈو ___ جارج کا ہمراز!

۳: ڈاکٹر وکٹر ___ جارج کا ڈاکٹر!

۴: فادر ولسن ___ ایک رومن-کیتھولک پادری !

۵: انتھونی ___ جارج کا بھائی!

۶: مسٹر اور مسز اسمتھ ___ جارج کے والدین!

۷: مسٹر ریمن ___ فیونرل ہوم کا انچارج!

سین ___ فیئرلان نرسنگ ہوم ___ پہلا ایکٹ

جارج نرسنگ ہوم کے بیڈ پر زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ اس پر جاں کنی کا عالم ہے...... نقاہت کے ساتھ وہ بے چین نظر آ رہا ہے۔ اسے ڈرپ لگی ہوئی ہے! اس کے سرہانے فرنانڈو کھڑا ہے جس پر رقت طاری ہے۔ اس نے جارج کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا ہے اور آہستہ آہستہ اسے سہلا رہا ہے..... وہ وقفے کے ساتھ جارج کی پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا ہے..... وہ بار بار گھڑی دیکھتا ہے اور ساتھ ہی دروازے

کی طرف بھی دیکھتا ہے ...... شام کے چھ بج رہے ہیں۔ دور کسی گرجا گھر کے گھنٹے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ پس منظر میں گہرا اندھیرا ہے۔ یہ لوگ ایک پیلے Spot Light میں نظر آرہے ہیں .... فضا میں وائلن کی دل سوز موسیقی تحلیل ہوتی سنائی دے رہی ہے۔

جارج کے ہونٹ کانپ رہے ہیں، جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو!

فرنانڈو: (جذبات پر قابو پاتے ہوئے مسکراتا ہے) تم بہت بہادر ہو جارج ...... ڈاکٹر وکٹر کہہ رہا تھا کہ ..... آج ایک نیا انجکشن ...... (آواز بھرا جاتی ہے اور وہ منھ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔)

جارج: (نقاہت کے ساتھ) فرنانڈو ...... مجھے جھوٹی ...... تسلیاں مت دو!

فرنانڈو: (اس کی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے) نہیں جارج ...... تم ابھی ہارے نہیں۔

جارج: (آہستہ سے) مگر ...... میں تھک گیا ہوں ڈیئر ...... (Pause) - آج ..... اس وقت خود کو ...... ہلکا پھلکا بھی محسوس کر رہا ہوں (کھانستا ہے) لگتا ہے ...... میرے ...... میرے پر لگ گئے ہوں ...... اور ...... اور میں ...... اڑ رہا ہوں ...... (Pause) اچانک درد کہیں غائب ہو گیا ...... ہے ...... یا اب مجھے محسوس ہی (کھانستا پھر کراہتا ہے) کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا ہے (آنکھیں بند کرتے ہوئے) ایک عجیب سی ...... بوجھل خوشبو ہے فضا میں ...... بس ...... سانس (زور زور سے سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے) سانس بھاری ہوتی جا رہی ہے ......!

(اٹھنے کی کوشش کرتا ہے):

فرنانڈو: (جارج کو اٹھنے سے روکتے ہوئے) نہیں جارج ...... تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔

جارج: (پژمردہ مسکراہٹ کے ساتھ) آرام ..... ہاں ..... (Pause) مجھے نیند بھی آرہی ہے (سانس درست کرتے ہوئے) میں خوش ہوں ...... تم میرے پاس ہو (جارج کا ہاتھ فرنانڈو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے) میرے ہمدم ...... تم بزدل نہیں ہو ...... تم میری طرح اپنے خول میں دم ...... نہ توڑنا (Pause)

اب جب ...... ساری آزمائشیں ...... ختم ہونے کو ...... ہیں ......
تو آڑنے کو جی چاہ رہا ہے۔ چیخ کر دنیا کو یہ بتانا ...... چاہتا ہوں کہ میں
...... میں جارج اسمتھ ...... ایک انسان ...... (کھانسنے لگتا ہے)۔

فرنانڈو : (بے بس ہو کر) جارج ...... پلیز!

جارج : (سانس درست کرتے ہوئے) آج تک تو میں ...... خاموش ہی رہا ......
اپنی ...... زندگی کی خاطر ...... آج جب ...... (کھانستا ہے) بولنے
دو مجھے ...... صرف ایک بار ...... فرنانڈو ...... وعدہ کرو۔ میری ......
آخری خواہش پوری ...... کرو گے!

فرنانڈو : (جلدی سے) ہاں ...... میں وعدہ کرتا ہوں جارج! بولو ...... کیا
بات ہے؟

جارج : (ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے) اب میں ...... سکون کی نیند سو سکوں گا۔
(Pause)۔ (فرنانڈو رومال سے اس کی پیشانی پونچھتا ہے) آج ......
شاید ...... میری آخری رات ہے ...... جو وقعت مجھے زندگی نے
نہیں دی ...... وہ موت سے حاصل کرنا چاہتا ہوں (Pause) میرا
کفن دفن باعزت کیتھولک طریقے سے کرنا ...... تمام رشتہ داروں ......
اور دوستوں کو بلانا ...... اور مجھے ...... اپنے ...... خاندان کے ......
قبرستان میں ...... دفن کروانا ...... اور کتبے پر پورا نام "جارج اسمتھ"
کندہ کرانا ...... بس ...... (زور زور سے سانس لیتا ہے) اور ......
میری تمام چیزیں ...... تم اپنے مصرف میں ...... میں رکھنا (کھانستا ہے)
صرف ...... میرے گلے کا لاکٹ ...... میری ماں ...... کو دے دینا (Pause)
اور ...... اس کو رونے نہ دینا ...... اور ......

فرنانڈو : (بات کاٹتے ہوئے) بس جارج ...... بس خاموش ہو جاؤ ...... (اپنا چہرہ
ہاتھوں میں چھپا لیتا ہے) ...... میں تمہاری آخری خواہش ضرور پوری

کروں گا...... میں وعدہ کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر وکٹر داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر : مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے فرنانڈو...... آؤ میرے ساتھ (ڈاکٹر فرنانڈو کو ایک کنارے لے جاتا ہے)

فرنانڈو : (التجا کرتے ہوئے) ڈاکٹر مجھ سے اب جارج کی حالت دیکھی نہیں جاتی...... اسے نیند کا انجکشن کیوں نہیں دیتے ڈاکٹر؟

ڈاکٹر : حقیقت سے آنکھیں مت چراؤ فرنانڈو...... تمہیں معلوم ہے، جارج اب صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے...... کیا تم اس کے گھر والوں کو خبر نہیں کروگے...... یا شاید آخری تیاریاں بھی تمہیں ہی کرنا ہیں...... ہمت سے کام لو...... اور جاؤ...... وقت بہت کم ہے تمہارے پاس۔

فرنانڈو : مگر ڈاکٹر...... اس حالت میں جارج کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں...... کیا پتہ کس وقت......

ڈاکٹر : تم اس کی فکر مت کرو، ہم لوگ تو ہیں......!

فرنانڈو : (خود کو سنبھالتے ہوئے) ٹھیک ہے ڈاکٹر (جارج کے پاس جاکر) میں تمہیں باعزت طریقے سے رخصت کروں گا جارج...... تمہاری ہر خواہش کو پورا کروں گا۔ (جھک کر پیشانی چومتا ہے/ جارج خالی نظروں سے اسے جاتا دیکھ رہا ہے۔ فرنانڈو جاتے ہوئے اسے پلٹ کر دیکھتا ہے اور روشنی مدھم پڑ جاتی ہے)

(اسٹیج کے دوسرے سرے پر "Spot Light" میں ایک پادری بیٹھا بائیبل پڑھ رہا ہے اور فرنانڈو گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے۔)

فرنانڈو : (گھبراہٹ کے ساتھ) فادر...... آج آپ انکار نہ کرنا...... جارج اب صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے...... پلیز فادر ولسن "For Heaven Sake" میرے ساتھ چلیں...... اور اس کے لئے دعا کریں...... اسے

آپکی "Blessings" کی ضرورت ہے!

فادر : (بیزاری سے) میری "Blessings" اسے جہنم کی آگ سے نہیں بچا سکتی۔ اس نے فطرت اور قدرت کی خلاف ورزی کی ہے...... اسے اپنے کیئے کی سزا مل رہی ہے۔ میں مجبور ہوں...... "It is too late my Son"۔

فرنانڈو : (الجھتے ہوئے) نہیں فادر...... اب بھی دیر نہیں ہوئی......... ایک پادری کا کام دعا دینا ہے...... سزا سُنانا نہیں...... آپ بھی تو اپنی فطرت کے خلاف ضد کر رہے ہیں...... پلیز فادر اس کی آخری خواہش کا ہمیں احترام......

فادر : (ناراضگی کے ساتھ) کیسا احترام...... جس نے قدرت اور اس کے قانون کا احترام نہ کیا...... اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

فرنانڈو : (التجا کرتے ہوئے) دنیا کی تمام مقدس کتابیں...... محبت اور سلامتی کا درس دیتی ہیں فادر...... آپ کو بھی محبت اور رحمدلی......

فادر : (جھڑکتے ہوئے) مجھے محبت اور رحمدلی کا سبق مت پڑھاؤ...... میں نے کہہ دیا میں اپنے گرجا کے اصولوں کے خلاف نہیں جا سکتا (Pause) اور پھر جب تمہیں دنیا کے مذاہب کی اتنی معلومات ہے تو جاؤ کسی اور کو پکڑ کر "Blessings"...... (زیرلب) مذہب اور قانونِ قدرت کا مذاق بنا رکھا ہے تم لوگوں نے...... اب برائے مہربانی جاؤ اور اپنے گناہ میں مجھے شریک مت کرو...... یہاں آنے کے بجائے تمہیں بھی اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے!

فرنانڈو : فادر...... ہم نے سُنا تھا مذہبی رہنما...... بڑے خدا ترس اور رحمدل ہوتے ہیں...... آج معلوم ہوا...... یہ سب جھوٹ ہے، دل کا بہلاوا ہے (Pause) مگر آپ نے اپنی سفید پوشی کے ساتھ انصاف نہیں

کیا فادر ...... (فرنانڈو واپسی کے لئے مڑتا ہے، فادر سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہے اور روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔)

spot light میں مسٹر اسمتھ دیوار کی طرف منھ کر کے کھڑے ہیں۔ قریب ہی مسز اسمتھ دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپائے بیٹھی رو رہی ہیں۔ ...... سامنے فرنانڈو کھڑا اپنا ہاتھ مل رہا ہے اور مضطرب نظر آ رہا ہے)

فرنانڈو : (دھیمے لہجے میں) مسٹر اسمتھ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا...... آپ شاید بھول رہے ہیں کہ جارج آپ کی اولاد...... آپ کا اپنا خون ہے...... پھر......

مسٹر اسمتھ : (غصہ میں پلٹتا ہے) یہی تو افسوس ہے کہ وہ بدبخت میری اولاد ہے ...... قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ آج یہ سب دیکھنے کو میں زندہ ہوں۔ (اپنا سر پکڑ کر)

فرنانڈو : (دھیمے لہجے میں) اور آپ مسز اسمتھ ...... آپ بھی

مسز اسمتھ : (روتے ہوئے) میں کیا کروں ...... مجھے کچھ نہیں معلوم (Pause) پتہ نہیں مجھ سے کہاں ...... کون سی بھول ہو گئی (دوبارہ اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے)

فرنانڈو : (غمگسار لہجے میں) بھول آپ سے نہیں...... یہ بھول قدرت کی ہے کہ ہمیں آدھے ادھورے بنا کر...... خیر یہ بحث پھر کبھی...... میں ایک بار پھر آپ لوگوں سے گزارش کروں گا کہ تمام غصہ اور نفرت بھول کر اس وقت جارج کے پاس چلیں۔ وہ آخری ہچکیاں لے رہا ہوگا یا شاید تمام آزمائشوں اور کلفتوں سے نجات حاصل کر چکا ہوگا (فضا میں گھورتے ہوئے) کاش آپ لوگ اس کی جان کنی دیکھتے "christ sake" فوراً چلئے اور اسے تمام اذیتوں سے آزاد کر دیجئے...... شاید اسکی روح

آپ لوگوں سے ملنے کو اٹکی ہوئی ہو۔

(انتھونی اندر داخل ہوتا ہے اور مسز اسمتھ روتے ہوئے اس کے گلے لگ جاتی ہے)

انتھونی : (فرنانڈو کو نفرت بھری نظر سے دیکھتا ہے) اوہ ...... تم!

مسز اسمتھ : (روتے ہوئے) جارج ...... جارج ...... ہم کیا کریں، انتھونی!

انتھونی : (فرنانڈو کو گھورتے ہوئے) ہم کر بھی کیا سکتے ہیں ...... جو راستہ اس نے اختیار کیا تھا ...... اس کا خاتمہ ایسا ہی شرمناک ہوتا ہے!

فرنانڈو : انتھونی ...... تمہارے اندر بھی اتنی نفرت ...... تمہیں جارج نے گود میں کھلایا ہے ...... وہ تمہیں کس قدر چاہتا ہے!

انتھونی : (بیزاری سے) یہ سوچ کر شرم آتی ہے کہ عمر کا آدھا حصہ میں نے ایسے شخص کے ساتھ گزارا ہے ...... (Pause) ڈرتا ہوں مجھے بھی کہیں اس کی بیماری نہ لگ جائے!

مسز اسمتھ : (جلدی سے) نہیں ......!

فرنانڈو : (رنجیدہ ہو کر) تمہارے خیالات سن کر بہت افسوس ہوا انتھونی! اچھا ہے تم آخری وقت جارج کے پاس نہیں تھے ...... ورنہ اس کی روح کو کبھی سکون نہ ملتا۔

انتھونی : ہونہہ ...... افسوس! یہاں شہر میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہم لوگ ...... ہم شہر چھوڑنے کا سوچ رہے ہیں ...... اس موت سے کیا ہم لوگوں کے منہ پر لگی ہوئی کالک صاف ہو جائے گی (Pause) اب تو یہ ساری زندگی کی ذلت و رسوائی ہے۔

فرنانڈو : یہاں مزید بحث کی گنجائش نہیں ...... آپ لوگ میرے ساتھ جائیں گے یا نہیں (Pause) ...... (سب خاموش بیٹھے رہتے ہیں)

ٹھیک ہے ...... مگر جانے سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جارج کی

کی آخری خواہش ہے ...... تھی ..... کہ اسے اسمتھ خاندان کے قبرستان میں دفن کیا جائے ...... کیا آپ لوگ .....

انتھونی : (جلدی سے) کبھی نہیں ..... ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا .... کیوں ڈیڈی (باپ کی طرف دیکھتا ہے)

مسٹر اسمتھ : (آہستہ سے) ہوں ...... (نظریں نیچی کرلیتا ہے)

مسز اسمتھ : (پھوٹ کر روتے ہوئے) میں آخری بار ..... آخری بار جارج کو دیکھنا چاہتی ہوں!

انتھونی : نہیں ماں ..... بھول جاؤ کہ تمہارا کوئی بیٹا ...... جارج بھی تھا. اب تم جا سکتے ہو ...... اور آئندہ یہاں کبھی نہ آنا!

فرنانڈو : (رنجیدہ ہوکر) میں تو جا رہا ہوں انتھونی ...... مگر تمہارا ضمیر تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا (Pause) تم سب اس قدر بزدل اور اتنے سنگ دل ہو کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا ..... (روشنی مدھم پڑجاتی ہے)

(spot Light میں مسٹر ہمین اور فرنانڈو دکھائی دیتے ہیں)

ہمین : (سمجھاتے ہوئے) دیکھو فرنانڈو ..... مجھے تم سے اور تمہارے دوست سے پوری ہمدردی ہے، مگر ہر کاروبار کی طرح، ہمارے دھندے میں بھی کچھ اصول، تھوڑی مجبوریاں ہوتی ہیں ...... ہم اس کے خلاف نہیں جاسکتے!

فرنانڈو : (حیرت سے) میری سمجھ میں نہیں آیا ..... آپ کا کام، کاروبار، غرض جو کہہ لیجئے ...... یہ ہے کہ آپ مرنے والے کے کفن دفن کا انتظام کرتے ہیں اور اپنی فیس لیتے ہیں ..... اس میں مجبوری کیسی؟

ہمین : ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ مرنے والا کون ہے۔ موت کیسے واقع ہوئی ہے ..... کوئی مرڈر کیس تو نہیں ہے ..... کوئی ایڈز کا مریض تو نہیں

(ادھر ادھر دیکھ کر) یہ چھوٹا سا ٹاؤن ہے ...... یہاں ہر ایک کو دوسرے کی خبر ہوتی ہے ...... کسی نے یہ سن لیا کہ میں "ایڈز" کے جنازے "Embalm" کرنے لگا ہوں تو شرفاء میرے یہاں آنا چھوڑ دیں گے اور میرا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا!

فرنانڈو : دیکھئے ...... میں نے اپنے دوست سے وعدہ کیا تھا کہ باعزت طریقے سے اس کا فیونرل ہو گا ...... آپ مایوس نہ کریں ...... انسانیت کے ناتے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مرنے والے کی آخری خواہش ......

سائمن : (بات کاٹتے ہوئے) دیکھو میرے دوست، تم اس وقت کچھ جذباتی ہو رہے ہو ...... اور میرے دھندے میں (اپنا سگار سلگاتا ہے) جذبات کی کوئی گنجائش نہیں ...... یہ رونا گانا ہم صبح و شام دیکھتے رہتے ہیں۔

فرنانڈو : ہم آپ کی منھ مانگی فیس دیں گے ...... کوئی صورت نکالئے!

سائمن : اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ...... (کچھ سوچتے ہوئے) ایک صورت ہے۔

فرنانڈو : (جلدی سے) کیا ...... میں کوئی بھی رقم دینے کو تیار ہوں!

سائمن : دیکھو بھائی ...... میرے یہاں تو یہ کسی بھی رقم سے ممکن نہیں ...... ہاں دفن کرنے کی جگہ تم "cremation" کا خیال کرو ...... خرچ بھی کم ...... اور کام بھی جلدی ...... کسی کو خبر بھی نہ ہو گی۔

فرنانڈو : (سوچتے ہوئے) "cremation" ...... نہیں ...... جارج کی آخری خواہش۔

سائمن : (بات کاٹتے ہوئے) ارے کیا آخری خواہش ...... آخری خواہش لگا رکھی ہے (منھ بناتے ہوئے) ایڈز کا مریض ...... جلدی سے ٹھکانے لگاؤ ...... ورنہ اس کی مصیبت، تمہارے سر آجائے گی۔

فرنانڈو : (غصہ میں) بند کرو اپنی بکواس ...... (پیچ و تاب کھاتے ہوئے) آج

معلوم ہوا ...... میں کس جہنم میں سانس لے رہا ہوں ...... لعنت ہے تم لوگوں پر ...... اور ایسی زندگی پر!

سائمن : (دھیمے سے) بھائی صاحب ...... مجھ پر غصہ اتارنے کے بجائے ...... ذرا اپنے کرتوت پر بھی نظر ڈالو ...... (Pause) شکر کرو کہ لوگوں نے اب تک اپنی نفرت دلوں میں رکھی ہے ...... ورنہ ......

فرنانڈو : (فضا کو گھورتے ہوئے) اس زندگی سے تو موت اچھی!

سائمن : (طنزیہ مسکراہٹ کیساتھ) میرا بھی یہی خیال ہے ...... مگر مرنے کے بعد بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا ...... اب جاؤ اور خاموشی سے مرنے والے کو cremate کروادو ...... منٹوں میں بجلی کی لپک ساری برائی اور جراثیم کو چاٹ کر ختم کردے گی۔

(فرنانڈو جانے کیلئے گھومتا ہے اور روشنی مدھم پڑجاتی ہے)

اسٹیج پر گہرا اندھیرا ہے ...... پس منظر میں وائلن کی Pathos میوزک کے ساتھ "Blue Spot Light" میں جارج کا بستر نظر آتا ہے ...... وہ مرچکا ہے ...... اس کے چہرے تک سفید چادر پڑی ہے ...... فرنانڈو خاموشی سے بستر کے سامنے دوزانو ہے، لمحہ بھر بعد وہ آہستہ سے سر اٹھاتا ہے ...... وہ جیسے سکتے کے عالم میں ہے۔

فرنانڈو : (دھیمے لہجے میں) اچھا ہوا تم مرگئے جارج ...... ورنہ اس وقت میں تم سے نظریں نہ ملا سکتا ...... میں تم سے بہت شرمندہ ہوں کہ تمہاری آخری خواہش پوری نہ کرسکا (Pause) (روہانسا ہوکر) میں نے بہت کوشش کی ...... بہت سمجھایا ...... منتیں کیں ...... مگر کسی کو رحم نہ آیا ...... کسی کا دل نہ پسیجا ...... جیسے سب پتھر کے ہوگئے ...... کوئی بھی تمہارے غم میں شامل نہیں ، صرف میں ہوں ...... اب ایسے میں اپنی خوش بختی سمجھوں یا بدبختی سب سن کر اور سارا کچھ دیکھ کر بھی میں زندہ ہوں ......

میں تمہارے غم کے ساتھ جیوں گا (Pause) تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میں بزدل نہیں اور نہ میں اپنے خول میں بند ہو کر دم توڑوں گا۔۔۔۔۔۔ میں ساری آزمائشوں کے ساتھ زندہ رہوں گا۔۔۔۔۔ تمہاری کہانی۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ تمہارا المیہ سنانے کے لئے زندہ رہوں گا۔ جارج۔۔۔۔۔۔ (پھوٹ کر رونے لگتا ہے) (Pause)

آہ۔۔۔۔۔۔۔ انسان ہونے کے ناتے میں ایک بار۔۔۔۔۔ صرف ایک بار ۔۔۔۔۔ اس شہر کے لوگوں سے پوچھوں گا کہ۔۔۔۔۔ کیا واقعی صرف جارج یا اس جیسے قصوروار ہیں۔۔۔۔۔۔ کیا اس سانحے میں قدرت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے؟

(فرنانڈو Freeze ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ روشنی مدھم ہو رہی ہے۔ پس منظر سے ایک نظم فضا میں تحلیل ہوتی سنائی دیتی ہے)

اپنے اپنے جسموں میں ہم اپنی اپنی موت چھپائے
لمحہ لمحہ / رفتہ رفتہ
قسطوں میں مرتے رہتے ہیں
کاش کسی مرنے والے کو
اتنی لمبی موت نہ آئے !!!

نرمان کا شاعر

چودھری محمد نعیم

شمالی امریکہ اپنی شاہراہوں کے لئے مشہور ہے جو اس برصغیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک صاف و شفاف پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی سطح اس قدر ہموار اور رواں ہے کہ اکثر یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ آپ سفر کر رہے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل نظمیں امریکہ بالخصوص شکاگو میں لکھی گئی ہیں، مگر انہیں پڑھتے وقت آپ کو امریکی سڑکوں کی روانی نہیں یاد آئے گی، بلکہ ان کو پڑھنے کا تجربہ ایسا لگے گا جیسا کسی زمانے میں اپنے "وطن" میں شہر سے گاؤں جانیوالی سڑک پر یکے کا سفر کا تجربہ ہوتا تھا۔ قدم قدم پر دھچکے، کبھی یہ ڈر کہ یکہ الٹا، کبھی یہ خدشہ کہ کوئی پہیہ ڈھیلا ہو گیا۔ مسافر کا ایک ہاتھ سر کی ٹوپی سنبھالنے میں مصروف تو دوسرا یکے کی چھتری پر مصلوب۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ سفر کے خاتمے پر کسی منزل پر پہنچنے کا احساس شدید ہوتا تھا۔ یہ لگتا تھا کہ محنت ٹھکانے لگی۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے بھی ہمیں دھچکے لگتے ہیں۔ جا بجا پگڑی سر سے گرنے لگتی ہے۔ نظر بہت سے ایسے مناظر سے دوچار ہوتی ہے جن کے دیکھنے کی خواہش تو در گمان بھی نہ تھا اور یہ احساس ہر دم برقرار رہتا ہے کہ آپ شاعر کے ساتھ سفر پر نکلے ہیں، ایک ذہنی اور جذباتی سفر پر، جس میں وہ حد درجہ دیانت کے ساتھ آپ کا رہبر بنا ہے۔

اس سفر کا اجمالی نقشہ افتخار نسیم کی نظم "پل صراط" کے آخری مصرعوں میں ملتا ہے:

کس عذابِ دردِ پیہم سے ہوں گزرا

یہ نہ پوچھ

صحبتِ ناجنس سے میں صحبتِ ہم جنس تک

ناجنس سے ہم جنس تک پہنچنا غالباً اتنا مشکل نہیں جتنا اس سفر پر نکلنے کا اعتراف اور اظہار کرنا ہے۔ اس کے لئے بڑی جرأت چاہئے۔ جرأت کی اس سطح تک پہنچنے کے لئے انسان کو اپنا بڑا سخت احتساب کرنا پڑتا ہے۔ ایسا احتساب جس میں کبر و ریا کا شائبہ بھی نہ آنے پائے۔ جس میں خود بینی نہ ہو، خود آگہی ہو اور انکسار ہو، حد درجہ انکسار۔ بہ الفاظ دیگر شاعر میں وہ صلاحیت اور کیفیت پیدا ہو گئی ہو جس کو حاصل کرنے کی تاکید عرفی نے کی تھی :

زنقشِ تشنہ لبی داں بہ عقلِ خویش مناز
دلت فریب گر از جلوۂ سراب نخورد

افتخار نسیم امریکہ آنے سے پہلے پاکستان میں تھے۔ جب وہ لائل پور میں تھے تو غزلیں لکھتے تھے اور ان کی غزلیں معیاری رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ جب "فنون" کا جدید غزل نمبر شائع ہوا تو اس میں بھی افتخار نسیم کی غزلیں شامل تھیں اور یہ واجب تھا۔ پھر وہ امریکہ آ گئے۔ مختلف شہروں میں بھٹکتے رہے۔ گفتنی اور ناگفتنی ملازمتیں کیں، دوستوں کی دشمنی اور دشمنوں کی دوستی دیکھی۔ تنہائی کی ان منزلوں سے گزرے جہاں آدمی کو مخملیں بیابان اور بیابان مہربان محسوس ہوتے ہیں۔ وہ جب یہاں آئے تھے تو جسم اور روح کی ثنویت کا بوجھ پیٹھ پر لاد کر آئے تھے۔ تن آسان اور سہل طلب لوگ دونوں کو الگ الگ خانوں میں سنبھال کر رکھتے ہیں۔ دونوں کے تقاضے جدا جدا رویہ اور جداگانہ ذرائع سے پورا کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے خوش بخت بھی ہوتے ہیں کہ اس ثنویت کو خود پر طاری نہیں کر پاتے۔ وہ ٹیڑھے ترچھے سوال اٹھاتے رہتے ہیں جب دنیا ان سوالات سے تنگ آ جاتی ہے تو سوال کرنے والے کو سنگساری کے لائق قرار دیتی ہے۔ بظاہر ہے اس سے سوالات تو ختم نہیں ہوتے۔

افتخار نسیم نے اسی طرح کا ایک ٹیڑھا سوال اپنی نظم "میرے بابا" میں اٹھایا ہے :

میں جو بالکل آپ پہ ہوں
تو پھر میری ترجیحِ جنس
آپ سے اتنی علیحدہ کیوں ہے

یہ سوال صدیوں پرانا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے چلا آ رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ سوال نیا بھی

ہے۔ نیا نہ صرف اس کے لئے جو اس علاحدگی کے احساس سے پہلی بار آگاہ ہوتا ہے بلکہ ہم سب کے لئے بھی کیونکہ یہ سوال گزشتہ دو تین دہائیوں میں ہی اس طرح اٹھایا گیا ہے کہ اس کے تمام معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی، اخلاقی، جمالیاتی اور تہذیبی پہلو ہمارے سامنے آگئے ہیں اور اب ہم ان سے نظریں نہیں چرا سکتے۔ ہم جو ایک انصاف پسند ذہن اور دردمند دل رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کو یک قلم رد کرنے کا تکبر صرف ان "آہوانِ کعبہ" کو ہی ہو سکتا ہے جو بقولِ میر حرم کے گرد اینڈا کرتے ہیں اور نہ کسی کا تیر کھاتے ہیں اور نہ کسی کا شکار ہوتے ہیں۔

میر کا ذکر آگیا ہے تو ایک بات صاف کر دی جائے۔ میر کو قیام الدین قائم نے "حسن پرست" کہا ہے۔ میر نے عبدالحیٔ تاباں کے حسن پر فریفتہ ہونے کا اعتراف بھی کیا ہے اور کم از کم شاعری کی حد تک عطار کے لونڈے کے ذکر سے بھی نہیں شرمائے ہیں۔ لیکن میر امرد پرست رہے ہوں گے، وہ GAY نہیں تھے۔ وہ افتخار نسیم کی طرح یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ "میں خود جنس ہوں اپنا"۔ یا یہ کہ مرد ہی مرد کا دوسرا آدھا حصہ ہے۔" ایک بہت بڑا فرق دونوں کے معاشرے کا بھی ہے۔ میر کے معاشرے میں ترجیحِ جنسی کا فرق ملعون اور مطعون نہیں بنا دیتا تھا۔ نہ اس سے فرد کی عائلی اور سماجی حیثیت متاثر ہوتی تھی۔ میر شاید اس جاں گداز کیفیت سے کبھی دوچار نہیں ہوئے ہوں گے جس کا بھرپور اظہار افتخار نسیم کی نظم "ہم جنس" میں ہوا ہے:

بلوغت کی اس موڑ پر اکیلا کھڑا ہوں
مری کوکھ بھی مجھ سے باہر
کسی اور کے جسم میں ہے
میں کچھ اس طرح اپنے نازائدہ طفل
ہر رات لوری سنا کے سلا تا رہا ہوں
مرے گیت فطرت کا نوحہ بنے ہیں
کوئی بھی کتابِ مقدس
مرے واسطے
اپنے اوراق میں کوئی لفظِ محبت دکھاتی نہیں ہے۔

یہ مصرعے کوئی امرد پرست نہیں لکھ سکتا۔

میں اس بحث کو پھیلانا نہیں چاہتا کہ یہ اس کا موقع نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس مجموعے میں ایسی نظمیں بھی ہیں جن کے موضوعات کچھ اور ہیں۔ تشدد سے نفرت، امن کی خواہش، غربت اور درماندگی کا احساس، بڑے شہروں کی زندگی، عورت کا استحصال، عام نفسیاتی الجھنیں۔ یہ سب بھی اس مجموعے میں جگہ پاتے ہیں۔ البتہ اس کی بنیادی خصوصیت، اس کی یادگار حیثیت ان متعدد نظموں سے بنتی ہے جو GAY تجربے کی بھٹی میں تپ کر نکلی ہیں اور کم از کم اس لحاظ سے اردو ادب میں ایک قابلِ ذکر اور فکر انگیز اضافہ ہیں۔ اردو شاعری میں عورت کو زبان غالباً دو دہائی قبل ملی تھی۔ اب ایک دوسری مجبور و مقہور جنس کو افتخار نسیم نے زبان دی ہے۔ نئی راہ نکالنا آسان کام نہیں۔ نئے احساسات، نئی خود آگہی کے اظہار کے لئے نئے الفاظ بھی درکار ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ جذبات نئے ہوں اور تجربات تلخ ہوں تو ان میں ایک تُندی بھی ہوتی ہے جو "الفاظ گداز" ہو سکتی ہے۔ ایسا کئی جگہ ان نظموں میں محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس سے نہ تو ان جذبات کی صداقت پر حرف آتا ہے اور نہ ان تجربات کی صلابت پر۔ جو زبان صدیوں سے بند رہی ہو اس کی پہلی گفتار میں لکنت تو ہوگی۔ اہم بات یہ ہے کہ اب اس زبان کو گویائی مل گئی ہے۔

نظمیں

— افتخار نسیم

ہرا پتّہ

افتخار نسیم

پتّے سارے ہرے ہوتے ہیں
لیکن یہ پتّہ ہے
جس کے شاخ پہ آنے تک
درخت ہی پیلا پڑ جاتا ہے
اس پتّے کی ہریالی ہے
یا مکڑی کا جال
زرد کی زردی آنکھوں کو اندھا کرتی ہے
مہندی کا پتہ سوکھے تو
پس کے خون کا رنگ دیتا ہے
پر یہ سوکھا پتہ
دل کے لہو سے ہرا ہوتا ہے
اس پتے کی کونپل خار سے بھی
نوکیلی ہے
تیر کی مانند روز دلوں کو چھیدتی ہے
اس کی خاطر
مرد طوائف بن جاتے ہیں

اس پتّے کے نیشِ سبز سے
تیسری دنیا کی مدقوق رگوں میں
ایک جھوٹی سی توانائی ہے
دوڑتی ہے جو
اور ہم لوگ اسی کو نویدِ عمر سمجھ لیتے ہیں
یہ پتّہ آزادی ہے
لیکن ہر آزادی کی اک قیمت ہے
کیا تم قیمت دے سکتے ہو؟

کشور ناہید کے لئے نظم

(افتخار نسیم)

جب سب پتّھر پھینک رہے تھے
تم بھی ان میں شامل تھیں
جب سب مجھ کو زخمی کر کے چھوڑ گئے تھے
تم تب بھی خاموش کھڑی تھیں
جانتی ہو کشور ناہید
چُپ رہنا بھی سنگ زنی ہے
لیکن جب تم لوٹ کے آئیں
تو میں گھر کے سارے برتن مانجھ رہا تھا
تم ہر بار مرے پاس آ کر
اپنے سارے خواب سُناتیں
دفتر کے اور مدرسوں کے سب دروازے بند تھے مجھ پر
میں اپنے کیا خواب سُناتا
میرے کوئی خواب نہیں تھے
میں تو بس اتنا سمجھا تھا
میں گلیوں میں ناچوں
یا پھر گھر گھر جا کر
برتن مانجھوں
مجھ کو تو زندہ رہنا ہے
تم عورت کے استحصال پہ کتنا چیخیں
کتنا روئیں
تم عورت ہو تم تو میرا درد سمجھتیں
ہم دونوں میں کتنی چیزیں مشترکہ ہیں

افتخار نسیم

منازالتواء

وصل کے پیاسوں کی راتیں بھی کیسی راتیں ہوتی تھیں
ان کی دُعا تھی
ان راتوں کی سحر کبھی نہ ہو
لیکن وہ کب جانتے تھے
وصل کی بارش سے تو
قرب کے تیکھے رنگ بھی پھیکے پڑ جاتے ہیں

ہر اک جذبے کی اک عمر ہے
کُھل جاتا ہے پُراسرار وجود کا ہر اک راز
اک دوجے میں گُم ہو جانا ایسے ہے
جیسے کوئی
اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ رہا ہو
اپنے آپ سے کب تک کوئی پیار کرے
بجھی آگ الاؤ کی
مانگی تھی
اور اک جسم کا ایندھن
اور اب اتنے سالوں بعد
وصل کے ٹھنڈے دوزخ سے
باہر آنے کی کاوش میں
آدھی رات کو ان کے کمرے میں
ان کی دھیمی آوازوں میں
وی سی آر پہ چلنے والی
نیلی فلم کی آوازیں بھی
چپ سے شامل ہو جاتی ہیں

سفر میں ایک رات کی کہانی

* افتخار نسیم *

وصل اور ہجر کے سارے قصے
اس نے مجھے سنائے
کتنے انجانے بستر تھے
جو اس نے گرمائے
دنیا کے سارے خطوں کے
لوگوں کی زیبائش
یاد تھی اس کو اب تک ان کے
اعضا کی پیمائش
کتنی صبحیں جاگ کے اس نے
چڑھتے دیکھا سورج کو
کتنی شامیں کس کس
دانش ور کے ساتھ رہا
بحثیں کرتے کرتے گزریں
ایسی بھی کچھ راتیں
رومی اور یونانی سارے
فلسفیوں کی باتیں

ایک دیئے کی روشنی اس میں
پُراسرار دشائیں
کانپ رہی تھیں دیواروں پر
خواہش کی پرچھائیں
اندر کمرے میں گرمی تھی
باہر سرد ہوا
برف کی دستک دروازے پر
چور دلوں کا تھا
چیتے جیسی آنکھیں جن میں
خواہش تھی در آئی
پر میں سوچ رہا تھا اس کو
بہن کہوں یا بھائی

کاش

افتخار نسیم

افتی کاش اک لڑکی ہوتا
اور میں اس کی خاطر
آسمان سے تارے توڑتا
اس کی مانگ میں بھرنے کو
سیندور بھی لاتا
اس کے لئے میں دنیا بھر کے
سونے کے زیور بنواتا
افتی کاش اک لڑکی ہوتا
پھر میں اپنی ماں سے کہتا
اس کی ماں سے وہ افتی کو
میری خاطر مانگ کے لائے
میں بارات سجا کے
اس کے گھر جاتا
افتی کاش اک لڑکی ہوتا
میں پھر اس کے واسطے
اک چھوٹا سا گھر بھی بناتا
اس میں دنیا بھر کی چیزیں
جو اس کو اچھی لگتی ہیں
لے آتا
اپنے بچّوں کے کپڑے میں خود ہی دھوتا
افتی کاش اک لڑکی ہوتا
اور یہ سب کچھ کہنے والا
ہر شب
وصل کی ساری منزلیں طے کرتا ہے
اور پھر میرے ساتھ لپٹ کے
بچّوں جیسی میٹھی نیند سو جاتا ہے

افتخار نسیم

میں اندھیرے سے ڈرتا ہوں

وہ رات کیسی تھی
جیسے ہم سب
ہزار صدیوں سے
اپنی اپنی نشست گاہوں میں جم گئے ہوں
کوئی ذرا گہرا سانس لیتا
تو خوف جسموں کے ان مساموں سے
بہہ نکلتا
پلک جھپکنے کی آہٹیں بھی
سماعتوں پہ گراں ہوئی تھیں
وہ ہول ایسا تھا
گر کوئی انگلیاں چٹختا
تو دل دھڑکنا ہی چھوڑ دیتا
ہمارے پاؤں تلے سے وقت
ایسے رینگتا تھا
کہ جیسے کوئی مریض خون دے رہا ہو
مگر جب اس رات کے اندھیرے سے
دن ہوا تو
ہر ایک نے دوسرے سے پوچھا
وہ رات کیسی تھی
رات کی ساعتوں میں پنہاں
وہ خوف کیا تھا

میرے بابا

میرے بابا
سب کہتے ہیں
میری شکل
آپ سے ملتی جلتی ہے
میری آنکھیں
میری پیشانی
میرے ہونٹ
میرا لہجہ
باتیں کرنے کا انداز
اُٹھنے بیٹھنے
چلنے پھرنے کا انداز
میرے ہاتھوں کی حرکت
سب کچھ آپ ہی جیسا ہے
میں نے سُنا ہے بیٹا باپ کی نسل کا
وارث ہوتا ہے
میرے ذہن میں ایک سوال اُبھرتا ہے
میں جو بالکل آپ پہ ہوں
تو پھر میری ترجیحِ جنس
آپ سے کیوں اس درجہ الگ ہے

* افتخار نسیم *

وسطِ عمر کا بحران

میں عمر کے ایک عجیب حصّے میں آ گیا ہوں
جہاں نہ کوئی حریمِ جاں
نہ عدوئے جاں ہے
نہ خطرۂ سود اور زیاں ہے
یہ دل ترازو ہے
جس کے پلڑے بس اک جگہ پر رُکے ہوئے ہیں
میں سارے پچھلے دنوں کی باتوں کو جانتا ہوں
میں آنے والے دنوں سے واقف
کہ میری چشمِ جہان دیدہ میں کوئی حیرانی اب نہیں ہے
یہ میرے بٹوے میں سب ممالک کی ریز گاری بھری ہوئی ہے
مگر ہے دل اک غریب کی جیب سے خالی
میں چلتے چلتے نظامِ شمسی کے ایسے نکتے پر آ گیا ہوں
جہاں پہنچ کے یہ میرا سایہ
ہزار رستوں پہ چل رہا ہے

قلبِ ماہیت

وہ بھی دن تھے
جب میں کونج قطار میں اُڑتے دیکھتا تھا
تو میں بھی ان کے ساتھ کہیں اُڑ جاتا تھا
اب یہ دن ہیں
جب میں کونج قطار میں اُڑتے دیکھتا ہوں
تو میرا ہاتھ مری بندوق پر آ جاتا ہے
مری رُوح کے ہر نہاں خانے کے راستے پر چلے گا
مجھے اپنے جھکر یہ کوئی کھوٹا
سجانے کی خواہش نہ باقی رہے گی
کہ اس عہدِ آشوب میں مجھ کو
کوئی سمجھتا نہیں ہے
کہاں ہے وہ جس کے لئے میں بنا سمت سفر کر رہا ہوں
کہاں ہے مرے راستوں کا مسافر کہاں ہے

ایک خط

تمہیں مجھ پر فخر ہونا چاہئیے ندامت نہیں

افتخار نسیم

۱۲ر مارچ ۱۹۹۲ء
شکاگو

پیاری بہن!

سلام!

امید ہے آپ بخیریت ہوں گی۔ پاکستان سے جلد ہی اور بغیر بتائے آنے کی معذرت چاہتا ہوں۔ (بہر حال سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔ مالی طور پر تھوڑا نقصان ہوا ہے (بزنس میں) وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا)

۱۲ر مارچ کو خط لکھ رہا ہوں۔ آج امّی کی برسی ہے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ ابا جی اور مرحومین کو بھی ۔۔ میں دعا گو ہوں۔

پرانے زمانے میں ایک رسم ہوا کرتی تھی کہ نو مولود لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے ۔۔ میں آج یہ سوچتا ہوں کہ وہ لوگ جو دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں بقول تمہارے ابنارمل ہوتے ہیں خدا نے یہ اختیار انہیں کیوں نہ دیا۔ لیکن یہ بھی اس کی کوئی مصلحت ہے ورنہ وہ تمام لٹریچر وہ تمام اچھی کتابیں دنیا میں کیسے وجود میں آتیں۔ یہ انہیں ملعون و مطعون لوگوں کا حصہ ہے جو معاشرہ کا ایک جزو نہ بن سکے اور مرنے کے بعد ان

کی تخلیقات کو مُجز دانوں میں لپیٹ لپیٹ کر رکھا گیا۔ میں نے جو انٹرویو دیا تھا وہ بالکل میرے دل کی آواز ہے۔ اب تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو بتا دیتا ہوں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دیکھو سچ بولنا کتنا مشکل ہے۔ میں وہی ہوں جس کو تم اَبنارمل کہہ سکتی ہو۔ نامکمل، راندۂ درگاہ اور گنہگار —— لیکن یہ مت بھولنا یہی راندۂ درگاہ جب اللہ کے حضور بیٹھ کر یہ سوال کرتا ہے:

سب ایک سے ہوتے ہیں تو میں سب سے الگ کیوں؟

تو اس کا جواب شاید اس کے پاس بھی نہیں ہوتا

بہن تم پندرہ سولہ سال کے کھاری کو ڈھونڈ رہی ہو تم نے اس وقت میری اذیت کو نہیں پہچانا تھا۔ میں کتنا تنہا تھا، میں کتنا اکیلا تھا۔ وہ وقت میں نے کیسے گزارا تھا۔ نوجوانی کے دریا کی آگ کو کیسے عبور کیا۔ یہ تو ایک بہت لمبی کہانی ہے لیکن جب اسی مغربی معاشرے کے ایک بزرگِ نیک نے مجھے بتایا کہ لنگڑا ہونا کوئی بری بات نہیں، ایک بازو والا ہونا یا ایک آنکھ والا ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ تم اسی کمزوری سے اپنے اندر ایک بہادر انسان کو جنم دو جو دنیا کے سامنے ڈٹ جائے۔ دنیا میں ہزارہا لوگ ہیں جو سب کا مقابلہ کر رہے ہیں ان میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ میرا امریکہ آنا ایک شعوری عمل تھا۔ مجھے علم تھا کہ میں شادی کی عمر میں داخل ہو رہا ہوں۔ میں امریکہ سے واپس جا کر کسی بھی لڑکی سے شادی کر سکتا تھا لیکن میں اسے دھوکہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ میرے کئی دوستوں نے ایسا کیا۔ وہ تمہاری نظر میں مکمل ہو گئے ہیں لیکن وہ جس عذاب میں مبتلا ہیں وہی جانتے ہیں اور ان کی بیویاں اور بچے کیا بتاؤں۔ اگر میری سچائی تمہیں تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے تو یہ سوچو کہ میں اپنے بچوں کے سامنے اظہار کرتا تو انہیں کتنی تکلیف ہوتی۔ میں کس منہ سے ان سے بات کرتا۔ ہر چیز کا چھپا دینا تم سب کے نزدیک بہت اچھا عمل ہو گا لیکن میں اسے منافقت سمجھتا ہوں۔ نہ تو میں نے کسی کے ساتھ بدفعلی کی ہے اور نہ ہی کسی نے میرے ساتھ —— اگر دو بالغ شخص اپنی مرضی سے کسی بھی رشتہ میں منسلک ہو جاتے ہیں تو

یہ ان کا عمل ہے اور انہیں اتنی آزادی ہونی چاہیئے۔ اگر اس اعتراف کے بعد تم میرا ساتھ نہ دو، بھائی جاننے سے انکار کر دو جیسے ظہیر نے کیا۔ تو میں تمہاری مجبوری سمجھتا کہ تمہیں ایک مکمل بھائی چاہیئے۔ تم ماں تو نہیں ہو۔ ماں ہوتی تو اپنے معذور بچے کو سب سے زیادہ پیار کرتی۔ ویسے میں معذور نہیں ہوں۔ خدا کا شکر ہے مجھے اس نے سب کچھ دیا ہے۔ دنیا بھر کے بچے میرے بچے ہیں۔ عورتیں میری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ہیں اور مرد میرے باپ، بھائی اور بیٹے ہیں۔ میں نے یہاں امریکہ میں کوئی جسمانی تلذذ کا اڈہ نہیں کھولا ہوا جو لوگ میرے مہمان ہوتے ہیں۔ وہ حیران ہوتے ہیں کہ میں نے اپنی پرائیوٹ لائف اور بزنس لائف میں اتنا توازن کیسے قائم کر لیا ہے۔ یہ صرف خدا کی دین ہے۔ مغرب میں ہر شخص شراب نہیں پیتا اور سور نہیں کھاتا لیکن جو شراب نہیں پیتا اور سور نہیں کھاتا وہ کوئی اعلیٰ و ارفع نہیں ہوتا۔ پاکستان میں بے تحاشا لوگ شراب پیتے ہیں اور حرام کا کھاتے ہیں لیکن وہ بھی خدا کے بندے ہیں۔ مغرب سے صرف اسی بات سے نفرت نہ کرو۔

"دوسروں کے بتوں کو برا مت کہو، کہیں وہ تمہارے خدا کو برا نہ کہیں۔"

ہر ایک باپ ان کے لئے قابلِ تقلید ہوتا ہے لیکن ہم میں سے کسی نے بھی ابا جان کی طرح زندگی کو نہیں گزارا۔ اشارا سمجھ گئی ہوگی۔ جہاں تک Gay Movement کا تعلق ہے پاکستان میں لوگ اس Movement کے نہ ہونے کی وجہ سے زلفی بن جاتے ہیں اور یہاں آکر انہیں لوگوں میں اس کی وجہ سے Self Respect اور Confidence پیدا ہو جاتا ہے اور وہ زندگی کی بڑی سے بڑی مہم کو سر کر لیتے ہیں۔ ان میں مزید انسانیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے رشتوں کا اقرار شروع کر دیتے ہیں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہر چیز چھپا چھپا کر کرتے ہیں جس سے لاتعداد برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لوگ بلیک میل ہوتے ہیں۔ کچھ نہ پوچھو۔

بہر حال بہن میں ایک عذاب سے گزر کر ایک پر سکون جنت میں داخل ہو چکا ہوں۔ اگر تم یہ چاہو کہ شادی کر کے تم لوگوں کا دوسرے لوگوں میں ناک اونچا کر دوں تو یہ

مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ اس لحاظ سے زلفی مجھ سے بہتر ہے جس نے بہت عرصہ پہلے ہی اپنے گھر والوں کو بتا دیا تھا۔

جمیل الدین عالی صاحب، شہزادہ صاحب، قاسمی صاحب، قتیل صاحب میری اسی سچائی سے متاثر ہیں۔

حیات احمد خاں اور ان کی پوری فیملی نے مجھ جیسے نامکمل اور راندۂ درگاہ کو سب جانتے بوجھتے ہوئے سینے سے لگایا ہوا ہے۔

جہاں تک میرے بیمار ہونے کا تعلق ہے بچپن سے لیکر اب تک کونسا میں صحت مند رہا۔ پھر امریکہ آتے ہی بارہ بارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد تمہارے خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ کیا یہ میری صحت مندی کی علامت نہیں ہے۔

مجھے علم تھا کہ پہلا پتھر مجھ پر میرے خاندان کی طرف سے آئے گا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تم بھی ظہیر کی بہن ہو۔ میں جان بھی دے دیتا تو میری لاش کی حالت اگر اچھی نہ ہوتی تو تم لوگ اس پر تھوک کر چلے جاتے۔

بہر حال میں پھر بھی آپ سب کا بھائی ہوں چاہے وہ نہیں ہوں جیسا آپ چاہتے ہیں۔ بارہ ہزار میل دور بیٹھ کر بھی اگر آپ کو میری وجہ سے شرمندگی ہوتی ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم ایسا کرو کسی بزرگ سے بات کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لینا۔ یہی سمجھ لینا کہ میں مر گیا ہوں۔ ظہیر نے بھی مجھے یہی کہا تھا۔ میری طرف سے تمہاری دل شکنی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت عرصہ پہلے معاف کر دیا ہے۔ میں بھی وہ نہیں ہوا جو میں چاہتا تھا لیکن اللہ میاں نے جیسا بنا دیا میں نے اسے قبول کر لیا اور بنی نوعِ انسان کی خدمت کرنے لگ گیا۔

میرے بارے میں فکر مند نہ ہونا۔ میں بیمار نہیں ہوں۔ صرف طبیعت ذرا حساس ملی ہے۔ گندگی اور گندا پن برداشت نہیں ہوتا اس لئے پاکستان آ کر بیمار ہو جاتا ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ میں آپ پر بوجھ بنتا ہوں اس کی معذرت چاہتا ہوں۔

میں نے انٹرویو میں گلو کا نام لیا تھا بد قسمتی سے میں نے گلو کہہ دیا جس کی

اسے شاید سمجھ نہیں آئی ہوتی حالانکہ وہ ناصر بشیر پہلے "عوام" میں تھا۔

تم نے اس شخص کی بوٹیاں نوچنے اور کتوں کے سامنے پھینکنے کا لکھا ہے، جس نے مجھے یہ راہ دکھائی ہے۔ تو بہن اس کے ساتھ لڑنے کے لئے ہمارے پاس بازو تو ہیں لیکن بہت چھوٹے ہیں۔ ہم اس کے ساتھ نہیں جھگڑ سکتے۔ صرف دعا مانگ سکتے ہیں ہیں۔ ان بازوؤں کی لمبائی اسی کام آسکتی ہے۔

تم دو بالغ لوگوں کی صحبت کو ابنارمل فعل کہہ رہی ہو۔ میرے نزدیک مرد اور عورت کا آپس میں بغیر ایک دوسرے کی مرضی یا معاشرے کے دباؤ کی وجہ سے اکٹھے ہونا ایک بدفعلی ہے۔

میری اذیت اور دکھ کا اندازہ تم اس بات سے کر سکتی ہو کہ میں عذرا کے ساتھ شادی کر سکتا تھا لیکن اسے میں دھوکا دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد میں بھی اس سے بے تعلق ہو جاؤں اور باہر اپنے لئے تسکین تلاش کرتا پھروں۔ اس "دہری زندگی" کے عذاب کا تمہیں علم نہیں۔ اسی بات کو دیکھو۔ جب تمہیں میری اصلی روش کا علم ہوا ہے تو تم نے میری تمام اچھائیاں بالائے طاق رکھ کر ایک فتویٰ صادر کر دیا ہے کہ دنیا کے وہ تمام لوگ جو شادی شدہ ہیں اچھے ہیں اور میرے جیسے سب برے۔

تم کیا چاہتی ہو ــــ میں تمام عمر جھوٹ کی زندگی گزار دیتا۔ چھپ چھپ کر گناہ کرتا (جو کام بھی چھپ کر یا کسی خوف سے کیا جائے گناہ ہے)۔ سچائی میں بہت قوت ہے انسان کو خوف سے نجات دلاتی ہے۔ میں اللہ کی عدالت میں ہر وقت کھڑا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر کسی کا دل نہیں دکھایا۔ انجانے میں ایسی حرکت ہو گئی ہو تو جی جان سے خدا سے معافی مانگ لیتا ہوں اور اس شخص سے بھی جس کا دل دکھایا ہو۔

بچپن سے ہی میں تم سب سے مختلف تھا ــــ اور اب بھی ــــ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں کہیں باہر سے لایا گیا تھا۔ میرے ماں باپ ہوتے تو ان سے پوچھ ہی لیتا کہ میری کوئی چیز آپ سب سے کیوں نہیں ملتی ــــ یا میں ایک ایسی روح ہوں جس نے تھدیوں

اندھیرے میں بھٹک کر اب کہیں سچائی کی روشنی پائی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں جیسا بھی ہوں مجھے قبول کر لو۔ لیکن یہ بھی نہیں کہ تم میری تمام اچھائیاں بھلا کر مجھے صرف ایک ابنارمل یا نامکمل یاد رکھو۔ تم بارہ تیرہ برس کے کھاری کو ڈھونڈتی ہو جو پانچ وقتی نماز پڑھتا تھا، روزے رکھتا تھا اور قرآن کی تلاوت کرتا۔ وہ کھاری اس اللہ سے اپنے "اچھا" ہو جانے کی دعا مانگتا تھا۔ وہ کھاری سمجھتا تھا کہ وہ بیمار ہے لیکن وہی کھاری جب بالغ ہوا۔ اس نے اپنی تیسری آنکھ کھولی تو دیکھا کہ وہ بیمار نہیں ہے معاشرہ انسان کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرتا ہے اور جھوٹ اس کو بیمار کر دیتا ہے، چنانچہ اللہ نے مجھے اتنی طاقت دی کہ میں سچ بول سکوں۔

خدا تمہیں غمِ حسین کے سوا کوئی غم نہ دے۔ میرے نامکمل ہونے کو دل کا روگ نہ بنا لینا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ وہ ہم میں سے نہیں تھا۔ ہم تو مکمل لوگ ہیں۔ ابا جی کہتے ہیں اسے باہر سے لائے تھے۔ ہم نے تو صرف پالا تھا۔ ہمارا کیا قصور ہے۔ اب وہ چلا گیا ہے۔ پردیس گیا مر گیا۔ ایک برابر کوئی اور بات کرو۔

یا کسی لڑکے کے چہرے پر اداسی اور پیلاہٹ دیکھنا تو اس سے نفرت نہ کرنا کہ وہ عمر کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔ اسے ضرور کوئی روحانی دکھ ہو گا۔

کوئی نوجوان لڑکا ہر وقت کتابوں میں ڈوبا رہے تو اس سے اس کا سبب مت پوچھنا۔ کسی صحت مند لڑکے کو ہر وقت غصہ آتا رہے تو اس کا تجزیہ کرنے مت بیٹھ جانا۔ کسی کالے کلوٹے سوکھے سڑیل لڑکے کو خاندان والے IGNORE کرتے ہوں تو تم اس کے پاس ضرور تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جایا کرنا۔

کسی کمزور چھوٹے بھائی کو اس کا بڑا بھائی مسلسل مارتا پیٹتا رہتا ہو تو اس بڑے بھائی کا ہاتھ مت روکنا۔ شاید ہاکی اسٹک کی ایک ضرب چھوٹے بھائی کو اس کی زندگی کے عذاب سے نجات دلا دے۔

کسی بچے کی ٹانگ پر چنبل نکل آئے تو اسے حکیموں، ڈاکٹروں اور جگہ جگہ طبیبوں کے پاس لے کر نہ جانا۔ شاید یہی روگ اسے تمہارے رستے پر چلنے پر مجبور کر دے۔

کسی بھوکے بچے کو روٹی کھاتے مت دیکھا کرنا کہ وہ خود اپنی اشتہا ہے، نادم ہوتا ہے۔
روٹی کی بھوک جانے کس کمی کا متبادل ہوتی ہے۔

کبھی اس جیبا لڑکا بڑا ہو کر تمہارے گھر میں آ کر گیس کا ہیٹر جلا کر سوئے تو اس کو سوتا دیکھ کر ہیٹر مت بند کر دینا۔ شاید یہ گیس ہی اس کی نجات کا آخری راستہ ہو۔

کبھی پردیس سے آنے والا تمہیں ملے تو اسے مت بتانا کہ میں بھی وہیں رہتا ہوں کہ میرے سچ کو ساری دنیا جانتی ہے۔

کبھی میرے مرنے کی خبر ملے تو کسی ملنے والے کے گھر چلی جانا۔ ان سے اپنی اداسی کا سبب یہ بتانا کہ تمہارا کوئی ملنے والا فوت ہو گیا۔ وہ مرنے والے کے بارے میں پوچھیں تو خوب جھوٹ بولنا۔

مجھے جاننے والے تمہارے پاس افسوس کے لئے آئیں تو کہہ دینا میں تو تمہارے لئے بہت پہلے کا مر چکا ہوں۔ مجھ سے چاہے نفرت کرنا لیکن ایک کلاس کے ساتھ۔

اگر میرے مرنے پر تمہیں رونا آ جائے تو اونچی آواز میں مت رونا کہ ہمارے گھروں میں کوئی زور سے روتا اور ہنستا نہیں ہے۔ اگر میرے بچپن کے دوست آئیں تو انہیں دروازہ سے واپس کر دینا۔

کسی اداس سرد شام کو کسی بلی کو دروازے کے باہر بیٹھے دیکھنا تو اسے دودھ ضرور پلا دینا۔ تم تو جانتی ہو کہ مجھے ان سے کتنا پیار ہے
زلفی سے نفرت مت کرنا۔

میرے مرنے کے بعد اگر کوئی شخص تمہارے پاس میری بھیجی ہوئی چیزیں یا تمہارے لئے تحفے لائے جو میں نے خاص طور پر تمہارے لئے خریدے تھے۔۔۔ تو اسے چائے ضرور پلا دینا۔ میرے بارے میں باتیں کرنا۔ میرے بچپن کی۔ میرے اسکول ڈیز (DAYS) کی۔ میری تقریروں کی، پہلی غزل کی، کالج کے مشاعروں کی۔ پھر امریکہ چلے جانے کی۔ اسے ہمارے بچپن کی البم دکھانا۔ وہ اس دوران میں آبدیدہ ہو جائے تو حیران مت ہونا۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دینا۔ اس کے سامنے دفترِ شکایت مت کھول دینا۔ تمہیں علم نہیں وہ شخص کتنا دکھی ہے۔۔۔ گڑیا، نومی اور ان کے بچوں کو میرے بارے میں نہ بتانا۔ ظہیر اور زیدی، اگلو ننھا اور ان کے بچے کافی ہیں۔

ابّا جان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور پھول چڑھانے جاؤ تو ایک آدھ پھول میری جانب سے رکھ دیا کرنا۔ جانے اس وقت میری قبر برف کے اندر دبی ہو۔

کسی اخبار یا رسالے میں میری کوئی چیز چھپی ہوئی دیکھنا تو صفحہ الٹ دینا۔ میرے تمام دوست بچپن کے اور اب تک جو ہیں انہیں ابنارمل یا نامکمل مت سمجھنا۔ میں نے جو راہ متعین کی ہے ان میں کوئی اس کا کوئی ذمہ دار نہیں ہے۔ اپنے اعمال کا میں خود ذمہ دار ہوں اور یہ راہ مجھے میرے پیدا کرنے والی نے دی ہے کہ ہر چیز اسی کی طرف سے آتی ہے اور ملتی ہے اور واپس چلی جاتی ہے۔ مجھے بچپن سے ہی اپنے بارے میں علم تھا۔ مجھے کسی نے نہیں "بگاڑا" اسی لیے میں نے اپنی زندگی، اپنی پڑھائی، اپنے روزمرہ ایک PLAN کے ساتھ مرتب کیے۔ میری اس زندگی نے اگر تم سب کی خدمت گزاری یا بھائی ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں کوئی کوتاہی کی ہو تو لکھو۔ تم نے میری ایک "سچائی" کی وجہ سے میری تمام خدمتوں اور تمام اچھائیوں کو بھلا دیا۔ اپنے اردگرد نظر دوڑاؤ۔ کتنے لوگ تو ہیں میری طرح لیکن ان کے گھر والوں نے تو انہیں ایسے نہیں دھتکار دیا جیسے تم نے کیا ہے۔ اگر میں ہیجڑہ ہوتا، گلیوں گلیوں ناچتا پھرتا تو بہتر تھا۔ میرے نزدیک وہ لوگ بہت زیادہ عظیم ہیں۔ کم از کم انہوں نے قدرت نے جو ان کے ساتھ مذاق کیا ہے اسی طرح اس کو لوٹا دیا ہے۔

"کنجری بن میری عزت نہ گھٹ دی چنوں ریخ کے یار منا دن دے"

یہ بھی قدرت سے احتجاج کا ایک طریقہ ہے جسے میں نے اپنی نظموں میں معاشرے سے کیا ہے۔ میں اپنے اس دکھ، اس اکلاپے کو لے کر ایک راز کی طرح کیسے مر جاتا۔

ایڈز صرف GAY بیماری نہیں ہے۔ یہ پورا انسانی المیہ ہے۔ اس میں NON GAY بھی شامل ہیں لیکن امریکی پروپیگنڈا نے اسے GAYS پر تھوپ دیا۔ اب اس کے اثرات اور وجوہات کا علم ہو رہا ہے۔ کمزور ہونا اتنی بری بات ہے کہ ہر الزام کمزور پارٹی پر تھوپ دیا جاتا ہے۔ کوئی GAY ہو یا NON GAY اس بیماری کو DESERVE نہیں کرتا۔ ایسی بات کہنے سے پہلے خدا کے خوف سے چپ ہو جاؤ۔ میں کسی GAY MOVEMENT سے متاثر نہیں ہوا۔ میں تو دنیا میں باعزت رہنا چاہتا ہوں۔ میں جیسا بھی ہوں جو زندگی میں نے

پہلے گزاری تھی وہ جھوٹ تھی۔ کسی اور کی زندگی تھی۔ اب میرے "سچ" کی زندگی شروع ہوئی
خدا کا شکر ہے کہ یہ پتھر میرے سینے سے ہٹ گیا ہے۔

میں نے زندگی میں کبھی جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولا۔ اب میری "سچائی" اگر تمہاری IDEAL نہیں ہے تو اس کا گلہ مجھ سے نہیں خدا سے کرو۔ اب میں تمہیں یہاں یہ بتانے نہیں لگ جاؤں گا کہ دنیا میں کتنے باعزت لوگ میرے جیسے تھے۔ ہر ایک کے اعمال ان کے ساتھ ہیں۔ میرا گے (GAY) ہونا اگر المیہ ہے تمہارے نزدیک تو میں اسے اپنی زندگی کا المیہ نہیں بننے دوں گا۔ میں باعزت اور سر اونچا کرکے زندہ رہوں گا اور تمہیں بھی یہی مشورہ ہے کہ میری وجہ سے کبھی کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہونا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں لیکن اب میں بھی زندگی کے سامنے کھڑا ہو گیا ہوں۔ تمہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ کسی نے آکر تمہیں یہ نہیں بتایا میں نے خود دنیا بھر کے سامنے اعتراف کیا ہے۔

اب مجھ سے جھوٹ کی زندگی نہیں گزاری جاتی۔

میں MEDIOCRE زندگی گزارنا نہیں چاہتا۔ میرے "سچ" نے مجھے بہت نقصان بھی پہنچایا ہے لیکن وہ بنیادی تھا۔ آخر میں نے اپنے آپ کو قبول کرکے اپنے آپ پر فتح پالی ہے۔

تمہیں مجھ پر فخر ہونا چاہیئے۔ ندامت نہیں۔

تمہارا

افتخار نسیم

اردو افسانوں میں

لیسبئن ازم

ڈاکٹر ش۔ اختر

ہم جنسی محبّت کی تاریخ انسانی ارتقاء کی تاریخ ہے۔ یہ کسی ایک قوم کی خصوصیت نہیں رہی، بلکہ تمام بنی نوع انسان کی ایک ایسی کمزوری رہی ہے جسے گناہ، اخلاقی زوال اور بدکاری کی بدترین مثالوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ لیکن ہر دَور میں صاحبِ خرد اس کے شکار رہے ہیں۔ اس فہرست میں اولیائے دین، صوفیائے کرام، معلّمِ اخلاق، رہبرانِ دین و مذہب، شاعر و ادیب، اساتذہ کرام سبھی شامل ہیں۔ حتیٰ کہ کلام پاک میں بھی گوری اور بادامی آنکھوں والی عورتوں کے ساتھ غلمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا تعلّق آوارگی اور اخلاقی بدکاریوں سے نہیں ہے۔ مشہور ماہرین جنسیات اسے زیادہ سے زیادہ ایک غلطی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ امر بھی بحث طلب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر زمانہ کا ایک الگ اخلاقی مزاج ہوتا ہے۔ اس کی اخلاقی قدریں ہوتی ہیں مگر ضروری نہیں کہ ان تمام اخلاقی اقدار کو ہر شخص مِن و عَن تسلیم کر لے، خاص کر جب وہ جامد شئے نہیں ہو۔ ابھی بھی قبائلی زندگی میں جنسی مباشرت کوئی خراب فعل نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں ایک لڑکی کئی افراد سے جنسی تعلّقات رکھتی ہے۔ شادی کے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی۔ اگر وہ ایسا کرتی ہے تو اس کا ردِ عمل بھیانک نہیں ہوتا۔ یہ Preventine Communism کی بھی خاصیّت تھی۔ خود ہندو دیو مالا میں اس کی بہت سی کہانیاں ملیں گی۔ دروپدی ایک

عورت تھی لیکن اس کے پانچ شوہر تھے، اس لئے انسانی ارتقاء کی کہانی کا مطالعہ جنسی رشتہ کی اہمیت اور نوعیت کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ مرد و عورت بنیادی طور پر Polygamy ہوتے ہیں۔ چونکہ معاشرہ لاکھوں برسوں سے مردوں کے قبضۂ قدرت کی کہانیاں جنم دیتا رہا ہے اس لئے عورت اور مرد کے درمیان جنسی امتیازات کی بھی ایک بڑی واضح لکیر کھینچ دی گئی ہے۔ ماہرینِ نفسیات نے مرد کو Pologomy ثابت کیا اور آج بھی کر رہے ہیں لیکن عورت کے سلسلے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ چونکہ سماج میں آج بھی مرد کی حیثیت عورت سے زیادہ ہے اور عورت ان پر معاشی، سماجی، سیاسی اعتبار سے منحصر ہے۔ خاص کر پس ماندہ ملکوں کی عورت۔ اس لئے تجزیہ کرتے وقت بھی فرد کا ذہن تعصب کا شکار رہتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ نفسیات کام کرتی ہے کہ وہ عورتوں کے لئے الگ اخلاقی قواعد و نکات کا حامی بنے۔ ایک سوشلسٹ نظامِ حیات میں اس کی گنجائش نہیں کہ وہ دو اخلاقی اقدار کی تشکیل کو ترجیح دے۔ جس دن ہمارے یہاں بھی سوشلسٹ نظامِ حیات کا خاتمہ ہو جائے گا عورت اور مرد کے لئے ایک ہی ضابطۂ اخلاق پر عمل ہوگا۔

ہم جنسوں کی محبت کے سلسلے میں ایک اور لفظ لوگوں کو کہتے سُنایا گیا ہے اور شاید یہ سب سے زیادہ مہذب اظہارِ نفرت ہے۔ یہ لفظ ابنارمل ہے یعنی غیر معمولی۔ یعنی مرد کا مرد کے ساتھ جنسی تعلقات قائم رکھنا ایک غیر فطری، غیر معمولی بات ہے۔ شاید یہ لفظ دانش مندوں کو اپنی پناہ گاہ میں چھپالے کیونکہ وہ بھی اپنے زمانہ میں ابنارمل ہوتے ہیں۔ دانش مند خواہ وہ علم وفن کی کسی شاخ پر بیٹھے ہوں اپنے زمانے کے مزاج سے الگ اور اونچے ہوتے ہیں۔ ان کا اندازِ فکر، ان کا علم، ان کا تخیل سبھی آنے والوں کے لئے اہم ہوتے ہیں۔ وہ زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ جاتے ہیں اسی لئے اگر وہ ہم جنسی محبت میں مبتلا ہیں تو شاید انہیں ہم معاف کر دیتے لیکن ہماری یہ معافی اس گتھی کو حل نہیں کرپاتی کہ آخر یہ رُجحان یہ عمل غیر فطری یا گناہِ کبیرہ کے دائرہ میں کس طرح شامل ہو جاتا ہے۔ انسانی تہذیب کی تاریخ میں جنسی لذت کی تکمیل کی اس شکل و صورت کو خاص اور اہم مقام حاصل تھا۔

پانچویں صدی میں ایتھنس کے شرفاء میں ایک اعلیٰ قدر کے درجہ سے تجاوز کر چکا تھا، مگر سماج کی بڑی اکثریت اِسے برابر ناپسندیدگی اور نفرت کی نظر سے دیکھتی رہی۔ بہت سے کم علم لوگ تو اب بھی غیر علمی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیتے ہیں، وہ ملوّث افراد کو لُوطی کہہ کر پکارتے ہیں اور سماج میں اسے شیطنت کی تبلیغ کا پرچارک تصور کرتے ہیں۔

اس کی بھی نفسیاتی وجہ ہے۔ انسان ہر شئے کو خوف اور شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا ہے جو نئی ہو، یا اس کی دُنیا میں اسے غیر فطری معلوم ہوتی ہو۔ پر وہ علم جو نئی نسل اپنے بزرگوں کے بعد حاصل کرتی ہے، عتاب کا باعث بن جاتا ہے۔ کائنات کی ہر سچائی دُنیا آسانی سے قبول نہیں کرتی۔ وہ ان تمام خارجی مظاہر سے ڈرتا ہے، جس کی تاویل کرنے سے اس کا ذہن قاصر رہتا ہے، یا جو ان کے افکار وعقائد کے شیشوں کو چکنا چور کر دیتا ہے۔ اس کا بڑا سبب ہے کہ انسان کے خیالات کی تبدیلی کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔ وہ دو مقام پر خوف وہراس کا شکار برابر ہوتا ہے۔ ایک کشمکش اس کی اپنی داخلی ہوتی ہے (شعور اور لاشعور)۔ اس کشمکش سے اگر اسے آزادی مل بھی جاتی ہے تو وہ سماج میں اظہار کی جرأت نہیں رکھتا۔ یہ دو انسانی کمزوریاں سماجی، سیاسی اور سائنسی زندگی میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ابھی بھی ایسے حضرات کی کمی نہیں جو چاند کے سفر کو غلط تصور کرتے ہیں، ایسا اس لئے ہے کہ کائنات کی تخلیق اور فطرت سے وابستہ سینکڑوں برسوں پُرانے عقائد کے بت ٹوٹنے لگتے ہیں، اور یہ ہر آدمی اپنے دل میں محمود غزنوی کی بُت شکنی کا حوصلہ پرورش نہیں کرتا۔ اسی لئے کسی غیر فطری فعل کے تجربہ کی قیمت دینے کے لئے بھی تمام ذہن یکساں طور پر تیار نہیں ہوتے۔ چہ جائیکہ سیکس جیسے موضوع پر سائنسی اندازِ نظر اختیار کرنا لیکن دنیا کی دوسری زبانوں میں اسے جس نقطۂ نظر سے دیکھا جا رہا ہے، اور اس کے مطالعہ میں علمی سنجیدگی پائی جا رہی ہے، وہ اُردو والوں کے لئے باعثِ رشک ہونا چاہئے۔ البتّہ یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ۵۰ - ۴۸ کے لگ بھگ امریکہ میں ایک خاص طبقہ کے افراد ہوموسیکس کے نام سے اسی طرح بھڑکتے تھے جیسے کمیونسٹوں سے۔ یہاں تک کہ State Deptt. کو کمیونسٹوں کی طرح ہوموکی بھی تلاش رہا کرتی تھی۔

(Sex and the adolescent
Maxine Dans Page - 59)

مگر اب مغربی ملکوں کی حالت اس کے برعکس ہو گئی ہے۔ خود لندن کی جنسی زندگی میں ہومو کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے۔ بہت سے ہندوستانی نوجوان جو روزگار کی تلاش میں اس مغربی ملکوں میں ایک غیر حقیقی اور غیر علمی ذہن کا تصوّر لے کر جاتے ہیں ایسے قحبہ خانوں میں اپنی زندگی کے چند دن گزارنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں جہاں اپنی فاعلی اور مفعولی دونوں حیثیتوں میں اپنے آپ کو پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں اکثر معقول لوگوں کو یہ بھی کہتے سُنا گیا ہے کہ یہ ایک ایسی بیماری ہے جو بچہ اپنے خاندان سے وراثت میں پاتا ہے، لیکن یہ بہت ہی غلط تصوّر ہے، یہ کوئی چھوا چھوت کی بیماری بھی نہیں ہے۔ ایسا مرض بھی نہیں جو نسل در نسل پرورش پاتا ہے، یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ہومو میں دوسری جنس کے ہارمونس کی تخلیق کی رفتار زیادہ ہوتی ہے۔ عورتوں اور مردوں دونوں کے درمیان جنسی ہارمونس کی پیدائش ان کے جسم میں ہوتی ہے، اس لئے طبعی اعتبار سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا اور نہ ان کی کمی یا زیادتی ہی اس فعل کے مرتکب ہونے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ہومو پیدائشی طور پر جنسی اعتبار سے کسی خرابی کا شکار نہیں ہوتا۔ گریس کے دورِ زرّیں میں بھی اس کا رواج تھا اور ایک خاص طبقہ کے لوگ فخر و مباحات کے لہجہ میں ذکر کیا کرتے تھے یہاں تک کہ سقراط نے بھی اسے بہت زیادہ سراہا ہے۔ تمام دیو مالائی تاریخی ہیرو اور تہذیبی اور علمی رہبروں نے اس کی سرپرستی کی ہے لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اسے عوام الناس نے کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ یہ بیسویں صدی کا کرشمہ ہے کہ اس کی ابتداء، نوعیت اور اسباب و علل کا غیر جذباتی اور معروضی نقطۂ نگاہ سے تجزیہ کیا جارہا ہے۔ ہماری جنسی زندگی کا یہ وہ پہلو ہے جس کے لئے آج سے زیادہ سازگار ماحول اور کھلی فضا کبھی نہیں تھی۔ ایک ڈاکٹر مریض کو آپریشن ٹیبل پر اس لئے نہیں لٹاتا کہ اس کے عریاں جسم سے اپنی جنسی تشنگی کی تکمیل کرے ۔۔۔ اس طرح شعر و ادب کے سنجیدہ ناقدوں کا بھی یہ فرض یہ ہے کہ وہ اس نازک اور بے حد

سنجیدہ موضوع کو اپنے فکر و نظر کے حصار میں لانے سے قبل تمام تعصّبات اور ذہن کی کثافتوں کو دھو دیں تاکہ سچّائی کی تلاش میں رہ کر صحیح راہ پر پہنچ سکیں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ادب اور آرٹ کی دُنیا میں جنس کو اوّلیت حاصل ہے اور عام طور پر حُسن و عشق کے اسرار و رموز کی دُنیا عورت و مرد کے پیکروں میں ملبوس نظر آتی ہے مگر ان پیکروں میں ہمیں ایسا محبوب بھی ملتا ہے جو مخالف جنس کا نہیں ہوتا بلکہ ہم جنس ہوتا ہے۔ فارسی اور اُردو شاعری میں اس کی بڑی مستحکم روایت ہے۔ اکثر ترقی پسند ناقدوں نے محبوب کے مذکر استعمال کی یہ تشریح کی تھی کہ جاگیردارانہ دَور میں عورت کی دو ہی حیثیت تھی۔ یا تو وہ چراغ خانہ تھی یا بالاخانہ کی زینت۔ اس لئے شعر و ادب میں اس کی شکل بدلی ہوئی ملتی ہے۔ یہ تشریح نہ درست ہے نہ قابلِ قبول۔ یہ صرف فارسی روایت کا اثر بھی نہیں بلکہ خود انسانی زندگی کی یہ ایک ایسی نمایاں کمزوری رہی ہے جس کا اعتراف کرنا بھی حقیقت ہے۔ اردو کے تمام کلاسکی شعراء کے یہاں ایسے اشعار آسانی سے مل جاتے ہیں جن میں لڑکے سے اظہارِ محبّت کیا گیا ہے، یہی نہیں بلکہ ادبی تاریخ کا مطالعہ تو یہ بھی بتاتا ہے کہ اس سلسلہ میں کئی شاعروں نے جامِ شہادت بھی نوش کیا۔ ادب کی عظیم شخصیتیں جن میں غالب بھی شامل ہیں، اس غیر فطری جنسی تکمیل کے خواہاں رہے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں کہ پہلے عورت تک رسائی آج کی طرح آسان نہیں تھی، بلکہ آج بھی فراق گورکھپوری کی کمی نہیں، جن کے پاس اس کا ایک فلسفیانہ جواز ہے، جو خود بھی غیر معمولی صلاحیتوں کے تخلیقی فنکار ہیں اور جنہیں ہر شخص عام ذہنوں میں بے حد مہذّب اور شائستہ تصوّر کرتا ہے اس لئے یہ درست نہیں کہ اسے ہم غیر ملکی ادب کے تاثرات کا ردّ عمل تصور کریں۔ البتہ یہ درست ہے کہ اُردو کی کلاسکی شاعری پر فارسی کے اثرات ہیں اور اپنی کمزوریوں کے ساتھ موجود رہی لیکن جنسی تشنگی کی تکمیل کا یہ طریقہ نقالی کی شکل میں نہیں اُبھرا ہے۔ یہ ایک جبلّت ہے اور یہ سبھی جانتے ہیں کہ جنس ایک ایسی سنجیدہ جبلّت ہے جس کی تشریح بہت مشکل ہے۔ ایک شخص پیچیدگیوں کے اتنے گنجلک دھاگوں میں بندھا ہے کہ اس کا سرا ڈھونڈھنا

مشکل ہے۔ دُنیا کی ہر قوم کی تہذیبی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس کے نمایاں افراد نے
اس میں دلچسپی لی اور وہ صحیح الدماغ تھے۔ وہ نہ تو زمانہ وحشت کے یادگار تھے اور نہ
ان کی فکر میں کسی تنظیم کی کمی تھی اس لئے نہ صرف عملی زندگی میں وہ اس میں ملوث رہے
بلکہ اپنی تخلیقات میں اسے ایک جمالیاتی پیکر کے طور پر تراشا اور اسے حسن کے وسیع
ترین فلسفہ کے حصار میں لے آئے جہاں ذاتی وجدان اور آسودگی راحتِ قلب کے نام
سے یاد کیا۔ یہی نہیں بلکہ ستم ظریف صوفیوں نے اس کثافت سے لطافت کی تحریک
نکالی اور اسے بھی عرفان حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بتایا اور یہ بہانہ بھی پیش کیا کہ
خوبصورت افراد اور حسین چہروں کو پروردگار عالم بھی دوست رکھتا ہے۔ یہ منطق
عدالتِ عالیہ کے تصوّرات کے برعکس ہے اور اپنی کمزوریوں کی پردہ پوشی کے لئے
ایک مضبوط آفاقی اور ہمہ گیر شخصیت کے سہارے کی تلاش بھی ہے، اس سلسلہ
میں ادیبوں، شاعروں اور دوسرے فن کاروں نے جو وجہیں بیان کی ہیں، وہ آج
سہل معلوم ہوتی ہیں، بلکہ یہ خیال البتّہ غور طلب ہے کہ زمانہ قدیم میں جب عورت
اور مرد دونوں ایک مخلوق میں ضم تھے تو جنس کے اتصال کی شکل دوسری تھی، مگر جب
یہ ایک ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تو ان میں پھر سے ایک ہونے کی ناکام خواہش
مختلف جنسی اعمال و افعال کی شکل اختیار کرتی ہے جس کی ایک شکل ہم جنسوں کی
محبت ہے۔ مگر یہ بھی عقلی امکانات کے دائرہ میں نہیں آتا۔ اس حقیقت کے اسباب
و علل کی دریافت موجودہ صدی کا علم نفسیات ہی دے سکتا ہے۔ نفسیات فاسدہ
کا مطالعہ ہی سودمند ہے، ورنہ اخلاقیات کی ضخیم جلدیں اور مذاہب کے واعظ اس کی
تشریح و تجزیہ سے قاصر ہیں بلکہ ان کے مبلّغین اور پیروکار تو اس کے شکار رہے ہیں۔
اس سلسلہ میں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ دُنیا کی بہت سی عدالتوں نے اس میں مبتلا
افراد کو جو اپنے زمانہ کے بہترین ذہین سورما کہتے ہیں، سخت سزائیں دی ہیں (آسکر وائیلڈ)۔
مگر اب تو عدالتِ عالیہ اور سرکار پر تحریک کی شکل میں دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ اسے جرم
کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ یورپ میں کئی شخصیتوں نے جلوس کی شکل میں پارلیمنٹ

کے سامنے اپنی حیثیتوں کو واضح کیا۔ یہی نہیں بلکہ عدالت نے ایک شخص کو اس کی درخواست پر اپنے ہم جنس کے ساتھ ازدواجی زندگی گذارنے کی اجازت بھی دی۔ بہر حال اس طرح کی ازدواجی زندگی سے نہ تخلیق ہوتی ہے اور نہ نسلِ انسانی فروغ پاتی ہے مگر جب ادب اور آرٹ میں ان کا ظہور ہوتا ہے تو ان جنسی رُجحانات کی نوعیت اور اسباب وعلل کی طرف ہماری نگاہیں ضرور اُٹھ جاتی ہیں۔ ایک شخص اپنی نجی جنسی زندگی میں تکمیل کی کوئی سی راہ نکالتا ہے، ادب کے ناقد کے لئے اس وقت تک اہمیت حاصل نہیں کرتا جب تک اس کا عمل کسی نہ کسی ادبی فارم میں سمٹ کر ہماری توجّہ نہ کھینچ لے۔ شاعری میں جب معشوق لڑکا ہوتا ہے تو لا محالہ آپ اس کی تشریح اور تفصیل میں گم ہو جاتے ہیں کیونکہ ادب میں جمالیات کی بہت زیادہ جگہ ہے اور جمالیات حُسن کے وسیع ترین فلسفہ کا احاطہ کرتی ہے۔ اب جب حُسنِ لطیف ذوقِ کثیف کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے تو ایک ایماندار ناقد کو اپنی آنکھیں بند کر لینے کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیئے۔ ابھی تک کائنات کی بہت سی چیزیں عقل انسانی کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ یا وہ ان کا صحیح تجزیہ نہیں کر پایا ہے لیکن وہ برابر حقیقت کی کھوج میں لگا ہوا ہے، اس لئے ادب میں ہم جنسوں کی محبّت اور ان کے اظہار کا مسئلہ بھی خاصا دلچسپ اور غور طلب ہے کیونکہ یہ صرف مردوں کی دُنیا تک محدود نہیں۔ میں اپنے اعداد وشمار کی روشنی میں اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ عورتوں میں ہم جنسی محبت تقریبًا سو فیصدی ہے۔ اسے انگریزی میں لسبین (Lesbianism) کہتے ہیں، ایک عورت کا دوسری عورت سے، یا ایک لڑکی کا دوسری لڑکی سے اسی طرح وارفتگی سے عشق کرنا جس طرح وہ مخالف جنس سے کرتی ہیں، حیرت کی بات نہیں ہے۔ ممکن ہے اُردو قارئین کے لئے یہ انکشاف کا سبب ہو لیکن یہ حقیقت مسلّم ہے۔ جتنے بھی ماہر نفسیات ہیں سبھوں نے اس کی شہادت دی ہے۔ ہولدک اینلس نے تو کہا ہے کہ مردوں میں ۶۰ فیصدی اور عورتوں میں ۹۹ فیصدی عمر کی کسی نہ کسی منزل میں ہم جنسی محبّت کی شاہراہ سے گذری ہیں۔ البتّہ مردوں کے متعلق قدیم زمانے سے اس کے وجود کا سُراغ لگایا جاتا ہے۔ مرد وعورتوں کے سلسلہ

میں یہ بات واضح ہوگئی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عورت کو جنسی زندگی میں مرد نے صرف معمول کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ انسانی تاریخ کی مختلف منزلوں میں عورت برابر مردوں کی شہوانیت کا مرکز بنتی رہی ہے۔ اس کی تمام خوبیاں، دلکشیاں اور اس کا سارا جسمانی حسن ایک صاحب نظر کے لئے۔ مردوں کے اس تصورِ عورت نے خود عرصہ دراز تک عورت کو اپنی اصل، روح اور حقیقت کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔ دورانِ مباشرت وہ ممکن ہے، تلذذ چاہتی رہی ہو، لیکن اس نے ہمیشہ اپنے آپ کو سپردگی کے غلاف میں سمٹے دیکھا۔ کبھی کبھی تاریخ میں چند غیر معمولی شخصیتیں اگر دکھائی دیتی ہیں تو وہ بھی زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر فعالیت کی طلبگار نظر آتی ہیں۔ عورت کو اپنی جنسی تشنگی کی تکمیل کا ذریعہ سمجھنا حقِ آدم تصور کیا گیا ہے مگر انیسویں اور بیسویں صدی نے جہاں ذہن کے بہت سے جالوں کو صاف کر کے علم کی روشنی پھیلائی، وہاں یہ احساس بھی جاگا کہ عورت بھی مرد کی طرح پہلے انسان ہے۔ اس کی خواہشات ہیں، اس کے پاس بھی محبت کرنے والا ایک دل ہے۔ تمناؤں اور حسرتوں کی دنیا ہے۔ وہ بھی عقلی اعتبار سے مردوں کے برابر ہے، وہ بھی ایک تخلیقی ذہن کی مالک ہے۔ اس کی تخیلات کی دنیا بھی بلند پرواز ہے، اور وہ بھی جنسی لذتوں سے ہمکنار ہونے کی جبلتوں سے محروم نہیں اور دورانِ مباشرت وہ صرف سپردگی کی ایک متحرک دیوی نہیں بلکہ اس میں بھی فعالیت کے جوہر ہیں جنہیں وہ اپنی خواہشات اور جذبات کی جداگانہ نوعیت کے اعتبار سے دکھا سکتی ہے۔ اس خیال کو بیسویں صدی میں عورتوں کی معاشی، سماجی اور سیاسی آزادی نے بہت تقویت پہنچائی اور جیوں جیوں L. M کی تحریک ساری دنیا میں اپنی جڑیں مضبوط کرتی جارہی ہے۔ یہ تصور مہمل قرار پاتا جارہا ہے کہ مرد فاعل کی حیثیت رکھتا ہے اور عورت مفعول کی۔ حالانکہ فرائڈ کے مطابق عورت میں احساس کمتری کی وجہیں فطری ہیں، وہ عورت کو ایک کمتر درجہ کی مخلوق سمجھتا ہے اور عورتوں میں ہم جنسی محبت کی تشریح کرتے وقت اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آڈی پس کمپلکس کا ایک ردِ عمل ہے۔ لڑکی بچپن میں اپنے باپ سے قریب تر ہوتی ہے اور ماں کے لئے وہ اپنے دل میں ایک طرح کا جذبۂ رقابت محسوس کرتی ہے۔ اس احساس کو زائل کرنے کے لئے وہ باپ کی طرف رجوع ہوتی ہے مگر جلد ہی

وہ یہ دیکھتی ہے کہ اس کا باپ اس کی ماں کی طرف مائل ہے۔ محبّت کی اس پہلی ناکامیابی میں اس کے غم و غصّہ کی کوئی حد نہیں ہوتی اور وہ اپنے آپ ہی باپ کی صفات تلاش کرنے لگتی ہے اور یہی وہ منزل ہے جہاں پہلی بار وہ دوسری لڑکی کی طرف بطور مرد راغب ہوتی ہے۔ یہ دوسری لڑکی یا عورت Bi Sexual ہوتی ہے۔ یہیں اسے طمانیتِ قلب محسوس ہوتی ہے۔ اس کا غصّہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ Lesbian بن جاتی ہے۔ فرائڈ اپنے اولین زمانہ میں آدمی کو Bisexual ہی تسلیم کرتا تھا لیکن بعد میں اس نے اپنے مشہور مضامین Three essays میں اس کی مزید وضاحت کی اور یہ بتایا کہ لڑکیوں میں Clitoris کی موجودگی انہیں Litteman کا احساس دلاتی ہے۔ Clitoris کی یہی موجودگی لیسبین ازم کو سمجھنے میں مدد دے گی۔ کیونکہ بچپن سے جوانی تک ایک لڑکی جس قسم کی ذہنی پیچیدگیوں سے گذرتی ہے وہ سب اس 'مختصر آدمی' سے چپکی ہوتی ہیں۔ بڑی ہو کر 'مختصر آدمی' کے اس رول کو لڑکیاں بھول جاتی ہیں اور جب اس کی گود میں ایک بچّہ آجاتا ہے تو یہی بچّہ بقول فرائڈ Penis Child ہو جاتا ہے۔ خواہشات کی یہ تبدیلی لاشعور سے شعور کی ایک طویل اور صبر آزما جنگ کے بعد رونما ہوتی ہے۔ فرائڈ کا یہ بھی تصوّر ہے کہ جب عورت کسی لڑکے کو جنم دیتی ہے تو اسے Penis کی محرومیت کے تصوّر سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے اور اس طرح مختصر آدمی' ایک زندہ اور جیتا جاگتا روپ اختیار کر لیتا ہے لیکن علم نفسیات کی یہ بھول بھلیاں نہ آسانی سے مشکلات کو حل کرتی ہیں اور نہ یہ مفروضات کسی سائنسی حقیقت کو وضع کرنے میں مدد دیتی ہیں لیکن تجربات اور مشاہدات یہ بتاتے ہیں کہ عورت کو جنسی زندگی میں Clitoris کی خاصی اہمیت ہے اور قبل بلوغت بھی ان میں جنسی حسیّت موجود رہتی ہے۔ کم سن بچّیاں بھی اگر کسی طرح کے Friction سے دوچار ہوتی ہیں تو وہ بھی حظ اٹھاتی ہیں۔ عام طور پر مخالف جنس سے دورانِ مباشرت اس طرح کی لمساتی حس کے پیدا ہونے کے امکانات زیادہ نہیں رہتے۔ لیکن جب ایک عورت دوسری عورت سے جنسی لذّت حاصل کرتی ہے تو دو نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ندامت اور خجالت کے تصوّرات سے بلند ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ دو عورتوں کی کلوتورس دورانِ مباشرت آپس میں اس Friction کو نقطۂ عروج پر

لے جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں جس سے لمسیاتی حِسّیت میں شدّت پیدا ہو جاتی ہے۔
یہاں کسی قسم کی شکست کا احساس نہیں پیدا ہوتا، کوئی آفت ناگہانی بھی نہیں آتی اور کسی
قسم کی سماجی رُسوائی کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں دونوں فاعل کی حیثیت رکھتی ہیں
یہ لسبین ازم اور ہوموسیکس میں بڑا فرق بنا دیتی ہیں۔ مرد ہوموسیکس آسانی سے پہچان لیا
جاتا ہے لیکن لسبین کی پہچان میں تاخیر ہوتی ہے۔ عورتوں میں لسبین ازم کی ایک وجہ مردوں
سے آزادی کا جذبہ بھی ہے Clitoridal Woman کے متعلق ماہرین نفسیات مختلف
خیال رکھتے ہیں جو فرائڈ کے نزدیک وہ عورت جو کلورٹس میں تمام جنسی ہیجانات پوشیدہ رکھتی
ہے عورت کی تمام دوسری خصوصیات سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے
کہ اسے جتنا جلد ممکن ہو دبا دینا چاہیئے تاکہ نسوانی حُسن بیدار ہو کر نشو و نما پاسکے۔ اس نظریہ کے
پیچھے فرائڈ کا عورتوں کے متعلق کمتر مخلوق کا تصوّر بھی کارفرما ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سوویت
انقلاب کے بعد سوویت اہلِ قلم نے مغربی نفسیات کو بورژوائی سائنس کے نام سے تعبیر کیا،
Karen Horney نے فرائڈ کے اس نظریہ کے خلاف عورتوں کی حمایت میں

On the genesis of the Castration Complex in women.

یہ بتایا کہ یہ 'Male chauvinism' ہے جو یہ کہتا ہے کہ عورتیں اپنے اعضائے
تناسل کو مردوں کے مقابلہ میں کمزور سمجھتی ہیں۔ وہ اسے حیاتیاتی اصولوں کے خلاف بھی سمجھتی
ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک کمسن لڑکی ایک لڑکے کی طرف پیشاب کرنا چاہتی ہے لیکن وہ
ایسا نہیں کر سکتی۔ مرد اپنے اعضائے تناسل کو دیکھ سکتا ہے لیکن عورتیں نہیں دیکھ سکتیں۔
اس لئے ان میں Penis envy پیدا ہوتی ہے جو فطری ہے اور اسی کی وجہ سے جب وہ
جوان ہو جاتی ہیں تو شعوری اور غیر شعوری طور پر وہ اپنے جسمانی تراش خراش اور مد و جزر کا
مظاہرہ کرتی ہیں۔ یہ حیاتیاتی کمی اپنے سماج، ماحول اور مردوں کے بنائے ہوئے شرم و حیا
کے نام نہاد اخلاقی اقدار کی وجہ سے عورتوں کو اپنی جنسی فعالیت کے مظاہرہ اور عمل سے
محروم کر دیتی ہیں۔ اس حیاتیاتی کمی کا ایک دوسرا ردِ عمل لسبین ازم (Lesbianism) کی
شکل میں پیدا ہوتا ہے۔

کوشش کی ہے کہ چونکہ کلورویٹس Penis کی سی مضبوط اور طاقتور نہیں ہو سکتی، اس لئے Horny نے Helene Dentsch سے مخالفت کی ہے اور یہ بتانے کی
وہ اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ بہ ظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے لیکن لسبین ازم میں
مضبوط اور طاقت کا یہ تصور بہت زیادہ کام نہیں کرتا Karen Horney نے
ماہرین نفسیات کے مفروضات کی تردید کرتے ہوئے اپنے مقالہ The flight
from womanhood میں عورتوں کے نفسیاتی تجزیہ و تشریح کے اصولوں کو
Malephantasies کے نام سے پکارا ہے۔ Horney نے اپنے جوابی مقالہ میں
George Simmel کے اس نظریہ کا بھی مضحکہ اڑایا ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن
کی تمام تاریخ مردوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ ہے۔ Horney کے علاوہ Geom-
no Lampl de groot نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ البتہ یہ ضرور کہا ہے
کہ دونوں مخالف جنس اپنی اپنی حیاتیاتی محرومیوں سے باخبر ہیں اور ایک دوسرے کی
کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ عورتوں کی تخلیقی صلاحیتوں کا احساس رکھتے ہیں۔ یہ
نظریہ عورتوں میں لسبین ازم (Lebianism) کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ وہ خود کو مردوں
سے آزاد کرنے کی ایک دبی دبی خواہش کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کا یہ جنسی عمل ہزاروں سال
کے مردانہ سماجی قوانین اور قدر و قیمت کے تعین کے نظریات کا ردِّ عمل بھی ہے۔ جس
سماج میں عورت صرف مردوں کے استحصال کا ذریعہ رہی ہے، وہاں اسے مکمل جنسی
آزادی اور طمانیتِ قلب حاصل کرنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ وہ مردوں کی شہوانی
بربریت کے آگے محض اس لئے سپر ڈالتی رہی ہے کہ کوئی مسیحا ایسا نہیں آیا جس نے ایک
غیر استحصالی سماج کی بنیاد ڈالی۔ جب عورت معاشی اور سماجی طور پر حقیر تسلیم کر لی گئی
تو اس کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے کہ اس کے جذبات، اس کی خواہشات کا احترام بھی
احاطۂ تہذیب میں شامل ہے، اس لئے یہ سوچنا کہ وہ جنسی آسودگی کی فطری راہیں ڈھونڈھ
سکتی ہے غلط ہے۔ خاص طور پر ہندوستان جیسے ملک میں جہاں عرصۂ دراز تک عورت
کا وجود ہی نفرت کی نظر سے دیکھا گیا، وہاں نیچرل جنسی زندگی کی صحت مند قدروں کی

نشو و نما ممکن نہیں۔ ہندوستان میں بھی مسلمان گھرانوں کی عورتیں پردہ کی زہریلی فضاؤں
میں سینکڑوں برسوں سے سانس لیتی رہی ہیں اس لئے اگر مسلم لڑکیاں اپنے جنسی اختلاط
کی کوئی ایسی راہ تلاش کرتی رہی ہیں جو بظاہر اَن نیچرل معلوم ہوتی ہیں تو تعجب نہیں کرنا
چاہیئے بلکہ تعجب تو اس بات پر کرنا چاہیئے کہ ہزار سال کے اُردو ادب لسبین ازم کی
روایت کا کوئی ذکر ہمارے ادب میں ترقی پسند تحریک سے پہلے نہیں ملتا۔ حالانکہ ہمارے
اعلیٰ ترین کلاسکی شعراء کے یہاں ہوموسیکس کے کافی دلچسپ تذکرے موجود ہیں لیکن کبھی
کسی نے لسبین ازم کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ اس کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ
ہماری تہذیبی زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ مردوں کا دیوان خانہ آج کا ڈرائینگ
روم نہیں تھا جہاں عورت مرد کی کوئی تمیز نہیں۔ گو نئے ہندوستان سے پہلے اور آزادی
کے بعد بھی عرصہ تک مردوں کی دنیا الگ تھی۔ خاص کر متوسط طبقہ کی زندگی میں دو نمایاں
اخلاقی اقدار موجود تھے۔ صاحب خانہ عزیزوں سے حسب مراتب سلام اور دُعائیں لیتے
ہوئے مردوں کی دنیا میں واپس لوٹ جایا کرتے تھے اور پھر بیوی سے ان کی ملاقات رات
میں ہی ہوا کرتی تھی اس لئے کمسن یا جوان بچیاں کیا کرتی ہیں، ان کی زندگی کے برتنے کا
فن کیا ہے، صاحبِ خانہ کے تصوّرات میں موجود نہیں تھا۔ جب وہ جوان ہو جاتی تھیں تو
ان کی شادی کر دی جاتی تھی بس! انہیں مطلق اس کا علم نہیں تھا کہ بچپن سے جوانی تک
ایک ننھی بچّی جنسی اختلاط کی کن کن منزلوں سے گزرتی ہے، یہ ہمارے پُرکھوں کی ایک بڑی
لاعلمی تھی اور ہمارے انھیں پُرکھوں میں وہ کلاسکی ادیب و شاعر بھی شامل ہیں جنھوں نے
ہوموسیکس کو سمجھا، ملوّث بھی ہوئے مگر تصویر کے دوسرے رُخ کی طرف بھولے سے بھی
ذہن نہیں گیا۔ دوسری وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اگر کسی کے پاس کوئی مشاہدہ ہو بھی تو
اسے بالکل ہی غیر فطری یا ابنارمل فعل سمجھ کر اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ ادب میں
اس گناہِ کبیرہ کا اظہار کیا جائے۔ حالانکہ آسمانی کتابوں میں بھی گناہِ کبیرہ کا ذکر سینکڑوں
مقامات پر کیا گیا ہے۔ بہر حال ہماری زندگی کا یہ پہلو ادبی اظہار سے محروم رہا۔ مرد،
ترقی پسند مرد فن کاروں نے بھی اس حقیقت کی طرف اپنی توجہ نہیں کی۔ اور شاید اب بھی

جب خاندان ایک کمرہ میں سمٹ آیا ہے اس کی طرف کسی مرد فن کار نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اُردو کی افسانہ نگار خواتین نے اپنے افسانوں میں حقیقت نگاری کی مختلف روایتوں کو مضبوط کیا اور ان میں سے اکثر خاتون افسانہ نگار نے پہلی بار ادب میں لسبین ازم کو حقیقی شکل و صورت میں پیش کیا۔

اس کا ایک سبب یہ حقیقت بھی ہے کہ ابتدائی رومانی زندگی سے ماں بننے کی منزل تک جنس اپنے مکمل امکان اور طاقت کی حیثیت سے مرد سے زیادہ عورت کو متاثر کرتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جنسی عمل مردوں کی شہوانی جذباتیت کے لئے بے حد ضروری ہو، لیکن یہ لمحے عارضی ہوتے ہیں اور عورت کے لئے ان کے اثرات دیرپا ثابت ہوتے ہیں اس لئے یہ نظریہ مہمل اور لغو معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں میں جنسی اشتعال انگیزی کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا اور جنسی طور پر وہ فعالیت سے محروم ہیں۔ وہ ساز کا ایسا تار ہیں جس پر جب تک مغنّی کی انگلیاں حرکت نہیں کرتیں یا کوئی غنائی آواز نہیں پھوٹتی، اگر کوئی ایسی عورت پہلے مشاہدات کی دنیا میں نظر آتی تھی جو جنسی فعالیت سے معمور تھی اور اس کے اظہار کی جرأت رکھتی تھی تو اُسے شریف عورت نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شرافت کا یہ کھوسٹ نظریہ مخصوص استحصال پسندانہ طبیعت کا غماز ہے۔ یہ کوئی بہت قدیم نظریہ نہیں تھا بلکہ حال تک یا ممکن ہے ابھی بھی ہندوستانی معاشرہ میں اس کے ہمنوا موجود ہوں۔ مشہور انگریز سرجن Acton نے سیکس پر ایک کتاب لکھی جو اُنیسویں صدی کے اختتام تک جنس پر ایک مستند تصنیف سمجھی جاتی تھی۔ اس کتاب میں مصنّف نے عورتوں میں جنسی اشتعال انگیزی کی تلاش کو غیر شریفانہ فعل تصور کیا۔ عورتوں کے جنسی جذبات اور خواہشات کو وہ صنف نازک کے تقدس پر آنچ تسلیم کرتا ہے اسے vile organism کہتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ صرف Lascivious women ہی جو جنسی جذبات کا مظاہرہ کرتی ہیں اور اپنے خاوندوں سے جنسی تکمیل کی تمنّاؤں کا اظہار کرتی ہیں لیکن اب یہ بات بہت ہی واضح ہوگئی ہے کہ عورت اور مرد حیاتیاتی اعتبار سے بھلے ہی مختلف ہوں مگر دونوں بنیادی طور پر انسان ہیں اور عقل، جذبات، فطرت، جبلّت اور شعور و ادراک کے اعتبار سے یکساں خصوصیت کے حامل ہیں۔ یہی نہیں

بلکہ قدیم ترین شہوانی عمل کی جو تصویر ملتی ہے وہ Palaetithic Solutrian عہد کی ہے جس میں مرد Suprine اور عورت Squal دکھائی گئی ہے اس لئے اگر مردوں میں ہم جنسی محبت کا میلان زمانۂ قدیم سے پایا جاتا ہے تو عورتوں میں اس کی ابتداء بھی وہی ہوگی مگر ماہرینِ نفسیات دونوں کے اسباب و علل میں اختلاف رکھتے ہیں۔ فرائڈ ہوموسیکس کے متعلق لکھتا ہے:

Homosexuality is assusedly no advantage, but it is nothing to be ashamed of, no vice, no degradation, it cannot be classified as an illness, We consider it to be a variation of the sexual function. Many ~~highly~~ respectable individual of amient & modern times have seen homosexuals several of the greatest mem ami. It is a great inyusties to parsecute homa sexualily as a crime and a cruelty too.

بہرحال ترقی پسندوں سے پہلے اردو ادب میں اس موضوع پر بہتر اور سائنسی انداز میں کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ ترقی پسند تحریک کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادیبوں شاعروں میں ایک ایسی جرأت پیدا کی جس نے نازک بحث طلب اور پیچیدہ مسائل پر لکھنے کے لئے انہیں اکسایا۔ اپنے اردگرد کی گندی ہانڈی کو انھوں نے سرِ بازار پھوڑ ڈالا جس سے تعفّن تو پھیلا، خشمگیں آنکھوں نے گھورا، فتویٰ بھی صادر ہوا، لیکن اس کے باوجود ادیبوں کے حکم میں کوئی ٹھہراؤ نہیں پیدا ہوا۔ یہ جرأت مندی نظریات کی تبدیلی اور ان میں پختگی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ خاتون ادیبوں نے پریم چند کی حقیقت نگاری کی روایت کو اچھی طرح دیکھا، پرکھا اور اس میں اضافے کئے۔ دُنیا کی کسی زبان میں اتنی بڑی تعداد میں خاتون افسانہ نگار نہیں پیدا ہوئیں۔ یہ ایک ادبی معجزہ ہے۔ ان خاتون افسانہ نگاروں نے زندگی کی اندرونی

اور باہری سچائیو کو اپنے موضوعات کے گھیرے میں لے لیا اور بے رحم حقیقت نگاری کی ابتداء کی۔ عصمت جب یہ لکھتی ہیں :

"یا اللہ۔ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے۔ ہماری ایک خالہ تھیں جو کمسن لڑکیوں کو ہر وقت ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کیا کرتی تھیں، ذرا شانہ سے دوپٹہ ڈھلکا اور ان کی آنکھوں میں خون اُترا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس خاص حصّہ جسم سے کیوں جلتی تھیں معلوم ہوا کہ محترمہ چونکہ نہایت مرجھائی ہوئی کھٹائی کی شکل کی تھیں، لڑکیوں کے جسم کو دیکھ کر کوئلہ ہو جاتی تھیں۔ بے چاری خالہ اور نہ جانے کتنی خالائیں اور نانیاں جوانی کھو کر لڑکیوں کی سوتنیں بن جاتی ہیں۔" (ایک بات۔ ص ٦)

تو ایک خاص نفسیاتی کمزوری کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ عصمت کی حقیقت نگاری اور کفن کی حقیقت نگاری میں ایک بڑا فرق ہے۔ بقول وقار عظیم ایک نے مستقبل کے افسانہ کو ایک سنجیدہ، دھیمی، سبک رو لیکن دیرپا بغاوت کی راہ دکھائی، اور دوسرے نے جارحانہ اندازِ فکر و نظر کو انقلاب کا پیش خیمہ سمجھنے کی روش عام کی۔ ایک میں گہرائی ہے جس نے انسانی فطرت کی پوشیدہ تہوں تک رسائی حاصل کی ہے اور دوسرے کی نظر زندگی کے ہر خارجی پہلو کی رگ و پے کا جائزہ لینے، اور اس کے ساتھ عمل جراحی کرنے پر اصرار کرتی ہے۔ عصمت کی جنسی حقیقت نگاری کا فن براہِ راست "انگارہ" سے متاثر ہے۔
عصمت پر مارکس اور فرائڈ کے نظریات دونوں کا اثر پڑا۔ انھوں نے اس حقیقت کو کبھی نہیں بھلایا کہ جنس زندگی کا ایک سنگِ بنیاد ہے اور تخلیق سے اس کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ عصمت نے پہلی بار میلانِ ہم جنسی پر "لحاف" لکھا۔ "لحاف" میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر ایک نوجوان اور شریف عورت ایک ہیجڑے خاوند کے پلّے باندھ دی جاتی ہے تو وہ اپنی زندگی کس طرح گذارتی ہے۔" کرشن چندر نے یہ لکھ کر "لحاف" کا غلط جائزہ لیا اور انھوں نے اس حقیقت سے اپنی آنکھیں موڑ لیں کہ یہ لحاف کی ایک

جوان اور شریف لڑکی کا المیہ نہیں ہے، اگر اس کا خاوند ہیجڑا نہ ہوتا تو بھی وہ شریف لڑکی میلانِ ہم جنسی کے تصوّرات سے آزاد نہیں ہوتی۔ وہ ایک Clitoridal Woman ہے جو حالات کا شکار ہے۔ وہ فعّال عورت ہے۔ اس میں نسوانی سپردگی اور مظلومیت کے عناصر دبے دبے ہیں۔ اس کے لاشعور میں دبے دبے جذبات سطح پر ابھر کر شعور کی فطری رہ گذر کو بند کر چکے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ شادی کے بعد میلانِ ہم جنسی کی شکار لڑکی ان رجحانات سے آزاد ہو جائے جو بچپن سے ہی اس میں پرورش پاتے رہے ہیں۔ چونکہ کرشن چندر کے ذہن میں 'ہم جنسی محبت' ایک غیر فطری چیز تھی اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جنسی آسودگی صرف دو مخالف جنسوں کی محبت اور مباشرت کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے، اس لئے انھوں نے عصمت کی مشہور کہانی کو اپنی نظریاتی عینک سے دیکھا اور اسے معاشرہ کی سرانڈ سمجھ کر جائزہ لیا۔ ان کے مطابق ایک سوشلسٹ نظامِ حیات میں شاید ایسی لڑکی نہیں ہوگی۔ ایسا خیال وہم سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ ایک غیر طبقاتی سماج میں ہی ایسی ہزاروں شخصیتیں ہیں جو میلانِ ہم جنسی کو عزیز رکھتی ہیں لیکن اس کی ضرورت نہیں سمجھتیں کہ ان کی تشہیر کی جائے۔ یہ انسان کی بنیادی کمزوری ہے کہ وہ نقاب چہرہ پر ڈالنے کا عادی ہے۔ آدمی بہ ظاہر جو نظر آتا ہے وہ حقیقت میں نہیں ہے۔ اس کی شخصیت پر کئی دبیز پردے پڑے رہتے ہیں اس لئے عصمت کے میلانِ ہم جنسی کا مطالعہ جدید نفسیات فاسدہ کی روشنی میں کیا جانا چاہیئے۔ اس افسانہ کے متعلق خود ترقی پسندوں نے مختلف ردِّ عمل کا اظہار کیا۔

ہاجرہ مسرور نے کہا:

> "عصمت نے لحاف میں بنیادی غلطی یہ کی کہ اسے بچّوں کی زبان میں پیش کیا ہے اسی لئے وہ گھناؤنا ہو گیا ہے۔ انداز بیان غلط تھا، لیکن موضوع ضروری تھا۔"
>
> (سمپوزیم اردو افسانہ۔ "نقوش" افسانہ نمبر)

اس کی تردید انتظار حسین نے یہ کی:

"میرے خیال میں تو عصمت نے صحیح انداز اختیار کیا۔ کہنے والا بالغ ہوتا تو یہ چیز گھناؤنی ہو جاتی۔ بچوں کی زبان سے یہ ہم تک پہنچ گئی اور اس میں عریانی نہیں رہی۔"

دراصل خود ترقی پسند ناقدوں نے عصمت کے اس افسانہ کو اس کی صحیح روشنی میں نہیں دیکھا۔ انھوں نے عصمت کے افسانہ کو اس لئے سراہا کہ انھوں نے ایک 'ہیجڑے خاوند' سے وابستہ عورت کی جنسی آزادی کی ایک انوکھی تصویر پیش کی لیکن انھوں نے یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس کا تعلق انسان کی جبلتوں سے ہے۔ انھوں نے سطح کو دیکھا، اندرونی خلفشار پر نظر نہیں ڈالی۔ دوسری چیز یہ کہ وہ خود بھی اس مخمصے میں مبتلا رہے کہ 'میلانِ ہم جنسی' کا رجحان دراصل ایک غیر اخلاقی رجحان ہے۔ یہاں وہ اخلاقیات کے بوسیدہ کٹہرے میں کھڑے نظر آتے ہیں اور باوجود انقلابی فلسفہ کے وہ اسے نئی روشنی میں نہیں دیکھ سکے۔ ان سے بہتر طور پر عصمت نے اس رجحان کو سمجھا۔ چونکہ وہ خود بھی عورت ہیں اس لئے اس سلسلے میں ان کے مشاہدات پر شک نہیں کرنا چاہئے۔ انھوں نے عورت کی جنسی خواہشات کے اس عملی روپ کو ایک ڈاکٹر کی نظر سے دیکھا۔ اس میں لذت اندوزی اور فحاشی کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک بڑی صحت مند چیز ہے۔ کوئی موضوع اپنے طور پر فحش اور غیر فحش نہیں ہوتا۔ فنکار کا اس موضوع کے ساتھ کیا Treatment ہوتا ہے یہ بڑی بات ہوتی ہے اور یہی کسی موضوع کو فحش بنا دیتا ہے۔ عصمت نے میلانِ ہم جنسی کو نہ غیر فطری تصور کیا اور نہ اسے گھناؤنا، گندہ اور گناہِ کبیرہ کے دائرہ میں بند کر دیا ـــــ سچی بات تو یہ ہے کہ بڑی صفائی، ایمانداری، بے باکی اور جرأت کے ساتھ حقیقت نگاری کی ایک نئی روایت بنائی۔ ایک ایسے پہلو کو سامنے لایا جو اب تک باوجود ہزاروں سال کی موجودگی کے تاریکی میں تھا۔ انھوں نے قاری کے سامنے ایک ایسی تصویر پیش کی جس سے نفرت نہیں ہوتی، گھٹن نہیں ہوتی، بلکہ تجسس کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ تلاش و جستجو کا یہی جذبہ انسان کو حسیت کی دریافت میں مدد دیتا ہے، اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ عصمت نے جنسی حقیقت نگاری کی جتنی تصویریں کھینچی ہیں، ان سبھوں میں "لحاف" کی جنسی حقیقت نگاری اپنی ایک منفرد راہ بناتی ہے۔ برسوں بعد آج

اس کا مطالعہ اور تجزیہ عصمت کے فنی عظمت پر ایمان لانے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی جھجک نہیں کہ جنسی موضوعات پر جتنی خوبصورت، اچھی، معیاری اور اعلیٰ کہانیاں عصمت چغتائی نے لکھی ہیں، وہ سعادت حسن منٹو کے علاوہ اور کسی نے اب تک نہیں لکھیں۔

جن لوگوں نے عصمت کے اس قسم کے افسانوں پر ناک بھوں سکوڑا اور بیہودہ تنقیدیں لکھیں، ان کی سعادت حسن منٹو نے بڑی اچھی طرح خبر لی ہے۔ عصمت کے متعلق منٹو نے لکھا:

"مجھے اس امر کا شدید احساس ہے کہ اپنے فن کی بقاء کے لئے انسان کو اپنی فطرت کے حدود میں رہنا از بس لازم ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا فن آج کہاں ہے؟ کچھ تو گیسوؤں کے ساتھ کٹ کر علیحدہ ہو گیا اور کچھ پتلون کی جیب میں ٹھُس کر رہ گیا۔ فرانس میں جارج سان نے فطریت کا حسین لباس اُتار کر تصنع کی زندگی اختیار کی۔ پولستانی موسیقار شوپیل سے لہو تھکوا تھکوا کر اس نے لعل و گہر ضرور پیدا کر لئے لیکن اس کا اپنا جوہر اس کے بطن میں ہی دم گھُٹ کر مر گیا۔ میں نے سوچا عورت چاہے جنگ کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش لڑے یا پہاڑ کاٹے یا افسانہ نگاری کرتے کرتے عصمت چغتائی بن جائے، لیکن اس کے ہاتھوں میں مہندی رچنی ہی چاہئے، اس کی باہنوں سے چوڑیوں کی کھنک آنی ہی چاہئے۔

عصمت اگر بالکل عورت نہ ہوتی تو اس کے مجموعوں میں بھول بھلیاں، تِل، لحاف، گیندا جیسے نازک اور ملائم افسانے کبھی نظر نہ آتے۔ یہ افسانہ عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف، شفاف، ہر قسم کے تصنع سے پاک، یہ ادائیں، وہ عشوہ اور غمزے نہیں ہیں جن کے تیر بنا کر مردوں کے دل اور جگر چھلنی کئے جاتے ہیں، جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزلِ مقصود انسان کا ضمیر ہے جس کے ساتھ وہ عورت کی اَن جانی، اَن بوجھی فطرت سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں عصمت ناشدنی ہے، بجڑیل ہے۔ گدھے کہیں کے۔

عصمت نے عورتوں کی روح نچوڑ کر رکھ دی ہے اور لوگ اسے اخلاق کی امتحانی نالیوں میں بیٹھے بُلا بُلا کر دیکھتے ہیں۔ توپ دم کر دینا چاہئے ایسی اوندھی کھوپڑیوں کو۔"

منٹو اور کچھ ہو یا نہیں، بڑا سچا، کھرا اور ایماندار آدمی تھا۔ اس نے آج تک مصلحت اندیشی کو کبھی اختیار نہ کیا۔ عصمت کے متعلق منٹو نے جو کہا وہ کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا تھا، کیونکہ عصمت کا فن بھی سچائی کا وہی فن ہے جو منٹو کے پاس تھا۔ عصمت عورت ہیں اس لئے انھوں نے عورتوں میں "ہم جنسی محبت" کے مسائل پر قلم اُٹھایا۔ یہ قلم مستقبل کی تحریک، تجزیہ اور استدلال کے لئے ایک تحریکی قلم تھا جو گزشتہ تیس برسوں تک انقلاب پرستی، سستی رومانیت اور جذباتیت کے تحت دبی رہیں لیکن جب آدمی جھنجھوڑ کر، سر جھٹک کر اُٹھا تو اس نے از سرِ نو ادبی میلانات کا جائزہ لیا۔ حقیقت نگاری کی بکھری ہوئی صفوں کو دیکھا، اور ان کی قدر و قیمت کا فیصلہ کرنے کے لئے اس قلم کو پکڑا جو کبھی عصمت کی اُنگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ افسانہ نگاری کی پچاس سالہ تاریخ میں کئی رجحانات ایسے ملیں گے جس نے اردو افسانہ کو اہم افسانہ نگار دیئے لیکن عصمت سے پہلے ایسا کوئی افسانہ نگار اردو میں نظر نہیں آتا جس نے انسان کی سب سے بڑی جبلّت اور اس کے دور رس اثرات کو موضوعِ ادب بنا کر نئی نسل کے لئے تجزیہ و تشریح کا سامان چھوڑا ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ عصمت نے فرائڈ کے نظریات سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کی تھی یا نہیں، لیکن مجھے یہ ضرور احساس ہے کہ وہ خود ایک بڑی ماہرِ نفسیات ہیں۔ انسانی نفسیات اور خاص کر مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں اور عورتوں کی نفسیات کو عصمت سے بہتر آج تک کسی نے نہیں سمجھا اور اگر کسی دوسرے نے اس سے بہتر سمجھا تو اسے ادبی فارم میں پیش کرنے کی جرأت نہیں۔ میلانِ ہم جنسی پر عصمت کے بعد اُردو کی دوسری خاتون افسانہ نگاروں نے بھی کہانیاں لکھی ہیں، گویا عصمت نے جس نئے اسکول کی بنا ڈالی، وہ ان کے بعد ختم نہیں ہوئی، بلکہ یہ سلسلہ جاری رہا اور ایماندار ناقد کو یہ بات تسلیم کر لینے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہئے کہ حقیقت نگاری کی یہ روایت ان کے ہاتھوں کافی توانا رہی، عصمت کی جنسی حقیقت نگاری لذّتیت کا کوئی پہلو نہیں پیش کرتی، بلکہ متوسّط طبقہ اور خاص کر مسلمان بچیوں اور عورتوں کی گھٹی گھٹی

زندگیوں کو پیش کرتی ہے۔ پردہ کے اندر ہونے والے بے شمار جنسی جرائم کو وہ اس لئے منظرِ عام پر نہیں لاتیں کہ پڑھنے والا حظ اُٹھائے، بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ جرائم ختم ہوں۔ وہ گندگی کو پلنے کی قائل نہیں ہیں، انھوں نے غلط نہیں لکھا کہ

"یہ ضروری نہیں کہ ہر گندگی منفول کو بھی دکھایا جائے اور بے کار سڑکوں پر ننگے گھومتے پھریں لیکن اگر غسلِ آفتاب کے لئے کسی ضروری حصّۂ جسم کو کھولنے کا موقع آئے تو اس میں کیا شرم، اگر پٹی کھولنے سے زخم خشک ہو تو اسے عُریانی نہیں کہتے۔ اور وہ بزرگ جو اس سے چڑجاتے ہیں، قابلِ رحم ہیں۔" (ایک بات - ص ۷)

اگر عصمت نے محض ایک رومانی ادیب کی طرح اپنے موضوع کا Treatment کیا ہوتا تو نہ وہ بڑی فن کار بن پاتیں اور نہ ان سے کوئی عمل جراحی ہو پاتی۔ انھوں نے بڑی نرمی اور سبک روی سے ان جنسی رجحانات پر قلم اُٹھایا ہے جو بے حد اہم اور قابلِ توجّہ تھے۔ انھوں نے سوشل پیتھولوجی کی۔ لیکن یہ سوشل پیتھولوجی شعور اور لاشعور میں پیدا ہونے والے ہزاروں مسائل کی پیدائش اور ان کی نشو ونما سے واقفیت کے بعد عمل میں آئی۔ لیکن عزیز احمد اسے تسلیم نہیں کرتے۔ انھوں نے عصمت کے کرداروں کے متعلق لکھا:

"عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے اُسے کسی مرد نے نہ چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو عشق ایک ایسی چیز ہے جس کا جسم سے وہی تعلق ہے جو بجلی کا تار سے ہے۔ لیکن کھٹکا دبادو تو یہی عشق ہزاروں قندیلوں کے برابر روشنی دیتا ہے۔ دوپہر کی جھلستی لُو میں پنکھا جھلتا ہے، ہزاروں دیووں کی طاقت سے زندگانی عظیم الشان مشینوں کے پہیے گھماتا ہے اور کبھی کبھی زلفوں کو سنوارتا اور کپڑوں پر استری کرتا ہے، ایسے عشق سے عصمت بحیثیت مصنّفہ واقف نہیں ہیں۔"

سعادت حسن منٹو نے اس کا بروقت جواب دیا:

"ظاہر ہے عزیز صاحب کو اس کا افسوس ہے کہ عصمت واقعی عزیز

صاحب کے تصنیف کردہ عشق سے ناواقف ہے اور اس کی یہ ناآشنائی ہی اس کے ادب کا باعث ہے۔ آج اس کی زندگی کے تاروں کو عشق کی بجلی کے ساتھ چھوڑ دیا جائے، تو ممکن ہے ایک عزیز احمد پیدا ہو جائے لیکن لحاف، تل، گیندا پیدا کرنے والی عصمت ضرور مرجائے گی۔"

(عصمت چغتائی۔ ص ۱۵-۱۱)

عصمت نے اس کی مزید وضاحت یوں کی:

"سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اگر عریانی نظر آتی ہے تو لوگ بلبلا کیوں اٹھتے ہیں۔ یورپ کے لڑکے لڑکیاں جب جنس کے بارے میں کچھ پڑھتے ہیں تو ان کے کانوں میں جوں تک نہیں رینگتی اور یہاں سانپ پھنپھنانے لگتا ہے، کیوں صاحب، کیا ضروری ہے کہ اس مقدس سانپ کو اپنی آئندہ نسل کا خون چوسنے کے لئے چھوڑ دیں۔"

عصمت کے بعد کے خاتون افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ممتاز شیریں کا ہے، ممتاز شیریں نے اپنی ہم عصر افسانہ نگاروں کی بہ نسبت بہت کم لکھا لیکن وہ اپنے عہد کی چند پڑھی لکھی خاتون میں سے تھیں۔ انہوں نے مغربی ادب کا اچھا مطالعہ کیا اور علم نفسیات سے ان کی دلچسپی براہِ راست رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے مشاہدات اور تجربات کی دُنیا عصمت سے زیادہ وسیع نہیں ہے۔ ان کے فن کا دائرہ بھی بہت محدود ہے۔ انہوں نے ترقی پسندوں کی طرح عوام دوستی کا نعرہ نہیں لگایا۔ مزدوروں کسانوں پر کچھ نہیں لکھا کیونکہ انھوں نے ان کی زندگی کو قریب سے نہیں دیکھا۔ ان کے فن پر ملکی اور غیر ملکی زندگی میں ہونے ہوالے واقعات کی پرچھائیاں نہیں ہیں۔ عموماً ان کے افسانوی موضوعات کا تعلق ازدواجی زندگی کے تعلقات ہیں۔ ان کی کتاب "میگھ ملہار" بھی اس سے آگے نہیں بڑھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی افسانہ نگاری کی عمر طویل ہوتے ہوئے بھی زندگی کے تمام رشتوں کا احاطہ نہیں کر پاتی۔ یوں کہنے کو کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح زندگی کے خارجی محرکات سے ان کا رشتہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچ گیا۔ میرے نزدیک یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ ضروری

نہیں ہے کہ ہر ادیب وہیت نام پر قلم اٹھائے۔ یہ مکالمہ ادب تخلیق نہیں کرتا بلکہ ادیبوں کے لئے تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ ممتاز شیریں نے ان الجھنوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی جو مسلمان لڑکیوں کو پریشان کیا کرتی تھیں۔ عصمت نے جن جنسیاتی الجھنوں کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا وہ ممتاز شیریں کے یہاں بھی ہیں لیکن ان کی شکل بدلی ہوئی ہے۔ لحاف اور انگڑائی ایک ہی موضوع یعنی 'ہم جنسی محبت' پر لکھا گیا ہے لیکن 'انگڑائی' کا ماحول مختلف ہے۔ انگڑائی کی 'گلنار' عصمت کے 'لحاف' کی طرح Clitoridal Woman نہیں ہے۔ گلنار کو ایک مرد کی محبت مل جاتی ہے۔ اسلئے وہ اپنی ٹیچر سے الگ ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک طرح کی رقابت بھی ہونے لگتی ہے۔ اس افسانہ میں گلنار اور اسکی ایک ٹیچر ہوتی ہے۔ یہ دونوں لسبین ہیں۔ اس میں ٹیچر کی اندرونی اور جذباتی دنیا ہی زیادہ اہم تھی جس کو ممتاز شیریں نے نظر انداز کر دیا۔ گلنار نے بقول فرائڈ اپنی دوہری شخصیت کو دبا دیا اس لئے وہ Clitoridal عورت زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکی۔ وہ اپنی شادی سے آسودہ ہو جاتی ہے۔ مرد کا سہارا اسے 'ہم جنسی محبت' سے الگ کر دیتا ہے' مگر کہانی کا المناک کردار وہ ٹیچر ہے جس کی ساری جذباتی اور جنسی زندگی میں اچانک ایک سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ اس افسانہ کے متعلق حسن عسکری نے لکھا:

> "انگڑائی میں ایک قدرے غیر معمولی جذبہ یعنی 'میلانِ ہم جنسی' کی عکاسی کی گئی ہے اور بڑی احتیاط سے بچ بچ کر۔ جب افسانہ ختم ہوتا ہے تو گلنار ویسی کی ویسی نہیں رہتی ہے جیسی شروع میں تھی، بلکہ اس نے اپنی کینچلی اُتار دی ہے اور ایک نئی گلنار بن گئی ہے۔"

حسن عسکری پڑھے لکھے ناقد اور ادیب ہیں۔ انھیں غیر ملکی ادب سے کافی دلچسپی ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ جذبہ اور جبلّت میں کوئی فرق نہیں محسوس کر سکتے۔ جذبہ عارضی ہوتا ہے، لمحاتی ہوتا ہے اور جبلّت پیدائشی چیز ہے جو انسان سے ورثہ میں پایا ہے۔ یہ جبلّت دو طرح کی ہوتی ہے۔ پیچیدہ اور غیر پیچیدہ۔

جنس ایک پیچیدہ جبلّت ہے۔ اتنی پیچیدہ کہ کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ جبلّتوں میں تبدیلیاں آتی ہیں لیکن ان کی خصوصیات بدلنے میں زمانہ لگتا ہے۔ مرد کا مرد کے ساتھ عشق یا مباشرت غیر اخلاقی، غیر فطری آپ جو چاہیں کہیں جنسیاتی جذبہ کے تحت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا تعلق اس جبلّت سے ہے جو ہر انسان میں موجود رہتی ہے مگر ماحول، پرورش، تعلیم اور دوسرے سماجی، مذہبی اسباب لاشعور کی اس خواہش کو دبا دیتے ہیں جہاں شعور اور لاشعور کی یہ لڑائی طے نہیں ہو پاتی، وہاں جنسی جبلّت کا یہ فارم اُبھر کر آدمی کی شخصیت پر حاوی ہو جاتا ہے اور ہم جنسی محبّت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ عمل کسی جذبہ کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کی شخصیت اور کردار کا ایک جزو بن کر رونما ہوتا ہے۔ "انگڑائی" کی گلنار چونکہ بنیادی طور پر Clitoridal عورت نہیں تھی اس لئے اس مخالف جنس کی محبت اور جنسی زندگی نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ فرائڈ کے نزدیک گلنار صحت مند ہو گی، کیونکہ فرائڈ کسی ایسی عورت کو پسند نہیں کرتا تھا جس میں خود مختاری کا جذبہ ہو، جو بلند ترین انسانی خوبیوں کی مالک ہو۔ وہ ہمیشہ عورتوں کو مردوں سے کمتر درجہ کی مخلوق سمجھتا رہا۔ اس لئے اس کے مطابق گلنار ایک آزاد صحت مند لڑکی کے روپ میں اُبھرتی ہے مگر عورت کا یہ تصوّر آج اتنا مضحکہ خیز ہو گیا ہے کہ اس کی موافقت میں کسی قسم کی دلیل کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ انگڑائی کے سلسلہ میں ممتاز شیریں کا اپنے متعلق یہ فقرہ کہنا بھی بے حد معنیٰ خیز ہے اور میرے مقالہ کو اس خیال سے بڑی تقویت ملتی ہے کہ اکثر خاتون افسانہ نگاروں کی ذاتی زندگی کے تجربات بھی بڑی سچائی اور دیانت داری کے ساتھ اس موضوع میں سماتے گئے ہیں۔

'میں خود اس وقت گلنار کے اسٹیج سے گذر رہی تھی'

عصمت اور ممتاز شیریں کے فن میں بڑا فرق ہے۔ البتہ ایک خوبی دونوں میں مشترک ہے اور یہ احتیاط اور فحاشی سے اپنے قلم کو آزاد رکھتا ہے اور حسن عسکری کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ ممتاز شیریں کے افسانوں میں جنسی اشتعال انگیزی کی کوشش نہیں۔ آج کل نئی افسانہ نگار خاتون میں یہ مرض

وبا کی طرح پھیل رہا ہے کہ جنسیات سے متعلق کوئی بات منہ پھٹ طریقہ سے کہہ دی جائے جس سے لوگ چونک پڑیں کہ لڑکی ہو کر اتنی بے حیائی۔ غرض کہ لکھنے والیوں کو شہرت کا سستا ٹکا حاصل ہو گیا ہے۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔

حسن عسکری کے اس خیال کی تائید خود ممتاز شیریں نے بھی کی۔ لیکن یہ سوچنا کہ صرف شہرت کی خاطر خاتون افسانہ نگاروں نے جنس کو موضوع ادب بنانا شروع کیا ہے غلط ہے۔ ممتاز شیریں کا یہ خیال کہ

"جدید اردو ادب کے درمیانی دور میں حقیقت نگاری صرف جنسی حقیقت نگاری بن کر رہ گئی تھی اور یہاں بھی صرف ایک رخ پیش کیا جا رہا تھا۔ ہر طرف جنسی بیماریوں، کج رویوں، بدعنوانیوں اور جنسی ناآسودگی کی داستانیں بھری پڑی تھیں۔ آج بڑی شدت سے احساس ہوا کہ اس سے بڑا ہی غیر صحت مند اثر پڑ رہا ہے۔ اس کی بہت ضرورت ہے کہ تندرست جنسی زندگی، صحت مند محبت اور خوشگوار زندگی کا بھی۔ جو جنسی زندگی کی انار کی، بے ترتیبی یا بے اعتدالی میں ایک مستقل یا بڑا رشتہ ہے، چند تصویریں کھینچی جاتیں۔ زندگی میں ایسی تصویریں بھی موجود ہیں اور یہ افسانے اس سلسلہ میں ایک روشن پہلو پیش کرتے ہیں۔ اپنے بالکل تازہ افسانہ 'دیپک راگ' میں مجھے بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ اس افسانہ میں میں نے جنسی محبّت اور ازدواجی زندگی کے وسیع مسئلہ کو کچھ وسعت سے گھیرنے کی کوشش کی ہے۔"

ممتاز شیریں کا یہ کہنا کہ جدید درمیانی دور میں افسانوی حقیقت نگاری زیادہ تر جنسی حقیقت نگاری بن کر رہ گئی تھی، غلط ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہمارے یہاں پریم چند اور اس اسکول سے وابستہ مصنّفین نے ایک ٹھوس قسم کی حقیقت نگاری پیدا کی تھی جسے بعد میں ترقی پسندوں نے وسعت دی لیکن صحیح معنوں میں جنسی حقیقت نگاری صرف عصمت، سعادت حسن منٹو (ممتاز شیریں)، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور) کے یہاں فنّی مہارت کے ساتھ

ملتی ہے۔ کچھ عرصہ سے راجندر سنگھ بیدی نے عورت کے جسم کو سونگھنا شروع کیا ہے لیکن بیدی اور واجدہ تبسم دونوں کے یہاں ایک مخصوص قسم کی لذتیت پائی جاتی ہے۔ ایک ایسی بیمار لذت جو بوڑھے نامرد آدمی کو جوان جوڑوں کے عالم مباشرت میں دیکھنے سے ہوتی ہے۔ دوسری بنیادی بات جو ممتاز شیریں نے کہی وہ خوشگوار ازدواجی زندگی کا تصور ہے جس کی چند تصویریں انھوں نے اپنے افسانوں میں کھینچی ہیں۔ خوشگوار ازدواجی زندگی کا غالباً بنیادی تصور ان کے یہاں عہدِ وفا ہے۔ یعنی دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے تئیں تازندگی وفادار رہتے ہیں۔ یہ بڑا ہی کھوسٹ اور غیر علمی نظریہ ہے اور اس خیال کے برعکس ہے کہ عورت مرد دونوں میں Polygamy ہوتے ہیں۔ بفرض محال اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اپنی عملی زندگی میں دونوں ایفائے عہد نباہتے ہیں تو اس سے ان کے اندر کی ہونے والی کشمکش کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو کبھی بھی، کسی وقت، کسی نئے رُوپ میں نکل آتی ہے اس لئے ایمانداری اور محبوب کے تئیں وفاداری کا تصور بھی عورت کے Capture Marriage کے عہد کی یاد دلاتا ہے۔

دراصل ممتاز شیریں کا فن احساس اور وجدان کا فن ہے اس لئے منفی اور مثبت پہلوؤں کی تلاش اور آئینہ داری میں تجزیہ کی کوشش کام کرتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ ان کے یہاں اخلاقی تقاضوں کا مسئلہ نہیں ملتا اس لئے جنسی موضوعات پر قلم اٹھاتی ہیں لیکن زندگی کے کمتر تجزیات، محدود مشاہدات نے ممتاز شیریں کو عصمت سے دور کر دیا ورنہ 'انگڑائی' کے بعد ممتاز شیریں نے اور بھی اچھے اور کامیاب تجربے کئے ہوتے، حالانکہ وہ اُن معدودے چند افسانہ نگاروں میں ہیں جو مرد کی اندرونی اور ذہنی کیفیتوں کو پیش کرتی ہیں۔ اور ان ہی کیفیتوں میں 'میلانِ ہم جنسی' کا رجحان بھی شامل ہے اور "انگڑائی" 'میلان ہم جنسی پر مخالف جنسِ کشش کا غلبہ' کے نظریات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انگڑائی میں یہ تبدیلی بہت غیر محسوس طور پر بتائی گئی ہے۔ جنسی افسانوں کی ایک خاصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ چند اچھے کردار افسانوں کو دیتے ہیں۔ اسی لئے باوجود اس حقیقت کے ممتاز شیریں نے بہت کم لکھا۔ ان کا افسانہ 'انگڑائی' اپنے موضوع اور اپنے کردار 'گلنار' کی وجہ سے

خاصا مشہور ہوا کیونکہ گلنار میں تدریجی ارتقاء ہوتا گیا اور لاشعور پر شعور کی گرفت تیز ہوتی گئی۔ شعور اور لاشعور کی یہ مسلسل جنگ آزمائی انسانی ذہن کی ایک سچی تصویر پیش کرتی ہے اس سے فن کار کے اسلوب کو بھی مدد ملتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ممتاز شیریں کا اسلوب آج بھی پُر کشش اور اچھوتا ہے۔

'میلانِ ہم جنسی' پر ہاجرہ مسرور نے بھی ایک کہانی 'تل اوٹ پہاڑ' لکھی۔ یہ افسانہ ان کے اپنے افسانوں کے مجموعہ 'ہائے اللہ' میں شامل ہے۔ اس کتاب کی اکثر کہانیاں 'میلانِ ہم جنسی' کے موضوع پر ہیں۔ ان میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ نوعیت کے اعتبار سے جنسی تو ہیں لیکن ان میں تحلیل نفسی کا فن نہیں ہے۔ ان افسانوں میں 'ہائے اللہ' 'تل اوٹ پہاڑ' قابلِ ذکر ہیں۔ یوں اس کے علاوہ 'بندر کا گھاؤ' 'راکھ' 'سرگوشیاں' 'آپ کی دنیا کا ذکر ہے کہ' یہ سبھی جنسی موضوعات پر لکھے ہیں۔ 'ہائے اللہ' ایک چھوٹی سی لڑکی کی دبی دبی جنسی خواہش پر لکھی گئی ہے۔ ننھی کا اپنے متعلق سیانی بن کر سوچنا اس کے جذبات اور اعصاب میں ہلچل' یہ سب عصمت کے افسانہ 'گیندا' کی یاد دلاتے ہیں۔ 'تل اوٹ پہاڑ' کے ساتھ بھی یہی بات ہے۔ اس افسانہ میں ایک کمسن لڑکی اپنے باپ کی عیاشیوں کو دیکھ کر اپنے اندر جنسی اُبال پاتی ہے' اور غیر ارادی طور پر ایک عورت کے ساتھ جسمانی قربت کا عملی اظہار کرتی ہے۔

عصمت نے جہاں بنیادی جبلتوں کی طرف اپنے افسانہ 'لحاف' میں اشارہ کیا تھا وہاں ایک معاشرہ کی دُکھتی رگوں پر انگلیاں بھی رکھی تھیں، عصمت کے یہاں بڑی بیباکی' جرأت اور تیز کاٹ ملتی ہے۔ ہاجرہ کے یہاں سب خوبیاں نہیں ہیں۔ 'تل اوٹ پہاڑ' میں انھوں نے کسی ایسے مسئلہ کی تحلیلِ نفسی نہیں کی ہے' حالانکہ پطرس بخاری نے ہاجرہ کے افسانوں کے متعلق دیباچہ میں لکھا ہے:

> "ذاتی رشتوں میں جنس کا رشتہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔
> جنس کا پیڑ ایک ایسا پیڑ ہے جس میں لاکھوں قسم کے کڑوے میٹھے اور کھٹے پھل لگتے ہیں' اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو اسے بوئے گا وہ کیا کاٹے گا۔
> اس کی جڑیں دماغ، دل، اعصاب اور گوشت میں نہ معلوم کہاں کہاں تک

پھیلی ہوتی ہیں۔ ہاجرہ کے کرداروں کا جنسی شعور جسمانی مظاہرہ سے
بہت آگے نکل جاتا ہے جن کی وجہ سے ان کے جنسی افسانے اوروں
سے زیادہ دقیق اور عمیق معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جنسی تعلقات میں
تنوّع اوروں سے زیادہ ہے اور ان تعلقات کی رنگینیاں بھی زیادہ
لطیف اور نگاہ فریب ہیں۔" (چوری چھپے۔ ص ۱۴-۱۳)

حیرت ہوتی ہے کہ پطرس جیسا باشعور اور پڑھا لکھا آدمی ہاجرہ کے جنسی افسانوں کے متعلق یہ رائے کس طرح دے سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ افسانے اس جنسی حقیقت نگاری کا ایک سلسلہ ہیں جو عصمت نے قائم کی تھی، اس لئے ان پر عصمت کی گہری چھاپ ہے لیکن ان میں عصمت کی تیزی، تندی، ذہانت، تجربہ، تجزیہ اور گہرا مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی نکتہ روشن نہ ہو سکا۔ کوئی مسئلہ اُبھر کر قاری کو پریشان نہ کر پایا۔ کوئی تصویر ذہن میں بھونچال نہ پیدا کر سکی۔ کوئی مکالمہ خوابِ غفلت سے بیدار نہ کر سکا۔ کوئی آواز اعصاب میں لرزش نہ پیدا کر سکی۔ شاید یہی سبب ہے کہ ہاجرہ نے اپنے افسانوں کا رُخ موڑ دیا اور آزادی کے بعد انھوں نے اپنی حقیقت نگاری کو سماجی اور معاشرتی زندگی سے قریب کر دیا۔ مگر جو افسانے انھوں نے 'میلانِ ہم جنسی' کے موضوع پر لکھے ہیں، وہ ماہر نفسیات کے اس خیال کو صادق قرار دیتے ہیں کہ ہر لڑکی عمر کی کسی نہ کسی منزل پر ہم جنسی محبت کے تصورات اور عمل سے دوچار ہوتی ہے اور تقریباً ۹۰ فی صد عورتیں اس کا شکار رہتی ہیں' صرف اس کی شکلیں بدلی ہوئی رہتی ہیں۔ یہ شکلیں ایسی نہیں ہوتیں کہ ہر شخص پہلی نظر میں پہچان لے تاوقتیکہ وہ گہری بصیرت رکھتا ہو۔ ہاجرہ نے عصمت کے بعد لکھنا شروع کیا اس لئے انھیں نقشِ اوّل بنانے کے سلسلہ میں لعنت ملامت نہیں سُننی پڑی۔ ہاجرہ کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو جو وسیع ترین سماجی اور جنسی زندگی کا احاطہ نہیں کرتے، ایمانداری سے اپنے افسانوں میں سمویا۔ اور اس امر کی طرف پطرس نے جو بھی لکھا ہے وہ درست ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شخصی رشتوں کی دنیا محدود سہی لیکن پایاب نہیں۔ شخصی رشتوں میں انہماک آپ کو اکثر ہماری ادیب عورتوں میں ملے گا جو اس بات کا ثبوت

ہے کہ وہ اپنی فطرت کو جھٹلاتی نہیں بلکہ خلوص و دیانتداری سے لکھتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو اس معاملہ میں ان کا نامۂ اعمال مردوں سے زیادہ روشن ہے۔ ہمارے یہاں ادیب عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کی روئداد جس جرأت و بے ساختگی کے ساتھ انھوں نے پیش کی ہے اس سے ہمارے مردانہ ادب کو بھی ریاکاری کے گھونگھٹ اُلٹنے پڑے ہیں اور اُردو ادب کو ان کی بدولت تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے۔ ہاجرہ مسرور کے افسانے بھی تازہ ہوا کا جھونکا ہیں۔ ان کی نظر پہلے سے زیادہ گہری ہے۔ شخصی رشتوں کے جال وہ بھی بُن رہی ہیں۔ ان رشتوں کی دُنیا بھی ایک حیرت انگیز ہے۔ اس میں انسان ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں اور ڈھکیلتے ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ دھکیلتے ہیں اور دوسرے سے کھینچتے ہیں، اور زندگی اس جال میں تنی رہتی ہے۔

پطرس نے یہ کہہ کر حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے۔ دراصل ہاجرہ کے یہاں عورت زیادہ کچلی ہوئی ملتی ہے۔ اس کی سماج میں کوئی عزّت نہیں۔ ان کا جنسی استعمال برابر جاری ہے۔ اس لئے وہ افسانے بھی جو میلانِ ہم جنسی کے موضوع پر ہیں، دبی دبی کچلی ہوئی رُوحوں کی داستان ہیں۔ یہ ایسا ماحول ہے جہاں باپ کو اپنی بیٹی کی فکر نہیں ہوتی اور جو اس کے سامنے مختلف عورتوں کے ساتھ اپنی جنسی ہوس بجھاتا ہے۔ اسی ماحول میں چھوٹی بچّی کا جنسی شعور بیدار ہونے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اپنی ہم جنس عورت کے ساتھ مباشرت کی سعی کرتی ہے، مگر تھک جاتی ہے۔ اسے آسودگی حاصل نہیں ہوتی۔ ہماری سماجی زندگی کا یہ ایک المناک پہلو ہے۔ میں نے اسی لئے پہلے کہیں لکھا ہے کہ جنسی ناواقفیت اور کم علمی صرف ایک شخص کی بربادی کا سبب نہیں ہوتی بلکہ کئی نسل کی تباہ کاری کی ذمہ داریاں اس کے سر ہوتی ہیں۔ جنسی حقیقت سے منہ موڑنے کا جو رویّہ ہمارے بُزرگوں نے اپنایا تھا، ایک عرصہ تک ادب کے ناقدوں اور دانشوروں نے بھی اسے اپنائے رکھا۔ اب یہ بت ٹوٹ چکا ہے اور علم کی روشنی میں انسان کی اندرونی کشمکش اور ان پیچیدگیوں کو سنوارنے کی کوشش کی جارہی ہے جن سے ایک

صحت مند جنسی زندگی کا ماحول پیدا ہو سکے۔ ادب کو میں صرف تجزیہ اور تشریح کا ذریعہ نہیں سمجھتا، بلکہ ہمارے لاکھ Non committed ہونے کے باوجود کہیں نہ کہیں ہمیں جگانے کا کام بھی کرتا ہے، کریدتا ہے، اکساتا ہے، تحریک پیدا کرتا ہے، جلا بخشتا ہے، روشنی عطا کرتا ہے۔ اور یہ سب عمل کبھی بھی نہ براہِ راست ہوتا ہے اور نہ منشور کے تقاضوں کے تحت۔ یہ ایک تخلیقی عمل ہے اور اس کی دُنیا اتھاہ پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں کوئی ایک مقام نہیں، کوئی ایک مرکز نہیں۔ انسانی تجربات کا خزانہ ہے جو لاکھوں برسوں سے گذرتا ہوا ہم تک آیا ہے۔ اسی لئے ہمارا افسانوی ادب بھی ان معنوں میں وہ روشنی عطا کر سکتا ہے جس کی انسانی تاریخ میں برابر ضرورت رہی ہے۔

میں نے ممتاز شیریں کے افسانہ 'انگڑائی' کا ذکر کرتے وقت یہ لکھا تھا کہ یہ 'میلانِ ہم جنسی پر مخالف جنس کا غلبہ' ہے اور اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر عورت Clitoridal نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ مخالف جنس کی جنسی رفاقت اسے میلانِ ہم جنسی کی رغبت سے آزاد کرا دے۔ فرائڈ کے نزدیک یہ عورت کے لئے ضروری ہے ورنہ اس کی نظر میں عورت نسوانی خوبیاں پسِ پشت ڈال دے گی۔ لیکن فرائڈ کا یہ نظریہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، عورت کو کمتر مخلوق سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی کا ایک افسانہ 'تارے لرز رہے ہیں' اس سلسلہ کی عمدہ مثال ہے۔ صدیقہ بیگم اپنے نظریات کے اعتبار سے اشتراکی ہیں اور ترقی پسند تحریک کے زمانہ میں ایک بیحد سلجھی ہوئی خاتون افسانہ نگار سمجھی جاتی ہیں۔ یہ افسانہ اس زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ اس میں ایک شادی شدہ خاتون کا ذکر کیا گیا جو شادی کے بعد بھی میلانِ ہم جنسی کے تصوّر سے آزاد نہ ہو سکیں اور جو حقیقت میں Bi-Sexual تھیں۔ کہانی کی ہیروئن 'بھابی' شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنے اس ذوق کو باقی رکھتی ہیں۔ یہی نہیں وہ اس طرح کا ادب بھی شوق سے پڑھتی ہیں۔ گرچہ ان کا شوہر اس کی اجازت نہیں دیتا اور کہتا ہے، 'یہ سب کتابیں اس کی نند صفیہ کے لئے تھیں' تمہیں اس کی کیا ضرورت۔ غریب شوہر یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس کی بیوی کو صفیہ سے زیادہ ان چیزوں کی ضرورت ہے کیونکہ

وہ Clitoridal ہی نہیں بلکہ Bisexual عورت بھی ہے۔ بھابی کو اپنے شوہر کے جواب سے تشفی نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب کبھی انھیں موقع ملتا ہے، وہ اپنی چھوٹی نند سے دیوانہ وار لپٹ جاتی ہیں۔ اس منظر کو صدیقہ بیگم نے اس طرح پیش کیا ہے:

"بھابی مسکرائیں اور پھر دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئیں۔ میری آنکھوں کے سامنے صفی آگئی۔ بھابی پوری طاقت سے بھینچ رہی تھیں۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ چھوڑ دو بھی، کیا بری عادت ہے جو اس طرح بھینچتی ہو۔ ساری ہڈیاں ہل جاتی ہیں۔ میرے جی میں بھی آئی کہ اس طرح بھینچوں۔ پھر جیسے کسی نے سینہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو اور میری آنکھیں ایک لذّت آمیز کرب سے اچانک پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صفی بے وقوف ہے جو اس زور سے بھینچتی ہے۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ میں جھینپ سی گئی۔ بھابی کی گرفت ڈھیلی ہو چکی تھی اور ان کا سانس ـــــ جیسے بہت دور سے دوڑتی ہوئی چلی آرہی ہوں ـــــ بے نیل و مرام ـــ!" (تارے لرز رہے ہیں)۔

'میلانِ ہم جنسی' کے متعلق ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ اگر بچپن میں والدین کی کسی حرکت سے بچّی نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ ناخواستہ طفلک پدر رہے تو اس کو اپنے سیکس سے نفرت سی ہونے لگتی ہے اور بچّی شعوری طور پر یہ کوشش کرتی ہے کہ وہ لڑکا بن جائے اور یہیں سے اس میں میلانِ ہم جنسی کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ خیال بہت زیادہ دلیلیں نہیں رکھتا۔ ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں جو عین اس کے برعکس ہیں۔ اس لئے یہ بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ آدمی کی ذات میں دونوں رُجحانات موجود رہتے ہیں اور شعور لاشعور کی معرکہ آرائیوں کے بعد کوئی ایک رجحان شخصیت پر حاوی ہو جاتا ہے۔

صدیقہ بیگم کی کہانی 'تارے لرز رہے ہیں' ایک ایسی ہی عورت کی کہانی ہے جس نے دونوں قسم کے میلانات کی برابر اور یکساں پرورش کی ہے۔ اس طرح کی عورتیں اور لڑکیاں کبھی کبھی Tomboy کے نام سے پکاری جاتی ہیں (اور لڑکے Sissy کہے جاتے ہیں) اور ان حکایات کا اس کی شخصیت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظروں سے

کتراتا ہے۔ شرمندہ شرمندہ رہتا ہے۔ اس کی شخصیت پر کئی تہیں پڑنے لگتی ہیں اور وہ نیوراتی مریض بن جاتا ہے۔ اسے یوں سمجھنا چاہیئے کہ عورتوں کو سماج میں اپنے سیکس کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں روا رکھا گیا ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ چمٹ کر سو سکتی ہے۔ جسمانی قربت کسی قسم کے شک و شبہ کو پیدا نہیں کرتی۔ وہ ایک دوسرے کو چوم سکتی ہیں، بغل گیر ہو سکتی ہیں لیکن یہی حرکتیں ایک مرد دوسرے مرد کے ساتھ اُس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک وہ ہوموکی خصوصیات نہیں رکھتا۔ ایک باپ اپنے بچے کے سامنے کپڑے نہیں بدل سکتا اور نہ بچہ باپ کی موجودگی میں، لیکن ایک لڑکی اپنی ماں کی موجودگی میں عریاں ہو کر کپڑے تبدیل کرسکتی ہے۔ اس فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ لیسبین کی پہچان میں اسی لئے دشواری درپیش ہوتی ہے۔ اسی لئے فرائڈ کا بنیادی نظریہ شخصیت متنازعہ فیہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ شخصیت کی پیچیدگی سے اس مرض کا گہرا تعلق قرار دیتا ہے اور Un Conscious Homo Sexuality کو نیروسس کی وجہ تصور کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غیر شعوری میلانِ ہم جنسی ہر آدمی میں موجود رہتا ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اس لئے اس کی بھی تین قسمیں بتائی گئی ہیں Latent Homo Sexuality یہ ہر شخص میں موجود ہے۔ البتہ اس کی شدت تمام افراد میں یکساں نہیں ہوتی۔ عام طور پر یہ رجحان آگے چل کر Sublimate ہو جاتا ہے اور آدمی شعوری طور پر اس کا مظاہرہ نہیں کرتا اور نہ اسے کسی مفعول کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسری شکل Repressed Homo Sexuality ہے۔ ماہرِ نفسیات نے اس کی تشریح کی ہے اور تیسری قسم جو Overt Homo sexuality کہی جاتی ہے، وہ بھی ماہرِ نفسیات کے تجزیہ کے دائرے میں آتی ہے کیونکہ اگر میلانِ ہم جنسی کا رجحان ان ہی دونوں فارم میں موجود ہے تو بحث و مباحثہ اور تحلیل نفسی میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہوگا۔ فرائڈ کے یہاں ان دونوں کا تصور Bi Sexuality کے نظریہ پر مبنی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ Libido کا ایک حصہ ہم جنسی محبت سے چپکا ہوا ہے اور اسے مخالف جنس کی طرف بدلنا آسان نہیں ہے، اور یہ انسان کی فطری کمزوری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ زمانۂ قدیم سے

یہ دونوں رُجحانات غالب رہے ہیں اور مختلف افراد کے یہاں اُبھرتے رہے ہیں۔ اسی لئے دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں میلانِ ہم جنسی کے رُجحانات نہیں پائے گئے۔ البتہ شخصیت کے تدریجی ارتقاء میں کبھی کبھی اس کی گنجائش موجود رہتی ہے کہ دونوں رُجحانات یکساں طور پر ایک آدمی کی شخصیت میں نشو و نما پا سکے۔ اس کے لئے Inherited Oedipus Complex کو بھی جنسی محبت کا پہلا زینہ تصوّر کیا جاتا ہے اور نرگسیت بھی اسی دائرہ میں شامل ہوتی ہے اور ایک ہی جنس کے آدمی سے محبت کرنے کے عمل کو بھی نرگسیت کے دائرہ میں شامل کرنے کی بات کہی جاتی ہے لیکن ادب میں اس کی جو شکلیں ملتی ہیں وہ اس خیال کے برعکس ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ ہم جنسی محبت کے خیالات اور رجحانات کا اظہار ہوتا ہے، عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ وہ Latent Homo Sexuality سے قریب ہے۔ لیکن جن چار کہانیوں کو پیش نظر رکھ کر اس مقالہ میں بحث کی گئی ہے وہ اس بنیادی تصوّر کی آئینہ داری کرتی ہیں کہ 'میلانِ ہم جنسی' ایک فطری رجحان ہے۔ یہ ہر آدمی، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کے اندر پایا جاتا ہے۔ کوئی قوم اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ہر قوم میں اس کی شکلیں بدلی ہوئی ملتی ہیں۔ ہر فرد کے نظریات، طور طریقے اور افعال الگ ہوتے ہیں اس لئے ہم جنسی محبت کے رُوپ بھی ایک جیسے نہیں ہیں۔ اس سے شخصیت کی سنجیدگی بڑھتی ہے۔ اس کی گرمیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر سماجی حالات اور ماحول مناسب نہیں ہے تو اس امر کا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مرض کی شکل اختیار کر لے اور آدمی نیوراتی بن جائے۔ عورتوں میں اس کی موجودگی اور مقبولیت کے اسباب بھی تھوڑے سے بنیادی فرق کے ساتھ ایک ہی جیسے ہیں۔ مخالف جنس سے جنسی رشتہ قائم رکھنا چونکہ سوسائٹی کی نظر میں امر مستحسن نہیں ہے اس لئے جب تک وہ پختہ شعور اور حوصلہ نہ رکھتی ہو، اس طرف اپنی خوشی سے قدم نہیں بڑھا سکتی۔ ایسی سوسائٹی جہاں جنسی پابندیاں عائد نہیں ہیں، وہاں بھی عورت پہلی بار اپنی شعوری خواہش کے ساتھ مخالف جنس کے

آگے سپر نہیں ڈالتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ جنسی اعمال میں اگر استحصال کی شکل و صورت پر غور کیا جائے تو عورت سب سے زیادہ استحصال کا شکار نظر آتی ہے۔ اسی لئے Baleel نے یہ کہا کہ Women & Proletariat are both downtrodden

اس کے علاوہ ایک نہ ایک اندیشہ برابر لگا رہتا ہے۔ آپ کتنا ہی محتاط رویہ کیوں نہ اختیار کریں یہ عمل میکانکی نہیں ہے، کیونکہ اس میں فریقین کے جذبات عقل پر حاوی رہتے ہیں۔ یہ انسانی جبلّت کے اُبال اور اُبھار کا فعل ہوتا ہے۔

اُردو افسانوں کا ایک اہم موضوع جنس رہا ہے اور تقریباً ہر افسانہ نگار نے اس پر قلم اٹھایا۔ خاتون افسانہ نگار بھی اس صف میں شامل ہیں لیکن ان دونوں میں نمایاں فرق حقیقت کی پیشکش اور موضوع کے Treatment کا رہا ہے۔ عصمت، سعادت حسن منٹو اس صف میں سب سے آگے ہیں۔ ان کے یہاں مریضانہ عشق کی تصویریں نہیں ملتیں۔ کرشن چندر کی رومانیت زبان اور اسٹائل کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ کرشن چندر کو ترقی پسندوں نے ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار ثابت کرنا چاہا لیکن آج یہ بُت دھڑام سے زمین پر آگرا ہے۔ اُردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں کرشن چندر سے بڑا سطحی پروپگنڈا کرنے والا اُردو کا کوئی دوسرا ادیب نہیں پیدا ہوا۔ صرف انسان دوستی اور اشتراکی نظریات پر ایمان رکھنے سے ادب میں کسی فن کار کو ابدیت حاصل نہیں ہوتی۔ قرۃ العین حیدر اُن سے بڑی آرٹسٹ ہیں۔ یہ بھی بنیادی طور پر رُومانی اسکول کی فن کارہ سہی لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ کرشن چندر عام طور پر Assimilation کے فن کو نہیں برت سکے۔ اس کے برعکس مس حیدر نے اُسے خوبی سے پیش کیا۔ اسی طرح بہت سے حلقوں میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ بیدی کا اپنا لہجہ ہے، اُن میں بڑی گہرائی اور گیرائی ہے۔ بیدی کا یہ فلسفیانہ لب و لہجہ فتویٰ صادر کرنے سے زیادہ کا مستحق کا نہیں۔ بیدی میں جنسی لذّت چھپی ہے۔ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ جب تک عورت کے جسم کو لہولہان نہ کیا جائے اُسے جنسی تسکین نہیں ملتی، اسی لئے میں نے عرض کیا کہ ان کے یہاں جنس آرٹ کے طور پر استعمال نہیں

کیا جاتا بلکہ جنسی ہیجانات کی کیفیت موجود رہتی ہے۔ یہی خوبی واجدہ تبسّم کے یہاں ہے، جو بیدی سے بھی زیادہ سطحی اور لچر ہے۔ اُردو کے ان افسانہ نگاروں نے جنس کی ضرورت، اس کی تہہ داری اور پیچیدگیوں کا صرف ایک رُخ پیش کیا ہے۔ اس کے برعکس خاتون افسانہ نگاروں نے بڑی سنجیدگی اور سُبک روی کے ساتھ چھلکوں کو مغز سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو آنے والا عہد بتائے گا کہ ان کا ادب کی تاریخ میں کیا مقام ہے، لیکن جنسی جبلّت کے جس پہلو کی طرف اس مقالہ میں بحث کی گئی ہے وہ یقیناً جنسی حقیقت نگاری میں ایک نئے اور اہم باب کا اضافہ ہے۔

(ڈاکٹر شمس۔ اختر)

لزبین نامہ

"آجاو افریقہ"

کا

ایک باب

کشور ناہید

لزبینزم کی اصطلاح ـــــ گزشتہ تین دہائیوں سے فضا میں گونج رہی ہے۔ مگر اس پر باقاعدہ نفسیاتی اور معاشرتی تحقیق نہیں کی گئی۔

بلکہ بہت ملکوں میں تو فیمنزم اور لزبینزم کو مترادف سمجھ کر بیان کیا گیا۔

اگلے صفحات میں لزبین عورتوں کے ساتھ گفتگو، نفسیاتی پس منظر فراہم کرتی ہے۔

کانفرنس شروع ہونے سے ایک دن پہلے اخباروں میں شہ سُرخیاں تھیں

" لزبین کو کانفرنس میں شرکت کی اجازت نہیں ملی سولزبین عورتوں کے وفد پر کانفرنس ہال میں داخل ہونے پہ پابندی۔"

اگلے دن کانفرنس یونیورسٹی کے لان میں بڑے بڑے پوسٹرز اور پمفلٹ لئے بہت سی خواتین لان میں بیٹھی پریس کانفرنس کر رہی تھیں " ہمارے حقوق سلب نہیں کئے جا سکتے "۔ " ہمیں مرد کے حکم پر نہیں چلایا جا سکتا "۔ "ہمیں اپنے بدن کو استعمال کرنے کے حق کی آزادی چاہیے۔" " ہمیں جنسی تعلق کی آزادی چاہیئے۔" " ہم مرد کے نیچے رہنے کی پابند نہیں ہیں۔"

کچھ لوگ سنجیدگی سے اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔ کچھ تمسخّر کے انداز میں ان کو دیکھ رہے تھے۔ یہ سارے انداز عورتوں ہی کے تھے کہ اس وقت سارے منظر میں عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ جو دو چار مرد تھے وہ نہ اس مسئلے کو اور نہ ہی عورتوں کو بہت سنجیدگی سے سمجھ رہے تھے۔ نہ محسوس کر رہے تھے۔

خبر شور کا اثر ہوا۔ کانفرنس کے منتظمین کو اعلان نامہ جاری کرنا پڑا کہ کسی عورت کے داخلے پہ پابندی نہیں ہے۔ سب عورتوں کو اجازت ہے۔ اپنا نقطۂ نظر پیش کریں۔ اگر کانفرنس کے ایجنڈے میں ان کا موضوع شامل نہیں تو پھر وہ لان پر یا بیس ٹینٹ میں اپنا موضوع زیرِ بحث لا سکتی ہیں۔

لزبین عورتوں نے لان میں اپنا مرکز بنایا۔ ہر وقت ایک جمگھٹا ہوتا تھا۔ جو

ان کے آس پاس رہتا تھا۔ فوٹو گرافرز، ٹیلی ویژن کیمرہ مین، رپورٹرز، ملک ملک کی خواتین اور بڈھے بڈھے مرد۔ وہ خواتین بہت سنجیدگی سے اپنا مقصد، نصب العین اور کارکردگی پہ بات کرتیں اور کوئی تمسخرانہ انداز ان کے احساس کو باطل نہیں کر رہا تھا۔

میں اس معاشرے کی پروردہ تھی جہاں میں نے اسکول کی استانیوں کو اور لڑکیوں کو استانیوں کے پیچھے جنسیانہ مسکراہٹوں سے پیچھا کرتے اور ایک دوسرے کے لباس کی تعریف کے بہانے ایک دوسرے کے جسم پہ ہاتھ پھیر کر بے تحاشہ ہنستے دیکھا تھا۔ میں نے اپنے گھروں میں غراروں میں ملبوس، بالوں میں چاندی اترتی اور دولہا کے انتظار میں سرہانوں پہ Good night کاڑھتی عورتوں کو گاہے بگاہے غرارے کے پائنچے سے اپنی انگلیوں سے زندگی کاڑھنے کا عمل کرتے دیکھا تھا۔ یہ ساری باتیں بچپن اور جوانی کی یادوں میں اس لئے دب گئیں کہ پھر زندگی نے مدمقابل مرد کو پایا۔ اور سارے حوصلے، سارے مسئلے اور لذتیں اس ایک مرکز سے کشید کرنے کی کوشش نے اتنے بھنور اور اتنے تھپیڑے دیئے کہ اپنے وجود کی یکتائی فراموش ہوگئی۔ اب جو ان خواتین کا اعلان نامہ پڑھا تو سمجھنے کو بھی جی چاہا۔ سوال اُٹھے کیا مرد سے نفرت ہی اس کا سبب ہے۔ کیا یہ مرد سے بیزاری کے باعث ہے؟ کیا مرد کے وحشیانہ جنسی رویّے نے عورت کو اکتاہٹ کی منزل پہ لا کھڑا کیا ہے؟ کیا یہ عورت کی بالواسطہ بزدلی کا اعلان نہیں ہے؟ کیا یہ فطرت کے خلاف چلنے کا اضطراری عمل نہیں ہے؟ یہ سوالات میرے ذہن میں اس وقت بھی اُٹھے تھے جبکہ میں امریکہ گئی تھی اور امریکی لزبین خواتین سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر چونکہ میں غالب کی طرفدار نہیں تھی اور ان کے سارے قصّوں کو حیلے بہانے سمجھ رہی تھی اس لئے میں اپنی پسند کے نتائج اخذ کرتی رہی۔ میری پسند کی بنیاد کو مستحکم کرنے میں ایک اور اہم خاتون کا ہاتھ بھی تھا۔ اور وہ خاتون تھی سیمون دی بوار، اس کی کتاب Second sex. ترجمہ کرتے ہوئے مجھے لزبین عورتوں سے کوئی ہمدردی یا

ان کے موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

مگر اب میں نے کانفرنس کی شرکار کو بھی اس موضوع کی سمت بہت دلچسپی لیتے اور لزبینزم کو عورتوں کی آزادی کا سمبل قرار دیتے ہوئے دیکھا، تو اتنی ساری عورتوں کا متفق ہونا جنون کی علامت نہیں بلکہ کسی نفسیاتی ردِ عمل کا جواز معلوم ہوا۔ میں نے پہلی دفعہ ارادہ کیا کہ لزبینزم کی وجوہات معلوم کروں گی اور ان خواتین سے اپنی وابستگی ظاہر کروں گی تبھی میں کسی نتیجے پہ پہنچ سکوں گی۔

اس کا حل اور بھی جلدی ممکن ہو گیا۔ مجھے جنوبی افریقہ کی خواتین نے اپنے جلسے میں نظم پڑھنے کی دعوت دی۔ میں نے نظم پڑھی اور جب میں واپس اپنی سیٹ کی سمت جانے لگی تو وہاں اور لوگ بیٹھ چکے ہیں۔ زمین پہ بیٹھی عورتوں نے کھینچ کر مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ ایک عورت نے بڑی زور سے میرے گال پر بوسہ دیا اور دوسری نے ایک پمفلٹ آگے بڑھایا۔ اس پر لزبین لٹریچر لکھا تھا۔ بوسہ دینے والی خاتون بولی "ہم پہ بھی کچھ لکھو۔ ہمارے پرچے کے لئے بھیجو"۔ میں مسکرائی۔ دوسری نے فوراً ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بہت نرم اور گداز ہاتھ۔

مجھے خواتین کے ساتھ سہیلیوں کی طرز پر دوستی کا کبھی شوق نہیں رہا۔ مجھے عورت اور مرد دونوں میں دوستی کی سطح پہ صرف ایک چیز متاثر کرتی رہی ہے اور وہ ہے ذہنی ہم آہنگی۔ اور یہ یاد بھی نہیں رہتا کہ یہ عورت ہے کہ مرد۔ مگر ذاتی سطح پر مرد کے تعلق کو بہشتی زیور سے لے کر سیمون دی بوا کی تعلیمات تک، اوّل و فائق سمجھا۔ یہ الگ بات کہ اس تعلّق اور فوقیت کے تحرک نے بڑی بڑی اذیتیں دیں۔ بڑے بڑے کچوکے دیئے اور بڑی جگہوں پر سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا۔ زندگی نے تعلّق کو نفرتوں کے پلڑوں میں تلتے دیکھا۔ اور خاموش رہی۔ زندگی نے جنس کو اکتاہٹ زدہ چیچڑوں کی طرح ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے دیکھا اور خاموش رہی۔ زندگی نے بدنوں سے کپڑے ایسے اترتے دیکھے جیسے دھوبی کو دھلنے کے لئے دیئے جائیں۔ زندگی نے میکانکی سطح پر بولے جانے والے مکالموں کو مفقود کر کے، صرف اور صرف جسمانی ضرورت کو سوکھے لقمے کی طرح نگلتے دیکھا اور خاموش

رہی۔ مگر وہی زندگی اس نرم ہاتھ کی گرمی کو بدن میں اُترتا محسوس کر رہی تھی۔ مجھے لگا یہ عورت اپنے ہاتھوں کو اتنا محبّت سے لبریز رکھنے کے لیے بڑے بڑے لوشن لگاتی ہوگی۔ بڑی کریمیں استعمال کرتی ہوگی۔ ہاتھوں کو بڑا ایلیٹ کر چھپا کر رکھتی ہوگی۔ یا پھر ___ یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی قسم کے کام کو بھی ہاتھ نہ لگاتی ہو۔ کبھی برتن نہ مانجھنے پڑے ہوں۔ کبھی برتن نہ دھونے پڑے ہوں، کبھی کپڑے دھوتے ہوئے، اس کے ہاتھ سوڈے سے نہ کٹے ہوں، کبھی جھاڑو دیتے ہوئے یا ٹاکی پھیرتے ہوئے اس کے ہاتھ سخت نہ ہوئے ہوں، کبھی ہنڈیا پکاتے ہوئے اس کے ہاتھ نہ جلے ہوں، کبھی سبزی کاٹتے ہوئے اس کے ہاتھ میں طرح طرح کے ٹَک اور چیرے نہ لگے ہوں، کبھی سلائی کرتے ہوئے اس کی پوروں میں سوئیاں نہ چبھی ہوں۔ کبھی کبھی ...... یہ ساری باتیں اپنی جگہ۔ مگر ہاتھ میں گرمی کیسے! جذبے کی حدّت کیسے! مجھے اپنا وجود قربت کی آنچ سے نیا ہوا کیسے محسوس ہو رہا ہے۔ قربت ___! میری شادی کو پچیس برس ہو گئے۔ مجھے مَردوں سے ملتے ___ پچیس برس ہو گئے ___ مجھے لوگوں سے ہاتھ ملاتے پچیس برس ہو گئے۔ میرے وجود نے یہ پہلی دفعہ ہاتھوں کی نرمی کو کیسے محسوس کیا ___ میں نے تو بڑی بڑی بیگمات اور اصحاب سے ہاتھ ملایا ہے۔ وہ بیگمات جو خوشبوؤں سے نہاتی اور پھولوں پہ بیٹھتی ہیں۔ وہ اصحاب جو لوگوں کی قسمتوں کو بدل سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو لوگوں کی قسمتوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں ان کے ہاتھ میں بھی گرمی محسوس نہیں کی۔ کبھی تپش محسوس نہیں کی۔ کبھی محبت کا شائبہ نہیں گزرا۔ میرے وجود کہ جس نے بے چینیوں کو بچپنے کا نام دے کر آنکھیں چرانی سیکھ لی تھیں۔ اس نے آج ایک لمحے کو کتنے زمانوں کے تجزیے میں لے لیا تھا!!!

میں نے اُس کا نام پوچھا "لینا" ___ مُلک "کریبیئن آئی لینڈ" "تم ہم پہ کچھ لکھو گی" ___ پھر وہی سوال تھا! "ہاں" میری سوچ کے برخلاف ___ میرے منہ سے نکلا۔ "مجھے بتاؤ تو ___ تم مرد سے نفرت کیوں کرتی ہو؟"

"نفرت ___ ہم مرد سے نفرت تو نہیں کرتے .... مرد کو ہماری ضرورت

نہیں۔ مرد کے لئے عورت ضرورت نہیں رہی۔ مرد کو عورت صرف اپنی انا کی تسکین کے لئے چاہیئے۔ مرد کو احساس اور سپردگی کی طمانیت کے لئے عورت نہیں چاہیئے۔"

"مگر کیوں نہیں۔ سارے مرد عورتوں سے پیار کرتے ہیں۔ عورتوں سے بیاہ کرتے ہیں۔ عورت کے ساتھ سارے ڈرامے، کردار، لوازمات بناتے ہیں۔ کیسے کہتی ہو۔ کیوں کہتی ہو۔ مرد کو عورت نہیں چاہیئے میں نہیں مانتی۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی چیخ پڑی۔

اس نے پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر میرے بال اوپر کئے۔ میرے گال پہ خوبصورت اور ہلکا سا بوسہ دیا۔ مجھے گکھڑ کا "عصمت دری ہاؤس" یاد آگیا۔ ہمارے اور تمہارے معاشرے میں ۱۳ سال کا لڑکا، اپنی مردانگی آزمانے لگتا ہے۔ مجھے یقین ہے تمہارے معاشرے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

"نہیں — ہمارے معاشرے میں مردانگی آزمانے کا ہنر چھپ کر کیا جاتا ہے۔ آخر یہ حرامزادیاں نوکرانیاں، دودھ والیاں، جمعدارنیاں کس کام آئیں گی۔ یہ نیچ قوم ہوتی ہی اس لئے ہے۔ وہ شور مچائیں تو عزت داروں پہ بہتان لگانے کے الزام میں کبھی جیل، کبھی تھانے اور کبھی زندگی سے آزاد ہو جاتی ہیں۔"

"مگر ہمارے یہاں — کرسٹینا — بغیر کسی احتجاج، بغیر مشتعل ہوئے بولی، شادی کی عمر تک پہنچتے پہنچتے مرد، عورت کے رشتے کی سنسنی خیزی ختم ہو جاتی ہے۔ اب مرد کو عورت سے لذت کشید کرنے کے لئے، کچھ اور لوازمات تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ عورت کو چابک مار کر شہوت دلانا، عورت کا جسم داغ کر، اس کی چیخوں سے لذت کشید کرنا، عورت کے بالوں کو کھینچ کر اور اس کے بدن پہ طرح طرح کے نیل ڈال کر سکون محسوس کرنا اور عورت کے ساتھ جنسیت کرنے کے لئے ہر طرح کے قدرتی طریقوں کو چھوڑ کر غیر قدرتی رویّوں کو آزما کر، لذت حاصل کرنی اور مردانگی کا علم بلند کرنا۔ یہ ساری باتیں بھی قبول کر لی جائیں، اگر مرد عورت کی استواری رہے۔ اگر اس کی بول چال میں پاسداری کی جھلک ملے۔"

"سنو...... تمہارا نام ...... پر تمہارا وہی نام ہے جو میرا ہے۔ ہم سب محسوس کرنے والی کڑھنے والی عورتیں ہیں ...... مگر میں نہیں ...... سنو کشور ناہید...... میں نہیں۔ میں...... لینا...... ادھر دیکھو...... یہ کرسٹینا...... یہ میرا...... یہ گزادا۔ یہ اور سب ...... اس حصار سے باہر آگئی ہیں ...... اب مرد کی ذات ...... ان کی شریعت سے باہر ہے۔"

"مگر کیسے ...... کیونکر ...... بھلا کس طرح ...... قدرت ...... فطرت ...... بائیولوجی ...... علم الابدان ...... نفسیات ...... پرورش ...... قانونِ فطرت ......"

"اور ...... شٹ ...... یہ کیا ہے ...... سب مرد کی Interpretation۔ نفسیات سے لے کر مذہب تک ...... جو لکھا مرد نے لکھا ...... جیسا چاہا مرد نے لکھا۔ فلسفہ ہو کہ تاریخ، نفسیات ہو کہ علم الابدان، کائنات ہو کہ جغرافیہ ...... ہر چیز کی تعریف و توضیح مرد نے کی، جیسے چاہی ...... جیسے منظور کی ...... عورت نے اسے یاد کیا ...... زندگی کا عملی جامہ بنایا، اعتبار کیا اور خود کو ان اشاروں پر نچایا جو اس کے لئے مقرر کئے گئے۔"

"مگر ساری تاریخ کہتی ہے کہ یہ دو افراد، عورت، مرد، ایک دوسرے سے جدا ہوئے حصے ہیں۔ جو دوبارہ ایک دوسرے سے مل جانا چاہتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کی تلاش میں رہتے ہیں۔"

یہ جو تمہارے ہمارے ملکوں میں زبردستی ڈولی بٹھا کر ہاں کروا کے عورتیں ہانک دی جاتی ہیں۔ یہ جو بڈھے جاگیرداروں سے بیاہ دی جاتی ہیں، یہ جو ہر رات بیچی جاتی ہیں۔ ہمارے جیسے مغربی ملکوں میں سڑکوں پہ کھمبوں کے نیچے، بکنے کا اشتہار بن کر کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ یہ دو بدنوں اور دو روحوں کی تلاش ہے۔ یہ ......

"لینا غصّے سے بے قابو بدن کو مٹھیوں کو بھینچ بھینچ کر، قابو کرتے ہوئے نڈھال ہو کر گھاس پر لیٹ گئی۔ گزادا نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوما، اس کے ہونٹ چومے، اُس کی آنکھوں پر بوسہ دیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگی "تم نظمیں جھوٹی لکھتی

ہو! تم ذہنی طور پر مرد کی غلام ہو۔ تمہاری ساری نفسیات غلام کی نفسیات ہے۔"

میرا مسئلہ تو یہ ہے کہ مرد کی حاکمیت اور ذہنی برتری کے تصور سے نالاں ہوں۔ مگر جنس کے سلسلے میں مجھے Self help بالکل اچھا نہیں لگتا۔ مجھے تو اور بہت سے Taboos توڑنے ہیں۔ اور بہت محاذوں پر لڑنا ہے۔ مجھے یہ محاذ اپنا محاذ نہیں لگتا۔ اور پھر میں سمجھتی ہوں کہ یوں رجعت پسندوں کی عورتوں Segregate کرنے کی پالیسی کو تقویت حاصل ہو گی۔ ہمارے ملک میں تو پہلے ہی محلوں میں خادمائیں اور محل سرا رکھنے کی روایت ہے۔ ہمارے ملک کی اخلاقیات تو محلوں میں کھیروں اور لوکی کے داخلے تک پر پابندی لگانے کی سفارش کرتی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ہمارے ملک میں تو Lesbianism ایک ضرورت کے طور پر فروغ پاتی رہی ہے، برداشت کی جاتی رہی ہے اور اس کی موجودگی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔

"تو عیب منظور — حق نامنظور — برائی عورت کے سر — بھلائی عورت کا مقدر نہیں" کرسٹینا نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے ہنس کر کہا۔ آؤ چلو ...... کمرے میں چل کر بیٹھیں ...... وہاں اطمینان سے بات کریں گے۔ کہو چلو گی کہ ڈرتی ہو۔ گزادا نے زور سے ہنس کر کہا۔

"بالکل چلوں گی" میں نے بہت اونچے انداز میں کہا۔ مجھے اپنی ہی آواز کی دروغ گوئی اور خوفزدگی بری لگی۔ مگر ساتھ ہی بزدلی سے مرعوب نہ ہونے کے عہد نامے نے مجھے ان کے ساتھ چلنے پہ مجبور کر دیا۔

کمرے کی فضا پہ بے ترتیبی حاوی تھی۔ مگر کارنیشن کے پھول میز پہ آویزاں تھے۔ کمرے میں موجود چاروں پلنگ اکٹھے تھے۔ سب پلنگوں پر کمبل اور تکیے ایسے اکٹھے تھے کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سا کمبل کس پلنگ کا ہے۔ میں نے مزید بے تکلفی برتتے ہوئے پلنگ پر دراز ہونے کا فیصلہ کیا۔ کرسٹینا میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ میں ڈر گئی۔ وہ میرے ڈر کو بھانپ گئی۔ زور سے ہنسی، لزبین عورتیں، بھوکے مردوں کی طرح دست درازی نہیں کرتی ہیں۔ تم اتنی Tense کیوں ہو" اس نے میرے بازو پکڑ کر سیدھے کئے۔

میری زبان سوکھ گئی۔ مگر ڈر چھپا کر میں نے چوڑی سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر جمالی۔ اس نے میرے ماتھے پر سے بال ہٹائے۔ بھنویں صاف کیں۔ منہ پہ اس طرح ہاتھ پھیرا کہ میرا جی چاہا کہ پھر ذرا میری تنی رگوں پہ ہاتھ رکھے اور میرے تھکے اعصاب کو سکون پہنچائے، کانوں کی لووں کو آہستہ آہستہ مساج کرتے ہوئے اس نے آہستگی سے پوچھا "کبھی کسی مرد نے تمہارے چہرے پہ سیکس کے علاوہ کچھ تلاش کیا۔" میں دبک سی گئی۔ جھوٹ بولنے میں مہارت کے باوجود میرے پاس جواب میں گردن ہلانے اور وہ بھی انکار میں گردن ہلانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے پلٹ کر میرے پیروں کے تلووں پہ انگلیاں پھیریں اور ایک ایک انگلی میں چھپے درد کی گہرائیوں کو بغیر کسی لفظ کے ادا کئے محسوس کیا۔ میرے وجود میں بوجھ اور بڑھ گیا۔ میں نے جھلا کر کہا "تم مجھے امپریس کرنے کی کوشش مت کرو۔ مجھے جذباتی مت کرو۔ میرے اندر ٹھہری پیاس مت جگادو۔"

کرسٹینا نے چیتے کی سی تیزی کے ساتھ میرے اوپر لیٹتے ہوئے مجھے چوم کر فوراً پیچھے ہٹتے ہوئے کھڑے ہو کر مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ گھورتے ہوئے بولی "بس ذرا سے لمس سے گھبرا گئیں۔ مرد کو یہی تو فرصت نہیں ہوتی کہ وہ ان نزاکتوں میں پڑے۔ وہ دیکھے اس عورت کے رویئے رویئں میں کونسی چاہتیں نچھاور ہونے کو اور کونسی چاہتیں جذب ہونے کو بیتاب ہیں۔ اُسے تو بس اتنی فکر ہوتی ہے کہ وہ اپنے جنون اور جوش سے رہائی حاصل کرے۔ اگر کر سکے تو۔ ورنہ لاکھوں کمزور مرد، عورت پہ ایسے حملہ آور ہوتے ہیں کہ جیسے بڑے "رانی خان" ہوں۔

"مگر...... میں پھر بپھری۔ فطرت، بیالوجی، ایکشن ...... انٹرایکشن —— آخر یہ سب کچھ بھی تو ہیں۔ ان کو کیسے بدلو گی۔"

"اوہ خدایا —— لینا نے میری بات سُن کر سر کے بال پرے کرتے ہوئے زمین پہ اپنا آپ پھینک دیا۔" تم تو یار اپنی ماں کی زبان بول رہی ہو۔ اپنی زبان، اپنے احساس کی زبان تم نے کیوں نہیں سیکھی۔ سنو نیا جذبہ، نیا احساس، نئی لغت، نئی زبان چاہتا ہے۔ بیالوجی کی تعریف جو معاشرے نے متعین کی وہی اور صرف وہی قانونِ فطرت

بھی ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ معاشرے نے عورت کو باور کرایا کہ اس کا وجود اس وقت مکمّل ہوتا ہے جب وہ ماں بن جائے۔ عورت نے ایسے ہی سوچنا شروع کر دیا۔ معاشرے نے کہا عورت، ہر بُرائی اور لڑائی کی بنیاد ہے۔ عورت نے فوراً اقبالِ جرم کر لیا۔ معاشرے نے کہا عورت صبر کی آخری چٹّان ہے۔ عورت نے ہر ظلم اسی نام پہ سہنا شروع کر دیا۔ معاشرے نے کہا کہ عورت کو بننا سنورنا چاہیئے عورت نے سارے عقل کے کام مرد پہ چھوڑے اور بننا سنورنا شروع کر دیا۔

یار تم بھی اپنی عقل سے نہیں، اس بے ہودہ مردانے معاشرے کی لُغت میں بات کیئے جا رہی ہو۔" اچھا یہ بتاؤ ۔۔ کیا تم کبھی مرد کے تعلّق میں نہیں رہیں؟" میں نے بات کو ایک اور رُخ دینے کی کوشش کی۔ کرسٹینا نے سگریٹ سُلگایا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولی "میں شادی شدہ ہوں۔ میرا ایک بیٹا ہے مگر مجھے لزبین ہونا فطری لگتا ہے اور بیوی ہونا، زبردستی۔ میرے اندر کے وجود کو — FREE DOM بھی چاہیئے۔ میں شوہر سے کھُل کر بات کر دوں تو فوراً سوال، یہ تم نے کیسے سیکھا۔ اس کا تمہیں کیسے پتہ چلا۔ تم کو یہ بات کس نے بتائی۔ کسی مرد نے بتائی لگتی ہے۔ تم سے اُس نے ایسے گفتگو کیسے کی۔ آپ کو جان بوجھ کر بے جان، بے رُوح اور بے لذّت انداز اختیار کر کے بیوی بننا پڑتا ہے۔

اچھا بابا ...... تم چاہتی کیا ہو ...... ساری دنیا کی عورتو ایک ہو جاؤ، کے نعرے میں یہ لزبینزم کو کیسے داخل کرتی ہو۔ میں نے عاجز آ کر پوچھ ہی لیا۔

"دیکھو! ہم امن چاہتے ہیں۔ امن — عورتوں، مردوں، بچّوں، سب کے لیئے عزّت چاہتے ہیں۔ اور احساس کی وقعت چاہتے ہیں۔ موجود معاشرتی قدروں کے ان القابات سے رہائی چاہتے ہیں۔ جہاں عورت صرف subject ہے۔"

مگر سُنو، جو عورتیں مردوں سے بھاگیں، انھیں ذہنی پس ماندہ، گھریلو جھگڑوں سے اُکتائی ہوئی۔ نفسیاتی دباؤ کے نیچے پِسی ہوئی اور نوجوان ہوں تو اپنی عصمت باختگی کے بعد، اس راستے پہ چل نکلتی ہیں۔

ارے نہیں۔ بھیڑیئے کی طبیعت کو بھنبھوڑے بغیر چین نہیں آتا، چاہے وہ پلاسٹک کی گڑیا ہی کیوں نہ ہو۔ تم عورتوں کو بھی اور مردوں کو تو سارے زمانے کے، یہ سوچنا ہوگا کہ صرف ان کی ضرورت پوری کرنے کے لئے، عورت نہیں تھی اور نہیں ہے۔ جہاں تک گھروں سے بھاگنے کا تعلق ہے۔ دُنیا بھر میں مرد/لڑکے گھروں سے زیادہ بھاگتے ہیں۔ باہر نکل کر مار پٹائی بھی وہی زیادہ کرتے ہیں۔ گالی گلوچ بھی وہی کرتے ہیں۔ آوارہ گردی بھی ان کے ہی حصّے آتی ہے۔ شراب بھی وہی زیادہ بلکہ اکثر پیتے اور بے ہوش ہو کر نالیوں میں بھی وہی گرتے ہیں۔ سڑکوں پہ بتیاں توڑتے اور بسوں کو آگ لگاتے ہیں۔ اُف سارے راستوں کی موجودگی اور اظہار کی آزادی کے باوجود، عورت پہ بھی جنس کے نام پر ہر طرح کی غلامی روا رکھنا مردانگی سمجھتے ہیں۔ مجھے گھر میں داخل ہو کر محبت چاہیئے، احساسِ جرم نہیں۔ شک کی آنکھ نہیں۔ میری محنت کو شک کی عینک سے دیکھنے والی آنکھ مَیں پھوڑ ڈالوں گی۔"

"ارے رے رے ..... میں پھر صلح و آشتی کا جھنڈا لئے میدان میں اُتری۔ کیا ہے یہ فرائیڈین سائیکالوجی ــــ عورت نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہیں ـ مرد نے بزعم خود اس کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا۔ پورا سماج، مرد، باپ، بیٹا، مذہب، حکومت سب کے سب اخلاق سکھانے نکلتے ہیں تو عورت کو، مرد تو جیسے بد اخلاق، بدمعاش، بد چلن اور ہر برائی بہادرانہ طور پر کرنے کا نمائندہ ہے۔ عورت نکلے تو ترغیب ہوتی ہے۔ مرد نکلے تو یہ اس کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اچھا آؤ مَیں تمہارے استحصالی نظام کے حوالے سے تمہیں سمجھاؤں۔" یعنی ــ وہ کیسے"، وہ ایسے ...... کہ مرد تو جب شہوت جاگے، عورت کی عصمت لوٹ لیتا ہے۔ گھر کی بی بی پر اپنا حکم جتاتا ہے مگر عورت جب عورت کے ساتھ پیار کرتی ہے تو ـ یوں وحشیانہ طور پر حملہ آور ہونے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی ـ وہ یوں دوسری عورت کے ساتھ زیادتی نہیں کرتی ـ اور پھر مرد کو عورت نہ ملے تو اس کے منہ پہ تیزاب پھینک، قتل کر، اغوا وغیرہ ...... یہ ساری حرکتیں کبھی تم نے لزبین کی بھی سُنی ہیں۔

ارے وہ تو عورت اغوا یا قتل اس لئے نہیں کرتی یا کر سکتی کہ جیسا کہ نطشے نے کہا ہے۔ "مرد کی تربیت جنگ کے لئے اور عورتوں کی جنگ میں حصہ لینے والوں کی نگہداشت اور دل بہلانے کے لئے ہونی چاہیئے۔"

"اخ تھو .... تم بنیادی طور پر دقیانوسی خیالات کی حامل نہیں، مگر وہ زنجیر جس میں تم پلی ہو۔ وہ ابھی ٹوٹ نہیں رہی ...... پھر اس نے فرش پر سیدھا لیٹ کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے لمبے سانس لے کر کہا" مرد کے ساتھ پیار میں اپنے آپ کی شناخت گم کرنا، اوّلین شرط ہوتی ہے عورت کے لئے، آپ کو اس کا حصہ بننا پڑتا ہے۔ یہی وہ چاہتا ہے اور یہی معاشرہ۔ مگر عورت کے ساتھ دوستی، عورت کی ذاتی شناخت کو برقرار رکھتی ہے۔ یہ Myth بھی ٹوٹ جاتی ہے کہ عورت اکیلی ہے، ادھوری ہے، اپنی تکمیل کے لئے بے چین ہے۔ لزبین عورت خود اپنے اور اپنے ساتھی کے پیار کی شدّت کو برداشت کرنا جانتی اور سمجھتی ہے۔ یوں آپ دوسرے میں ضم بھی ہوتی ہیں اور خود کو الگ بھی رکھتی ہیں۔ اور چونکہ اسی رشتے کو Social sanction یا Social approval نہیں اس لئے عورت کی جبلّی صلاحیتیں محفوظ رہتی ہیں بلکہ فروغ پاتی ہیں ...... اور پھر عشق و محبّت ــــ تو آپ کے جذباتی وجود کو قائم رکھنے کی بنیاد ہوتی ہے۔ صرف بچّے پیدا کرنے کی تو نہیں ... ویسے معلوم ہے ...... کہ عورت بچّے کم پیدا کرے تو اُسے احساسِ جنس زیادہ ہوتا ہے۔

میں یہ سب نہیں مانتی چاہے یہ میری ڈیلی ہے چاہے میرا کموراد سکوی کہ یہ تو تمہاری طرح اس ایمان کو کتاب میں منتقل کر رہی ہیں کہ لزبینزم کچھ ہوتا ہے۔

"اچھا چلو میں تمہاری ہم مذاق ایڈرین رچ کی بات بتاؤں"۔ ارے وہ تو خود آجکل زبردست لزبین ہو چکی ہے۔

"ہاں جناب ..... اس نے اپنی کتاب میں، جو صرف لزبینزم پہ لکھا ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں عورتوں کو لزبینزم سے ڈرانے کے لئے سخت سزاؤں کی زبردست تشہیر کی گئی، مگر عورت جو مرد کے ہاتھوں جذباتی اور جسمانی طور پر بری طرح ستائی ہوئی تھی، اس نے ناچار، اپنے مجروح جذبات کی پناہ کے طور پر لزبینزم کو تسلیم کیا، پھر اس کے

تجربے نے بتایا کہ انسان کے احساسِ عزّت و محبّت کو باہمی برقرار رکھنے کے لئے ایسے ہی رشتے اور احساس مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ عورت کے اندر بھی، عورت سے تعلّق اور محبّت کے بعد ایک باغ کھلتا ہے۔ جس میں محبت ہی محبت ہوتی ہے۔"

اور سُنو...... میں تو بڑے بڑے فلاسفروں کو جب یہ بے وقوفی کے فقرے بولتی سُنتی ہوں کہ "ہر بڑے مرد کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے" تو اپنا سر پیٹ لیتی ہوں؛ بھلا اُلو کی دُم یہ کیوں نہیں سوچتے اور کہتے کہ ہر بڑی عورت، مرد کو بھی بڑا بنا دیتی ہے، اپنی تربیت سے عورت کو پیچھے رکھنے کے لئے ہر گُر آزمانا معاشرے کے تمام علوم کا مقصد ہے۔

اور ہاں ــــ یہ مرد پہ انحصار کرنے کی شرح کم ہو تو پتہ ہے کیا ہو گا۔ اوّل تو طوائفیت ختم ہو جائے گی، پھر پردہ، زنا، قتل، عورت کو مارنا، قیمت لگانا...... سب کم ہو گا اور پھر ختم بھی ہو جائے گا۔ دیکھو تو کتنی صدیوں ہزاروں کروڑوں سالوں سے عورت، مرد کی ڈبیل بن کر رہی۔ دفا کے سوا، زندگی میں کچھ نہ سیکھا۔ کیا ملا.....؟ عورتیں چونکہ سماجی حالات بدلنے کی طرف مائل ہی نہیں ہوئیں۔ اس لئے مجبور تھیں۔ سب کچھ برضا و رغبت کرنے پہ...... حتّیٰ کہ کمرشلائزیشن میں عورت کو میڈیا پہ اشتہار بنا دیا گیا۔ ہر سودے میں عورت کا چہرہ اور عورت کا بدن استعمال کیا گیا اور اُسے اپنی خواہش کے مطابق نہیں، مرد کی خواہش کی بنیاد پر زندہ رہنے کا لائحہ عمل پکڑا کر کہا گیا۔ جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا......

کانفرنس کے اگلے سیشن کی اناؤنسمنٹ باہر ہو رہی تھی۔ ہم نے کاغذ سمیٹے اور اپنی اپنی اسائنمنٹ پہ روانہ ہو گئے۔

LESBIAN

عدالت : تو نے کیا قتل کیا ہے اس کو؟

عورت : (اس کے ہونٹوں پہ رہی ثبت خموشی کی مہر
اس کی آنکھوں میں تحیّر کے سوا کچھ بھی نہ تھا)

عدالت : کیا نہیں تو نے سُنا؟

عورت : (دھیرے سے

ہاں
میں نے ہی قتل کیا تھا اس کو

عدالت : اس نے کیا جُرم کیا تھا کوئی؟

عورت : ہاں.... نہیں.... کچھ بھی نہیں

عدالت : یہ عدالت ہے یہاں
کچھ بھی چھپ سکتا نہیں
جھوٹ چل سکتا نہیں
کُھل کے یاں بات کرو
جو ترے دل میں ہے ہونٹوں پہ بھی لا
شرم نہ کر

خالد سہیل

عورت : دل کی گر بات بتاؤں
تو بس اتنی ہے کہ وہ مجھ کو بھلی لگتی تھی
اس کی قربت سے مرے دل کو سکوں ملتا تھا
اس کی زلفیں تھیں حسیں
اس کے رُخسار حسیں
اس کی آنکھوں میں چمک
میرے خوابوں کی مکیں
مجھ سے مانوس تھی وہ
میری محبوب تھی وہ
وہ مرے پاس رہا کرتی تھی
اس پہ میں جان دیا کرتی تھی
میں اسے پیار کیا کرتی تھی
عدالت : تو نے کیا سوچ کے پھر اس کا گلا گھونٹا تھا؟
عورت : ایک دن اس نے کہا تھا
"میری شادی کر دو"
میں نے انکار کیا
اس نے اصرار کیا
میری جب بات نہ مانی اس نے
طیش اتنا مجھے آیا کہ گلا گھونٹ دیا
میری ہی گود میں جب
آخری سانس لیا تھا اس نے

میں پشیمان نہ تھی

میں پشیمان نہیں ہوں اب بھی
مجھ کو اتنا تھا یقیں
وہ کسی اور کی ہو سکتی نہیں
وہ کسی اور کی اب ہے بھی نہیں

عدالت : تیرا یہ جرم ہے سنگین بہت
ایک معصوم کو یوں قتل کیا ہے تو نے
اس کی پاداش میں اب موت ملے گی تجھ کو

عورت : (اس کے ہونٹوں پہ رہی ثبت خموشی کی مہر
اس کی آنکھوں میں تحیّر کے سوا کچھ بھی نہ تھا)

عدالت : اک رعایت تجھے دے سکتے ہیں ہم
ہو کوئی آخری خواہش تو بتا دے ہم کو

عورت : بس یہی ایک ہے خواہش میری
آخری بار اسے دیکھ لیں آنکھیں میری
اس کی تصویر دکھا دو مجھ کو
میرے ہونٹوں سے لگا دو اس کو
میں اسے پیار کیا کرتی تھی
اب بھی میں پیار اسے کرتی ہوں !

بین الاقوامی ادب
کے
آئینے میں

لیسبیئن نظمیں

سرِراہ انقلاب لانے کے حربے

جین ہارڈی
ترجمہ : خالد سہیل

اگر میں نے کبھی
کسی راہ چلتی عورت کو روک کر کہا
معاف کیجئے گا
میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ
آپ بہت حسین ہیں
مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے
آپکے چہرے سے آپ کے گھنگریالے سنہرے بال
ایسے لہرا رہے ہیں جیسے
سورج سے اس کی کرنیں
چاروں طرف پھیل جاتی ہیں
آپ بہت خوبصورت لگ رہی ہیں

ہو سکتا ہے کہ وہ
ڈر جائے
اور میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی

پیچھے ہٹ جائے یا
یہ کہتے ہوئے بھاگ کھڑی ہو
تم لیسبیئن ہو
تم بے شرم ہو
کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے

لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مسکرائے
اس کا چہرہ سرخ ہو جائے
شرماتے ہوئے میرا شکریہ ادا کرے
دل ہی دل میں خوش ہو
اور اگلی دفعہ جب وہ آئینہ دیکھے
تو اسے میری بات یاد آئے
وہ میری بات پر یقین کرنے لگے
اور آخر کار
اپنے آپ کو پسند کرنے لگے
مجھے کبھی ایسا کر کے دیکھنا چاہیے
معاف کیجیے گا
میں صرف آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ......

اسکے کپڑوں کو دھونا

کیرالن گیمن
ترجمہ : خالد سہیل

میں نے آج اس کے کپڑے دھوئے
بہت سے کپڑے
چار دفعہ واشر کو بھرا
دو دفعہ ڈرائر کو
کُل آٹھ ڈالر خرچ آیا

میں نے سفید کپڑے ایک طرف رکھے
دوسری طرف
وہ سُرخ قمیص جو وہ پتالوں پر کس کر باندھتی ہے
وہ سبز پتلون جسے پہن کر وہ سائیکل چلاتی ہے
اور
وہ خانوں والی جیکٹ جسے پہن کر وہ کلب جاتی ہے
میں نے سارے کپڑے دھوئے
اور وہ نیلی اور سفید دھاریوں والی قمیض بھی تہہ کی
جسے پہن کر
اس نے سب سے پہلے
مجھے اپنی طرف راغب کیا تھا

••

کیونکہ

شبنم

ترجمہ: خالدہ سہیل

جب میں رو رہی تھی تو
وہ سمجھی
میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے
جب میں پیٹ کے درد سے کراہ رہی تھی تو
اس نے پوچھا
کیا تمہارا ہاضمہ خراب ہے
جب میرا خون بہہ رہا تھا تو
اس نے مجھے نظرانداز کر دیا
جب میں نے کہا تھا مجھے تمہاری ضرورت ہے تو
وہ منہ موڑ کر چل دی

اور اب
نہ میں روتی ہوں، نہ کراہتی ہوں اور نہ خون بہاتی ہوں
اب میں تمام ضرورتوں سے بے نیاز ہو گئی ہوں
میں جذباتی طور پر بے حس ہو گئی ہوں

میری ذات کے سب راستے بند ہو گئے ہیں
اور اب وہ مجھ سے کہتی ہے
مجھے چاہو
اور پوچھتی ہے
تم مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتیں
اور میں کہتی ہوں
کیونکہ ..

پارٹی میں تنہا عورت

جین ہارڈی

ترجمہ: خالد سہیل

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ
بہادری ہے یا بے وقوفی
جب ایک تنہا عورت
شہر سے باہر ایک ایسے گھر کی دعوت میں چلی جاتی ہے

جہاں
دو عورتیں
ایک خواب میں رہتی ہیں
جہاں موسیقی کی دھن پر
عورتیں ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے
رقص کر رہی ہوتی ہیں

چاروں طرف دو دو عورتوں کے جوڑے ہیں
وہ اکیلی عورت
وہ تنہا بھیڑیا بن جاتی ہے جسے
سب کن انکھیوں سے دیکھتے ہیں

اور جب وہ
ایک بھیڑ سے بات کرنے لگتی ہے
جس کی عاشق شراب کا گلاس لینے گئی ہے
تو اس واقعہ کے بعد
سب عورتیں باورچی خانے میں ہی نہیں
غسلخانے میں بھی
جوڑوں میں جاتی ہیں

وہ اپنا رول ادا کرتی ہے
سب کو بتاتی ہے کہ وہ
کئی ہفتوں سے کسی کے ساتھ نہیں سوئی
اور پھر
عورتیں اسے
اپنی عاشقوں کو حاسد بنانے کے لئے استعمال کرتی ہیں
وہ
ایک بھیڑیے کی کھال میں بھیڑ ہے
جس نے اپنا کردار پالیا ہے

••

نئی طرز سے محبت کرنا

(۱)

نسرا اناآ

ترجمہ: خالد سہیل

تمہارے ساتھ
میں وہ تمام باتیں بھول جانا چاہتی ہوں جو میں جانتی تھی
تمہارے ساتھ
میں اونچے مقام سے گر جانے کا خوف
اور
گہری دلدل میں اتر جانے کا ڈر
بھول جانا چاہتی ہوں
تمہارے ساتھ
میں وہ یادیں یاد کرنا چاہتی ہوں
جو میں نہیں جانتی کہ میں جانتی تھی
جن میں
خوشی سے بغلگیر ہونا بھی شامل ہے
اور
خوف کے بجائے مسرّت سے محبت کرنا بھی شامل ہے

اس دفعہ میں
اپنی تمام خواہشات کو ایک ہی نام نہ دوں گی
اس دفعہ
میں جب محبت کے نشے میں مخمور ہوں گی تو
یاد رکھوں گی کہ
تم محبت کا جزوِ اعظم نہیں ہو
اس دفعہ میں
تمہاری ذات کے تمام پیغامات سنوں گی
اور تمہیں
ان راستوں پر جانے دوں گی
جہاں تم اکیلے جانا چاہو گی
اس دفعہ میں
یاد رکھوں گی کہ ہم
ایک دوسرے سے مختلف ہیں ••

---

(۲)

میں گرتی ہوئی ریت کے خیال سے گھبراتی ہوں
جو کوئی ٹھوس چیز نہیں بناتی
میں تمہارے بارے میں سوچتی ہوں
میرے اندر کچھ موم کی طرح پگھلنے لگتا ہے
میں جانتی ہوں کہ وہ ایک خوبصورت جذبہ ہے
لیکن میں
پگھلتی ہوئی چیزوں سے گھبراتی ہوں
کیونکہ
ان کا نہ تو کوئی مرکز ہوتا ہے
نہ کوئی حد
میں نے ہمیشہ اس جذبے کو محبت کا نام دیا ہے
اسی لئے میں کہتی ہوں کہ میں
تم سے محبت کرتی ہوں ••

(۳)

اب جبکہ میں
اپنی ذات میں بہت سی تبدیلیاں لانا چاہتی ہوں
میں اکیلے رہنا چاہتی ہوں
ابھی
تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کا وقت نہیں آیا
میں صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتی
میں اکثر اوقات
اپنے ذاتی کاموں میں مصروف رہتی ہوں
میں بڑے آرام سے گھر کی صفائی کرتی ہوں
سکون سے بال دھوتی ہوں
جب جی چاہے باہر سیر کرنے چلی جاتی ہوں
نئے پردے بناتی ہوں
پہلے میں سمجھتی تھی کہ میں
اپنے گھر کو تمہارے لئے تیار کر رہی ہوں
لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ میں
اپنے اندر آنے والی تبدیلیوں کے لئے
ایک گھونسلہ بنا رہی ہوں ••

(۴)

اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم
ہر کام نئے انداز سے کریں گے
محبت بھی نئے طریقے سے کریں
سونے اور جاگنے کے درمیان بھی
ایک مقام ہوتا ہے
محبت کرنے اور نہ کرنے کے درمیان بھی
ایک رشتہ ہوتا ہے
کیا ہم ایسی قربت
اور ایسا ازلی اور ابدی رشتہ
استوار کر سکتے ہیں
جو جنسی نہ ہو
کیا ہم ایسا جنسی رشتہ قائم کر سکتے ہیں
جو ازلی اور ابدی نہ ہو
کیا ہم ایسی قربتیں اپنا سکتے ہیں
جو ہماری روحوں تک اتر جائیں
کیا ہم ایسا جنسی رشتہ قائم کر سکتے ہیں
جس سے ہماری روحیں مجروح نہ ہوں
کیا ہم نئی طرز سے محبت کر سکتے ہیں
کیا ہم ایسی محبت کر سکتے ہیں
جو ہمیں کسی ایسے کام سے نہ روکے
جو ہمارے دل کرنا چاہتے ہوں

(۵)

سنو میرے لئے ایک کام کرو
اپنے صبر کا پیمانہ نہ چھلکنے دو
آؤ ہم سب ایک دوسرے کی تیرنے میں مدد کریں
اور لہروں کا مقابلہ کریں
عین ممکن ہے کہ ہم ایک دن
تیرتے تیرتے اتنی دور نکل جائیں کہ
ساحل ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے

افسانے

اک طویل داستان

مصنفہ : بیتھ برانٹ

ترجمہ : نصر ملک

"اپنی پرنانی اور پردادی الیزا پاولس اور کیتھرین برانٹ کے نام"

"پچھلے جمعہ کے روز، کم و بیش چالیس ریڈ انڈین بچے یہاں سے ریل گاڑی کے ذریعہ فیلاڈلفیا انڈین اسکول کیلئے روانہ ہوئے ان کے ساتھ حکومت کا ایجنٹ تھا۔ وہ بہت پُر امید دکھائی دیتے تھے۔"

THE NORTHERN OBSERVER
(MASSENA, NEW YORK, JULY 20, 1892)

"مجھے اب سمجھ آنی شروع ہوئی ہے کہ ایک ماں سے اس کے بچے کو چھین لیا جانا کیا معنی رکھتا ہے"

ANNA DEMETER, LEGAL KIDNAPPING
(BEACON PRESS, BOSTON, 1977)

سنہ ۱۸۹۰ء

اس واردات کو رونما ہوئے اب دو دن گزر چکے ہیں جب وہ آئے اور بچّوں کو اُٹھا کر چلتے بنے۔ میرا بدن ابھی تک یخ بستہ ہے۔ مجھے حرارت پہنچانے کے لئے ہمارے تمام کمبل مجھے اوڑھا دیئے گئے اور عورتوں نے انگیٹھیوں میں آگ جلائے رکھی۔ مرد بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ بچّوں کو یوں اچانک اغوا کر لئے جانے سے ہم خوف زدہ تھے۔ "تم نے خود ہی کاغذات پر دستخط کئے تھے" ایجنٹ نے کہا تھا" اسی بنا پر تو ہمیں بچّوں کو لے جانے کا حق مل گیا تھا۔ اب وہ متمدن و مہذب

بن جائیں گے۔" میں اس مہذبانہ پن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اس خوف کے مارے کہ میرے حصّے بکھرے ہوا میں نہ اُڑ جائیں میں نے اپنے آپ کو بھینچ کر اکٹھا کر لیا ہے۔ دوسرے مجھے کھانا کھلانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن کیا وہ میری طرح ایک مردہ عورت کو کھانا کھلا سکتے ہیں؟ میں خاموش، چپ چاپ، ہوں اور میرا منہ جب بھی کھلتا ہے تو محض سانس کی ہوا باہر نکلتی ہے۔ بچوں کے نام پکار پکار کر میری آواز بیٹھ چکی ہے۔ میری آنکھیں کمرے میں مرکوز ہیں۔ مضبوط لکڑی کی دیواریں، مٹی کا فرش، میں یہاں لوگوں کی موجودگی سے تو آگاہ ہوں لیکن میں انہیں دیکھ نہیں سکتی ہوں۔ مجھے "ینومون" جھیل کے اوپری فضا کی طرح یہاں سیاہ، جامد اندھیرا ہی نظر آرہا ہے۔ درمیان میں میرے بیٹے اور بیٹی کو گاڑی پر بٹھائے جاتے لمحوں کی تصویر ہے۔ میری بیٹی نے گہرا نیلا بھاری پہناوا پہن رکھا تھا۔ تمام لڑکیوں کا لباس ایک ہی جیسا ہے۔ ان جیسی آنکھیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ ابھی تک میرے ذہن میں نقش، آگ لگائے ہوئے ہیں۔ میرا بیٹا، اس کے بالوں کی تراشیدگی، بالکل ایک سفید فام کی طرح لباس پہنے ہوئے۔ اس کے بازو اور ٹانگیں کپڑوں سے یوں ڈھکی ہوئی ہیں کہ اُسے پسینہ آرہا ہے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر ہے۔ چیختے چلاتے اتنے بہت سے بچے، ہمارے سروں پر چمکتے ہوئے سورج کی تمازت اور ہمارے بدنوں کو جھلساتی ہوئی لو، ریل گاڑی کی کان پھاڑنے والی آواز اور کبھی کبھی ایک تمسخرانہ بھونڈے قہقہے کی طرح سنائی دیتی ہوئی اس کی آواز، ریل گاڑی کے اندر سے نکلتے ہوئے دھوئیں، دھول اور گرد و غبار کے بھبھوکے، اتنے بہت سے لوگ اور اتنے بہت سے بچے! عورتیں یوں کھڑی ہیں جیسے عبادت میں مصروف ہیں۔ ہمارے ہاتھ بلند ہیں اور ہماری ہتھیلیوں پر دھول جمی ہوئی ہے۔ ہماری ہتھیلیاں آسمان کی جانب متحرک ہیں اور ہماری انگلیاں ریچھ کے پنجوں کی طرح بند ہو رہی ہیں۔

میں اب دیکھتی ہوں۔ میں نے اپنے بیٹے کے بال اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھے ہیں۔ میں اس کی لٹوں کو آپس میں رگڑتی ہوں وہ لٹیں میرے ہاتھوں سے پھسلنے لگتی ہیں۔ آگ کی چمک کالے بالوں کو جیسے متحرک کر رہی ہے۔ وہ میری انگلیوں سے پھسل کر سانپ کی

طرح زمین پر کنڈلی زن ہو جاتے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں میرا خاوند اِن لِٹوں کو اٹھالیتا ہے اور انہیں کپڑے میں ڈال لیتا ہے۔ وہ ہمارے بیٹے کے ٹکڑے پرے لے جاتا ہے۔ وہ باہر نکل جاتا ہے۔ لوگوں کی آنکھیں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ میں دیکھتی ہوں وہ شراب کی ایک بوتل تلاش کرنے لگ جاتا ہے۔ عورتوں میں کچھ اس کا ساتھ دینے لگیں گی وہ سبھی گاتے یا روتے سسکیاں بھرتے رات گزار دیں گے۔ یہ سب کچھ ایک جیسا ہی ہے۔ میں سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔ نہ بچوں کے ہنسنے کی آواز اور نہ ہی ان کے کھیلنے کودنے کا شور۔ یہاں تک کہ اب کتّے بھی خاموش ہو چکے ہیں۔ وہ ہر دروازے کی راہداری پر بیٹھے منتظر ہیں۔ مجھے بچوں کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔ وہ روتے ہیں، چلا رہے ہیں، دُعائیں کر رہے ہیں ــــ وہ مجھے پکارتے ہیں ــــ

"ماں" ــــ میں ان کی آوازیں سُن رہی ہوں ــــ "ماں! ــــ ماں!"۔

سنہ ۱۹۷۸ء

میں خواب سے بیدار ہو جاتی ہوں۔ خواب میں میری بچّی مر چکی ہے۔ اُس کا باپ مجھے اُس کا بدن ٹکڑوں میں واپس لوٹاتا ہے۔ وہ اس کا دل خود رکھ لیتا ہے۔ میرا خیال ہے میں چلّاتی ہوں ــــ "پیٹریشیا" ــــ میں بستر پر بیٹھ جاتی ہوں اور یوں ہوا پھانکنے لگتی ہوں جیسے یہ مجھے تقویت دے گی۔ خواب ہوا میں موجود ہے۔ میں بیٹی کے کمرے کی طرف جانے کے لئے اُٹھنے لگتی ہوں۔ ایلین مجھے بستر ہی میں رکھتی ہے ــــ وہ جا چکی ہے ــــ اکیلی، کمرہ خالی ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ خود اس کے اپنے حق میں اچھا تھا ــــ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ وہ صرف چھ برس ہی کی تو ہے۔ ایک معصوم بچّی جسے اپنی ماں کی ضرورت ہے۔ وہ ہم سے پیار کرتی ہے۔ وہ جا چکی ہے، ایسا ہوا ہی نہیں میں اسے مان ہی نہیں سکتی ــــ اور ــــ خدا ــــ میرے خیال میں مَیں مر چکی ہوں۔

کئی راتیں گزر چکی ہیں۔ ایلین مجھے تھامے رکھتی ہے۔ ہمارے سسکیاں کمرے میں ہوا کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔ ہم اپنے بستر میں لیٹیں ایک دوسری کو تسلی

دینے کی کوشش کرتی ہیں۔ میرا ذہن پچھلے ہفتے کے ان واقعات کو جب وہ چلی گئی تھی یاد کرنے اور ان کے بارے میں سوچنے کے سوا کچھ اور کر ہی نہیں سکتا۔ اگر مجھے موقعہ ملتا تو اس ایجنٹ کو قتل کر چکی ہوتی۔ اس نے اسے ہاتھ سے کھینچ کر کار کے اندر دھکیل دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی فاتحانہ دکھاوٹ اس کا اعتراف تھا کہ پیٹر لیشیا اسی کا انعام تھی۔ وہ اُسے ہمارے ساتھ نفرت کرنا سکھائے گا! یقیناً وہ ایسا ہی کرے گا!! میں اس کا پیارا چہرہ دیکھتی ہوں۔ وہ چہرہ جو کار کی پچھلی کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھ رہا ہے۔ اس کے ہونٹ ماں، ماں پکارتے ہیں۔ اس کے گھنے سیاہ بال سُرخ فیتے سے بندھے ہوئے ہیں اور اس کے سامنے کے دونوں بڑے دانت غائب ہیں ـــ اور اس کا وہ گاؤن جس کی جیبوں پر ایلین نے خود اپنے ہاتھوں سے زرد رنگ کے پھول کاڑھے تھے۔ وہ زرد رنگ کی اُدن سے پھول کاڑھنا کتنا پسند کرتی تھی اور پیٹر لیشیا اس کے پھول کاڑھنے تک کتنے صبر کے ساتھ انتظار کیا کرتی تھی۔ ایلین نے اسے نمونے بنانے، پھول کاڑھنے، فرنچ گرہ لگانے اور بخیہ کاری کا ہُنر سِکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ پیٹر لیشیا نے کتنی خوشی کے ساتھ ہر ایک کو بتایا تھا کہ ایلین نے خود اپنے ہاتھوں سے صرف اسی کے لئے پھول کاڑھے تھے۔ وہ اپنے آپ میں پھولے نہیں سماتی تھی۔

میں الماری کا دروازہ کھولتی ہوں۔ کم وبیش ہر چیز جا چکی ہے اور جو چیزیں بچی رہ گئی تھیں وہ بے ترتیبی سے وہاں لٹک رہی ہیں۔ میں وہاں ہینگر سے نیلے رنگ کا ایک لباس اتارتی ہوں اور اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آتی ہوں۔ ایلین اُسے اپنے کمرے میں لے لینے کی کوشش کرتی ہے لیکن میں اُسے پکڑے رکھتی ہوں۔ نرم و گداز نیلے لباس سے میری بیٹی کے لمس کی خوشبو آتی ہے ـــ ایسا درد محسوس کرنا اور زندہ رہنا ـــ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ ایلین! وہ دھیرے دھیرے گنگناتی ہے ـــ "میری، میری، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ وہ مجھے سُلانے کے لئے لوریاں گانے لگتی ہے۔

سنہ ۱۸۹۰ء

ایجنٹ یہاں ایک خط دینے آیا تھا۔ میں نے خوب چلّا چلّا کر اُسے لعنت ملامت کی اور گالیاں بھی دیں۔ جونہی وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہونے لگا میں نے اس کے چہرے پر خاک بھی پھینک دی۔ اس نے مجھے ایک پاگل عورت اور مخبوط الحواس خبطی سمجھتے ہوئے متنبہ کیا ــــ "ابھی بہتر ہے تم معاملہ ٹھیک کر لو"ــــ وہ میرے ساتھ کیا کر لیں گے؟ میں دیوانی ایک عورت! یہ خط میرے ہاتھوں کے لئے تکلیف ہے۔ یہ ان کی متنفرانہ زبان میں ایک شیطانی تحریر کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن پھر بھی اس میں میرے لئے ایک پیغام ہے۔

میں سڑک کے کنارے کنارے اپنے بھائی کی طرف چل دیتی ہوں۔ وہ سفید فاموں کے لئے کام کرتا اور ان کی زبان اور باتوں کے معنی سمجھتا ہے۔ اپنے بدن پر مضبوطی سے اپنی چادر لپیٹے میں اپنے بھائی کے بارے میں سوچتی چلتی جا رہی ہوں۔ اب سردی ہے اور جلد ہی یہاں برف پڑنے لگے گی۔ مکئی خشک ہو چکی ہے اور اس کے بھٹے ہمارے کیبنوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ انہیں جلد ہی استعمال کیا جانے لگے گا۔ اناج کبھی نہیں بدلتا۔ میرا بھائی بدل چکا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے میں بھی بدل گئی ہوں اور میں اپنے قبیلے اور خاندان کے لئے باعث شرم و ننگ ہوں۔ اس کا کہنا ہے مجھے قسمت و تقدیر کو قبول کر لینا چاہئے۔ میں بچّوں کی چوری (اغوا) کو اپنی قسمت و مقدر کو کیوں سمجھ لوں۔ میں ایسے مقدر پر یقین نہیں رکھتی۔ یہ شیطانیت ہے۔ ہمارے گاؤں میں بہت کچھ غلط ہے۔ میرا بھائی کہتا ہے کہ میں پاگل عورت ہوں کیونکہ میں ہر شام آسمان کی طرف منہ اٹھا کر فریاد و نوحہ گری کرتی ہوں۔ وہ ایک بے وقوف ہے۔ میں تو اپنے بچّوں کو پکارتی ہوں۔ میرے بھائی کا کہنا ہے کہ لوگ مجھ سے خوف کھانے لگے ہیں کیونکہ میں ہوا سے باتیں کرتی ہوں اور ایسے ہنستی ہوں جیسے سر کے اوپر کائیں کائیں کرتا ہوا پہاڑی کوّا ہو۔ میں تو بچوں سے باتیں کرتی ہوں۔ انہیں میری آواز سننے کی ضرورت ہے۔ میں انہیں خوش کرنے کے لئے ہنستی ہوں۔ وہ ہمارے لئے روتے ہیں۔

یہ خط میرا ہاتھ چلا رہا ہے۔ میں جلدی جلدی اپنے بھائی کی طرف جا رہی ہوں۔ اس نے اپنے گھر کے دروازے پر سے بھیڑیئے کا نشان ہٹا دیا ہوا ہے۔ وہ ان لوگوں کی طرح ہونے کا دعویٰ کرتا ہے جو لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ دن بدن بچے چوری کرنے والوں کی ہی طرح کا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ تک نہیں سکتا۔ وہ میرے ہاتھ سے خط لے کر اُسے پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ میرا ذہن منتشر اور خیالات درہم برہم ہیں۔ اس خط کے بھیجنے والے دو اجنبی، مارتھا اور دانیال ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وہ مہذبانہ طور طریقے سیکھ رہے ہیں۔ دانیال کھیتوں میں کام کرتا ہے اور اسکول کے لئے اناج پیدا کرتا اور غلّہ اگاتا ہے۔ مارتھا کھانا پکاتی ہے اور اُسے "ایپرون" سینا سکھایا جا رہا ہے۔ وہ اسکول ماسٹر کی بیوی کے ساتھ رہنا شروع کر دے گی۔ وہ ایک — "LIVE — IN — GIRL" ہوگی۔ یہ کیا ہوتی ہے؟ میں اپنا سر جھٹک دیتی ہوں۔ الفاظ مجھے ایسے ہی سُنائی دیتے ہیں۔ مارتھا اور دانیال سے خوف کھانے لگتی ہوں۔ یہ اجنبی جو میرا نام جانتے ہیں، میں خوف کھانے لگتی ہوں۔ میرے دست و بازو سن ہو جاتے ہیں۔

میں اپنے بھائی کے ہاتھوں سے خط چھین لیتی ہوں۔ وہ مجھے گھورنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھیں ایک نمک حرام کی طرح اُبل رہی تھیں۔ وہ مجھے پکارتا ہے — "ایمی! ایمی!" — یہ میرا نام نہیں! میں سڑک کی طرف بھاگتی ہوں — یہ میرا نام نہیں ہے! مارتھا کوئی نہیں ہے! — دانیال کوئی نہیں ہے! یہ ایک شیطانی جادوگری ہے۔ مجھے اپنے ہاتھوں میں خط شدّت سے جلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اپنے کیبن پر پہنچ کر میں جلدی سے زمین میں ایک گڑھا کھودنے لگتی ہوں۔ زمین سخت اور ٹھنڈی یخ ہے لیکن میں اپنے ناخنوں کے ساتھ اُسے مسلسل کھودے جا رہی ہوں۔ میرے ہاتھ کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔ میں خط کو پھاڑ کر اس کے پُرزے زمین میں داب دیتی ہوں۔ وہ مٹی کے نیچے دب کر مٹی ہی بن جاتے ہیں۔ مارتھا اور دانیال دونوں نام مٹی میں دب چکے ہیں۔ میں آسمان کی طرف دیکھتی ہوں۔ وہاں مجھے حدِّ نظر تک پھیلے ہوئے نیلے رنگ کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ رنگ میری آنکھوں کو اندھا کر دیتا ہے۔ میں چیخنے لگتی ہوں۔

۱۹۷۸ء

کام سے فارغ ہو کر جب میں گھر پہنچی تو مجھے پیٹریشیا کا خط ملا۔ میں نے کافی بنائی اور ایلین کرنے اور وقت گزاری کے لئے اپنے اپارٹمنٹ میں اِدھر اُدھر پھرنے لگی۔ نیچے جُھکتے، اوپر اٹھتے ہوئے میری کمر میں ریڑھ کی ہڈی درد کرتی ہے۔ اپنے کام پر کاروں کے دروازے چمکاتے ہوئے اور ان کے ہینڈل کے پیچ کستے ہوئے بھی مجھے یہ درد محسوس ہوتا ہے۔ اپنے کام کی وجہ سے میں لوگوں کے سوالوں سے محفوظ رہتی ہوں۔ ہاں بعض نوجوان میرے ہی خرچ پر مجھے مذاق کرتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ آہستگی و نرمی سے میرے کاندھے یوں چھوتے اور دباتے ہیں گویا وہ میرا حال جانتے ہیں۔ کچھ عورتیں ہمدردی میں مسکراتی یا پھر آنکھیں پھیرے رہتی ہیں۔ بات چیت کوئی بھی نہیں کرتا۔ یہاں کسی کے پاس بات چیت کے لئے وقت ہی کہاں ہوتا ہے۔ باتوں کے لئے تو جگہ ہی نہیں ہے۔ یہاں تو کام کی وجہ سے پیدا ہونے والا شور ترابہ ہی سانس اور فضا پر چھایا رہتا ہے۔

ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آتے جاتے ہوئے خط میرے ہاتھوں میں ہے۔ آخر کار میں کھانے کی میز کے ساتھ کرسی پر بیٹھ جاتی ہوں اور خط کو اپنے ہاتھوں میں اِدھر اُدھر پلٹتی ہوں ـــ پیٹریشیا ـ کی تحریر، بے ڈھنگی، ناہموار اور لمبے لمبے حروف پر مشتمل ہے۔ لفافے پر ڈاک ٹکٹ بھی آدھی جڑی ہوئی ہے۔ یوں جیسے اس پر گوند ہی اتنی لگی تھی اور محض بے خیالی اور بے دلی سے چپکا دی گئی تھی۔ مجھے بچی کے خط کا اگرچہ ہمیشہ ہی انتظار رہتا ہے لیکن ہر بار جب خط آتا ہے تو مجھے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔

مجھے ایلین کے دروازہ کھولنے کے لئے کنجی گھمانے کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ وہ قدم اٹھاتی کچن میں آ گئی ہے۔ اس کے کپڑوں سے ہسپتال کی دوائیوں کی مہک آ رہی ہے۔ وہ میری طرف بڑھتی ہے۔ اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ بدل رہے ہیں۔ اس کی ہسپتال کی وردی پر سلوٹیں پڑی ہوئی ہیں اور کہیں کہیں داغ لگے ہوئے ہیں۔ اس کے بھورے بال فرینچ انداز میں ماتھے سے اوپر پیچھے کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ خط آیا ہوا

ہوا ہے۔ میں نے اُسے ایک بوسہ دیا اور کافی کے لئے دو مگ اٹھا کر میز پر لے آئی۔ ہم نے ایک دوسری کو دیکھا اس نے میرا ہاتھ تھام کر اُسے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اس کی بادامی آنکھیں اس کے گول چہرے پر اس کی قائم مزاجی کے ثبوت و اظہار میں چمک رہی تھیں۔

میں نے خط کھولا۔ "پیاری ماں — میں خیریت سے ہوں۔ ابّو نے مجھے ایک نئی بائیسکل لے کر دی ہے۔ میرے سامنے والے دونوں دانت اب اُگ رہے ہیں۔ میری سالگرہ منانے کے لئے ہم دادی ماں کے پاس جا رہے ہیں۔ ابّو نے مجھے نئے جوتے بھی لے کر دیئے ہیں۔" اس نے اپنے خط میں ایلین کے بارے میں نہیں پوچھا۔ میں تصوّر میں دیکھتی ہوں کہ اس کا باپ اس کے سر پہ کھڑا اُسے بہلا پھسلا رہا ہے اور اُسے اُکسا بھی رہا ہے۔ خط کی تحریر بھدّی و بھونڈی ہو گئی ہے۔ میں نے اسے پرزے پرزے کر کے کھڑکی سے باہر ہوا میں بکھیر دیا ہے۔ ہوا خط کے اِن پرزوں کو لے کر رفو چکّر ہو گئی ہے اور اس نے انھیں گلی میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا ہے ایک کار کاغذ کے اِن پرزوں پر سے گزرتی اور ان کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے انہیں گندی کیچڑ میں داب جاتی ہے — وہ کیچڑ کا حصّہ بن جاتے ہیں۔

ایلین ایک سرد آہ بھرتی ہے — "میں چلتی ہوں — اگر ابھی میں بہتری ہے تو میں چلتی ہوں" میں تیزی سے اس کا بازو تھام کر اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیتی ہوں۔ شام کا دھندلکا کمرے میں داخل ہو کر ہمیں ڈھانپ لیتا ہے — "مت جاؤ۔ مت جاؤ —" اس کی گھٹی ہوئی بیٹھ مجھے اپنے ہاتھوں میں تھرتھراتی ہوئی لگتی ہے — "او! میری، میں تمہیں کتنا پیار کرتی ہوں۔" آنسو ہماری آنکھوں سے بہہ رہے ہیں ہمارے ہونٹوں اور زبان پر نمک کا ذائقہ ہے۔ ہم ایک دوسری کے سراپے کو دیکھتی ہیں ہم نے ایک دوسری کو یوں بھینچ رکھا ہے کہ بس "یک بدن دو قالب" کا محاورہ ہمارے ہی لئے بنا ہو۔ ہم ایک دوسری سے چمٹی ہوئی اپنی ذات کی گہرائیوں میں کھوئی ایک دوسری کی ان جگہوں کو چھوتی ہیں جو درد سے بھری ہوئی ہیں یہ وہ جگہیں ہیں جو خوف، غصّے، گناہ اور احساسِ تنہائی سے بہت آگے ہیں۔

ہم اپنے کمرے میں جاتی ہیں۔ مجھے اب یہ پھر خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ سورج تقریباً ڈھل چکا ہے اور کرنیں لکڑی کے بھورے، خاکی سبز رنگ کے فرش سے

ہم آغوش ہیں ۔ قالیچے پر جنگلی جانوروں کے نمونے بنے ہوئے ہیں ۔ ڈریسر پر رکھا ہوا خاکدان گرم ہے ۔ گل فروش سے خریدا ہوا خشک پھولوں کا ایک گلدستہ تھامے ، مجھے وہ بوڑھی عورت یاد آتی ہے جو مسکراتے ہوئے بڑی تیزی سے پولش زبان میں باتیں کرتی ، پھولوں کو اخباری کاغذ میں لپیٹ رہی تھی ۔

ایلین میرے کپڑے اُتارتی ہے ۔ ہمارا مشترکہ درد اور اس کے لئے میری چاہت و خواہش کو سمجھتے ہوئے وہ بستر کی چادریں درست اور اس کی سلوٹیں ٹھیک کرتی ہے ۔ اس کے ہاتھ ایسے اشارے کرنے لگتے ہیں جیسے کام کرتے وقت کئے جاتے ہیں ۔ وہ مجھے نرم بستر پر لِٹا دیتی ہے ۔ میں اسے کام کی وردی اتارتے ہوئے دیکھتی اور اس کی مدد کرتی ہوں ۔ ایک نرس کے لئے ایک مددگار کی طرح ـــــ روح کے ایک شفا دہندہ کی مانند ۔ وہ سر تا پا مکمل عریاں ، برہنگی کے ساتھ میری طرف بڑھتی ہے ۔ میرے ہاتھ منحنی انداز میں اُٹھتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو تھامے سر سے بلند ہو جاتے ہیں ہم آپس میں یکبدن کھڑی ہیں اس کے دل کی دھڑکنیں مجھے اپنے دل سے اُٹھتی محسوس ہوتی ہیں ۔ اب وہ میرے اُوپر لیٹی مجھے اپنے دل کی دھڑکنوں سے ڈھانپ لیتی ہے ۔ ان دھڑکنوں کی تال مجھے اور متحرک کرتی ہے ۔ مجھ میں پھُرتی بھر دیتی ہے ۔ ہمارے درمیان اس امن و دوستی سے مطمئن ، میں اب لیٹ چکی ہوں ۔ میں نے اپنے اُوپر جھکے ہوئے اس کے چاند جیسے چہرے کو دیکھا اور مُسکرائی ۔ اس کے لمبے بال کھل کر لہراتے ہوئے میرے پستانوں کو چھو رہے ہیں اور میں خود اب اس کے پستانوں کو اپنی مٹھیوں میں بھینچ کر اپنے منہ میں ڈال لیتی ہوں اور انھیں ایک عورت کی طرح چوستی ہوں ، حسرت و آرزو کے ساتھ ، پھُرتی سے بڑے اعتماد و ایمان کے ساتھ ـــــ ہم دونوں آپس میں یوں یکبدن ہیں کہ جیسے جڑی ہوئی ہوں ۔ تکئے پر ہمارے بال آپس میں گتھم گتھا ہیں ، بھورے ، سیاہ نقرئی بال ۔ ان پر سورج کی آخری کرنیں بوسہ دے رہی ہیں ۔

ہم ایک دوسری کو بے تحاشا متشدّدانہ چومتیں ، بدنوں کے حسّاس و لطیف حصّوں کو چھُوتیں ، آپس میں اپنے بدنوں کو رگڑتیں اور اپنی شہوانیت کے مرکز کی طرف راغب ہو جاتی اور انہیں متحرک کرتی ہیں ۔ وہ اپنے ہونٹوں سے میرا بدن چاٹتی ، بدن کی اُٹھان اور ڈھلائیو مرل

پر رکھتی، ان پر بوسے دیتی، ہر درد کو دور کرتی چلی جاتی ہے — قریب، قریب — بہت ہی قریب، اک دوجی کی قربت میں، اکٹھی یکبدن — دو عورتیں۔

میری ٹانگوں کی حرارت انھیں آتش زار بنائے ہوئے ہے۔ میں اپنی ذات کی گہرائیوں سے اس سے ہمکلام ہوں۔ میں اپنے آپ میں پگھلتی اس میں جذب ہوتی جا رہی ہوں۔ اس کا منہ میرے لئے شفا بخش ہے اور اس کا دل، دھرتی کی طرح وسیع و کشادہ ترین۔ ہم ایک طرح سے بازو اور لہراتی ہوئی محوِ رقص ہیں۔ میرے مرکزِ حیات سے، میرا نمکین و سیال مادہ نکل کر بہنے لگتا ہے، شیریں و پُرلذّت، جس سے اس کا حلق تر بتر ہو گیا ہے۔ یہ میری زندگی ہے۔ ایلین، میں تم سے محبّت کرتی ہوں۔ میری، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں محبت کرتی ہوں، ہم محبّت کرتی ہیں۔

۱۸۹۱ء

چاند پورا ہے اور ہوا ٹھنڈی۔ یہ خنکی میرے پٹھوں سے چمٹ جاتی ہے۔ میں اپنے کپڑے اُتار کر انہیں سوکھی ہوئی مکئی کے کھیتوں میں آگ میں ڈال دیتی ہوں۔ میں نے اپنے بال بھی کاٹ دیئے ہیں۔ میں نے اپنے بال اس چاقو سے کاٹے ہیں جو میں لوگوں کی آنکھوں سے چھپائے، اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی۔ میں نے چاقو کے تیز پھل سے اپنی ٹانگوں، بازوؤں اور پستانوں پر زخم لگا لئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سرخ دریاؤں کی طرح میرے بدن سے خون نیچے بہنے لگتا ہے۔ مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ میں اپنے بالوں کے گچھے آگ کے شعلوں میں پھینکتی ہوں۔ جلتے ہوئے جانوروں کی بُو میرے نتھنوں میں بھر جاتی ہے۔ ستاروں کو چھُو لینے کے لئے آگ کے شعلے بلند ہوتے ہی، لوگ مجھے دیکھنے کے لئے گھروں سے باہر نکل آتے ہیں — پاگل عورت۔ ہوا کی یخ بستگی مجھے چھُوتی ہے۔

اپنے بچّوں کو تلاش کرتے ہوئے میں جب ریل گاڑی میں سوار ہونے لگی تو انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ سفید فام مرد نے میرے خاوند کو تنبیہہ کی کہ وہ میری نگرانی کرے۔ میں خطرناک ہوں۔ میں مسلسل قہقہے لگاتی ہوں۔ میرا خاوند صرف بوتلیں کھولنے، انھیں دوسروں کو

پیش کرنے اور اپنا غصّہ نگل جانے میں اچھّا ہے۔ وہ ہکّا بکّا منہ کھولے، خاموش، مجھے دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں بے حس و حرکت مُردنی ہیں۔ وہ کیبن پر حیران باہر مکئی پر ۔۔۔ نظر گاڑے ہوئے ہے۔ وہ سرگوشیوں میں ہمارا نام لیتا ہے اور بچّوں کے پیچھے آوازیں دیتا ہے۔ وہ ایک مُردہ آدمی ہے۔

وہ ہمارے بچّوں کو کہاں لے گئے ہیں؟ میں اپنے دروازے سے گزرنے والی سڑک پر ہر گزرنے والے سے سوال کرتی ہوں۔ عورتیں آتیں اور ہم باتیں کرتی ہیں۔ ہم صرف ایک دوسری سے سوال ہی سوال کرتیں اور پوچھتی ہی پوچھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں وہ کچھ بھی نہیں کرسکتیں۔ سفید فام، ایک بد روح کی طرح ہے۔ وہ یہاں وہاں ہر کہیں ایسے در آتا ہے کہ ہم دیکھ بھی نہیں سکتی ہیں یہاں تک کہ وہ ہمارے سوالوں کو بھی لے جانے کے لئے ہمارے خوابوں میں در آتا ہے۔ اس کے پاس ایسا جادو ہے جو ہماری دواؤں کی مزاحمت کرتا ہے۔ اس کا یہ جادو ہمیں کمزور کر چکا ہے۔ اس میں کیا راز چھُپا ہے؟ انہیں ہمارے بچّوں کی ضرورت کیا ہے؟ انہوں نے اپنے سیاہ چوغوں والے پادریوں کو کئی برس پہلے ہمیں نیا جادو سکھانے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ اپنی صلیب کے ساتھ رم کی شراب لائے تھے۔ یہ بدکاری تھی۔ انہوں نے ہمارے ساتھ جھوٹ بولا اور مکر و فریب سے اپنی شعبدہ بازی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ اگر ہم بھی ان کی طرح "ماننے" والے بن جائیں تو خدا ہمیں معاف کر دے گا۔ یہ خدا بدصورت ہے! اس نے ہمارے نقابوں تک کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس نے ایسی عورتوں کو بھیجا ہے جو چاند پر چلاتی ہیں۔ وہ ہماری قوت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمارے بچّوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں تاکہ انہیں اندر سے بدل کر رکھ دیں۔ وہ ہماری قوت، خوراک د اناج چوری کرتے ہیں۔ وہ ہمارے مقدس منتر، ہماری لوک کہانیاں، ہمارے نام، ہمارا سبھی کچھ چوری کرتے ہیں ۔۔۔ اب رہ ہی کیا گیا ہے؟ باقی تو کچھ بھی نہیں بچا!

میں پاگل عورت ہوں۔ میں آگ کو دیکھتی ہوں جو میرے بالوں کو جلا رہی ہے پھر میں اُن کے چہروں کو دیکھتی ہوں۔ میری بیٹی، میرا بیٹا، وہ میرے لئے ابھی تک روتے

ہیں۔ ان کی آواز اگرچہ دور کہیں کھو چکی ہے لیکن ہوا ان کی فریاد و نوحہ گری اٹھا کر میرے پاس لے آتی ہے۔ آواز میرے ذہن میں کھب چکی ہے۔ میں پھر بھیڑیئے کی طرح چیختی ہوں مجھے خوابوں کا خوف لاحق رہتا ہے۔ جو چیزیں خوابوں میں رونما ہوتی ہیں بہت اذیت ناک ہوتی ہیں۔ میرے خوابوں میں ہوا اور خون ایک رود باد کی طرح بہتے ہیں۔ میرے خوابوں میں سُرخ و نیم سیاہی مائل خون ہوتا ہے ـــــ خون، ہمارے گاؤں کی طرف بہتا ہوا ـــــ سُرخ خون تیزی سے بہہ رہا ہے، سب کچھ اس کے ساتھ بہے جاتا ہے وہاں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ صرف ہوا کی بازگشت، شائیں شائیں کرتی ہے۔ صرف خون سے تربتر دھرتی ہے جو اُسے پھیلنے کے لئے وسعت مہیا کر رہی ہے۔ خون جو ایک ایسی چیز میں بدل جاتا ہے جس کے لئے وہاں کوئی نام ہی نہیں۔ میں کھیت میں کھڑی آگ کو دیکھتی ہوں۔ لوگ مجھے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہم جو کچھ بھی دیکھتے ہیں ابھی تک غیر واضح ہے ـــــ ایک پاگل عورت! اسی نام سے تو وہ مجھے پکارتے ہیں۔

۱۹۷۹ء

اپنے وکیل سے ملاقات کے لئے میں نے ایک صبح اپنے کام سے چھٹی کی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں بڑی لاپرواہی سے گھر آئی۔ مجھے اتنی تنخواہ میں کٹوتی کی بھی قطعاً پرواہ نہ تھی۔ میرے وکیل کا کہنا تھا کہ ہم مزید اب کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ مجھے انتظار کرنا چاہیئے ـــــ انتظار، یوں جیسے اس کے سوا دوسرا کوئی اور چارہ ہی باقی نہیں رہا تھا۔ اس کا بچوں پر قبضہ ہے اور اس بارے میں وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ ہمیں انتظار کرنا اور دیکھنا ہوگا کہ وہ بچوں کے لئے بیک وقت ماں اور باپ کب تک بنا رہتا ہے اور اُسے یہ کردار بنانے میں مزید کتنی دیر لگتی ہے۔ بس میں انتظار کرتی ہوں۔

میں پیٹریشیا کے کمرے کا دروازہ کھولتی ہوں۔ ایلین اور میں اُسے اِس امید پر صاف ستھرا رکھتی اور وہاں چیزوں کی جھاڑ پونچھ کرتی رہتی ہیں کہ وہ بیٹی کو شاید ہمارے ہاں آنے کی اجازت دے دیں۔ زرد اور نیلی دیواریں تمسخر اڑاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ میں کھڑکیوں

کی جانب بڑھتی ہوں اور بڑی سلیقہ مندی سے ان کے پردے نیچے اتارنے لگتی ہوں اور بڑی آہستگی کے ساتھ انھیں پھاڑنے لگتی ہوں۔ میں تباہی کی ان صداؤں سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ اب میں تیزی سے کپڑوں کی دھجیاں اُڑا رہی ہوں۔ جنہیں میں ہاتھوں سے پھاڑ نہیں سکتی انہیں میں دانتوں سے لیر لیر کر دیتی ہوں۔ مزید کچھ تباہ کرنے کے لئے میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہوں۔ میں بستر کی چادریں اکٹھی کر کے انہیں اپنے بازوؤں میں لے لیتی ہوں اور پھر وحشیانہ انداز میں ان کے بخئے ادھیڑتے ہوئے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہوں۔ میرا پسینے سے شرابور بدن، غیظ و غضب اور میری روح کا گہرا زخم مجھے اور مشتعل کرتے اور طیش دلاتے ہیں، بالکل ایک بھیڑنی کی طرح جو ایک شکنجے میں پھنس چکی ہو اور خود کو آزاد کرانے کے لئے اپنی ہی ٹانگوں کو چبا رہی ہو۔ اپنے اندرونی درد و کرب کو مارنے کے لئے میں اپنی چھاتیاں پیٹنے لگتی ہوں۔ میرا حلق میرے اندر کے شور سے بھر چکا ہے اور یہ شور اب باہر نکلنے کی راہ تلاش کرتا ہے۔ میں ایک ایسی چیخ مارتی ہوں جو بھیڑنی کی چیخ میں بدل جاتی ہے اور پھر میرے گلے کے ساتھ ہی یہ آواز بھی گھٹ کر دب جاتی ہے۔ میں اپنا مُکّا اُٹھا لینا چاہتی ہوں۔ میرا مضبوط مُکّا، خاکی گھونسہ، میں اپنے اس مُکّے کو تب تک دُنیا پر برساتے جاری رکھنا چاہتی ہوں جب تک وہ خون ہی خون نہ ہو جائے ــــ خون! جب تک تمام جج، جو ڈھیلے ریشمی چوغے زیبِ تن رکھتے ہیں اور باپ جو بدلہ لینے کے منصوبے بناتے اور ترکیبیں سوچتے ہیں۔ میں یہ مُکّا بازی تب تک جاری رکھنا چاہتی ہوں جب تک یہ سب پس کر خاک نہیں ہو جاتے اور ہوا انہیں اُڑا کر غائب نہیں کر دیتی۔

لفظ "لیسبّین!" ــــ لیسبّین! وہ لفظ جو ان کے لئے ہراسناک ہے اور جو انہیں دہشت باز ــــ اور ہراس باختہ کر دیتا ہے۔ انہیں خوف زدہ بنا دیا ہے۔ ان کے ہاتھوں بچّوں کو تباہ کرا دیتا ہے ــــ ایسا لفظ! جس کا وہ سامنا نہیں کر سکتے ــــ جسے وہ سُن تک نہیں سکتے ــــ ہاں وہ لفظ ــــ "لیسبّین!" میں ہوں ــــ میں، میں خود ہوں۔ پیٹریشیا کے لئے بھی، یہاں تک کہ میں اپنے یوں اس طرح ہونے کو ترک نہیں کروں گی ــــ کبھی بھی نہیں! میں جب کمرے میں بکھرے ہوئے رنگ برنگے چیتھڑوں کے

درمیان جھکتی ہوں تو ــــ اِک گڑیا میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ میری چھاتی سے اِک سسکی نکلتی ہے۔ میرے دل کی دھڑکن اپنے معمول کی رفتار پہ آجاتی ہے۔ میری رگوں میں خون، زندگی و توانائی لئے، گردش کرنے لگتا ہے۔ میں کمرے کو بالکل خالی کر دیتی ہوں اور اس کا دروازہ بند کر دیتی ہوں۔

- کہانی کے عنوان کے لئے "کرسٹوس" کی سپاس گزار ہوں۔
- اِس کہانی کو لکھنے کے لئے "گلوریا انذالڈیوا" کی ہمّت افزائی کے لئے ممنون ہوں۔

●

بیماری کی چھٹی

تحریر: DEBRA RIGGIN WAUGH
ترجمہ: اسد ملک (پاکستان)

اگرچہ میرا گھر تمہارے راستے میں نہیں پڑتا لیکن پھر بھی اگر تم اپنے بھائی سے ملنے کو لاریڈو (Colarado) جاتے ہوئے مجھ سے ملنے آؤ تو کتنا اچھا ہو۔ میں یہ بات بخوبی جانتی ہوں کہ ہم ابھی ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح نہیں جانتیں لیکن میں پھر بھی سوچتی ہوں کہ کیا تم ابھی بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہو جتنا تم مجھے چند ہفتے پہلے چاہتی تھیں جب ہم شمال میں ملے تھے۔

تمہارے آنے کی تیاری میں میں اپنا گھر اچھی طرح صاف کرتی ہوں صاف چادریں بچھاتی ہوں چیزوں کو سلیقے سے رکھتی ہوں میں نہیں چاہتی کہ تم میرے بارے میں سب کچھ جان لو کیونکہ ہم ابھی رشتوں کے اس مرحلے پر ہیں جہاں دوسرے شخص میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ اگر تم میرے آنے سے پہلے گھر پہنچ جاؤ تو تم گھر میں داخل ہو سکتی ہو کیونکہ میں نے ایک چابی میل بوکس (MAIL BOX) میں رکھ دی ہے میں نے اپنے کتے کو بھی سمجھا دیا ہے کہ تم سے خوش اخلاقی سے پیش آئے اور تمہارے جوتوں یا کسی اور چیز کو کاٹنے کی کوشش نہ کرے۔

تمہارے آنے کے دن میں اپنے بوس (BOSS) سے بیماری کا بہانہ کر کے جلد

گھر آجاتی ہوں۔ تم مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہو۔ ہم دوپہر کا کھانا کھانے اور سیر کرنے شہر چلی جاتی ہیں۔ پھرتے پھراتے ہم گے بک اسٹور پہنچ جاتی ہیں۔ اس بک اسٹور میں تم لذتِ آزادی کی کتابوں کے حصے میں کچھ وقت گزارتی ہو لیکن میں نظر انداز کر دیتی ہوں اگرچہ میرے دل کی دھڑکنیں چند لمحوں کے لئے تیز ہو جاتی ہیں۔

جب ہم گھر پہنچتی ہیں تو میں ہولی نیئر (HOLLY NEAR) کا کیسٹ لگا دیتی ہوں۔ مجھے امید تھی کہ ایسا گانا لگے گا جس میں عورتیں ایک دوسرے کو اپنے بازوؤں میں لے کر ناچتی ہیں اور مدہوش ہو جاتی ہیں لیکن غلطی سے ایسا گانا لگ جاتا ہے جس میں نسل کشی اور عورتوں کے مظالم کا ذکر ہوتا ہے۔ میں وہ ٹیپ نکال کر ایسا کیسٹ لگا دیتی ہوں جس میں صرف موسیقی ہوتی ہے گیت نہیں ہوتے کیونکہ میں دوبارہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتی۔

ہم آہستہ آہستہ بستر کی صاف ستھری چادروں کے نیچے پہنچ جاتی ہیں۔ میں لیمپ بجھا کر موم بتی جلا دیتی ہوں لیکن میں جونہی تمہیں بوسہ دینے کے لئے کروٹ بدلتی ہوں چوکلیٹ کے ڈبے کے کاغذ کو آگ لگ جاتی ہے تمہارے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے جب تم مجھے شراب سے آگ بجھاتے دیکھتی ہو۔ وہی شراب جو تمہارے گلاس میں بچ گئی تھی۔ میں ہاتھ دھو کر دوبارہ بستر میں آتی ہوں اور ہم ایک دوسرے کو قربتوں کے اسی مرحلے پر پاتی ہیں جہاں ہم آگ لگنے سے پہلے پہنچ چکی تھیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے شہوانی جذبات کی آنچ میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاتی ہیں اور ایک دوسرے کے بوسوں میں کھو جاتی ہیں۔ تمہارے ہونٹ، میری گردن، میرے بازو، میری بغلوں اور میرے سینے سے اس وقت تک کھیلتے ہیں جب تک کہ میرا ایک بال تمہارے دانتوں میں نہیں پھنس جاتا اور میں "اوئی" کہہ کر چیخ اٹھتی ہوں۔

ہم کافی دیر تک وفورِ جذبات سے چیختی اور ہنستی رہتی ہیں۔ ہم دونوں ڈرتی ہیں کہ کہیں ہم جذبات سے اتنا مغلوب نہ ہو جائیں کہ دل کے راز بتانا شروع کر دیں چنانچہ ہم یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ کپڑے پہنے بغیر جو باتیں بھی کہی جائیں گی اہنیں سنجیدگی سے نہ لیا جائے گا۔

ویکنڈ کے ختم ہونے تک ہم کپڑے پہن کر بھی ایک دوسرے کی محبّت کا اقرار کر رہی ہوتی ہیں اور ویکنڈ بڑھتے بڑھتے پورا ہفتہ بن جاتا ہے۔

میں جب پورا ہفتہ کام پر نہیں جاتی تو میرا بوس سمجھتا ہے کہ مجھے کسی زنانہ بیماری نے آدبوچا ہے۔ خوش قسمتی سے وہ اتنا مہذّب شخص ہے کہ عورتوں سے ذاتی سوال نہیں پوچھتا۔
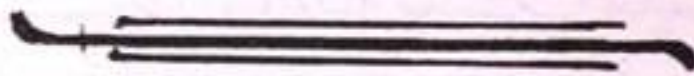
گرٹر کیا ہوئی؟

MARTHA WATERS
ترجمہ: سعید انجم

"تم نے مجھ سے محبت کرنا کب چھوڑا"؟ اس نے پوچھا۔

ہم ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ میری کار پیک کئے ہوئے سامان سے بھری کھڑی تھی اور میں ایک نئی ملازمت کے لئے ایک دوسرے قصبے کے لئے روانہ ہونے والی تھی۔ اس نے کار کے دروازے پر جھک کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ گڑبڑ کہاں ہوئی"۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ یہ سوال بھی پوچھ سکتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ میں واضح طور پر بتا سکتی تھی کہ کب سے میں نے اسے محبت کرنا چھوڑ دیا۔ یا کم از کم اس لمحے کی بابت جب مجھے پتہ چل گیا کہ ہمارا تعلق اب مزید نہیں چل سکے گا۔ یہ تب کی بات ہے جب وہ اپنی نئی گرل فرینڈ کے ساتھ ایک شام گزار کر آئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر اس نے ایک بھرپور بوسہ ثبت کیا اور میں نے کسی غیر کے ان رس بھرے ذائقوں کو چکھا جو ابھی تک اس کے لبوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ ایسی صورت حال کا کم از کم تقاضہ یہ ہے کہ انسان دو عاشقوں سے اوپر تلے ملاقات کے بیچ دانت ہی مانجھ لے، برش کر لے۔

پھر یہ کہ ایک مختلف بستر استعمال کرے۔ میرے لئے اس خاتمے کی دوسری وجہ یہی تھی۔ ایک روز میں کام سے جلدی گھر آگئی۔ دروازے کی کنڈی اندر سے بند تھی۔ میری بے چین دستکوں کے جواب میں بالآخر ایک مشتعل ننگی عورت برآمد ہوئی۔ اشتعال اس لئے کہ میں نے اس کو اطلاع دئے بغیر پروگرام بدلنے کی ہمت کیسے کی۔

اس کے بعد پھر کبھی ہمارے بستر نے مزہ نہ دیا۔ مجھے اپنی سائیڈ ایسے معلوم ہوتی گویا اس جگہ اور وقت کو کرایے پر لیا گیا ہو۔ میں خود کو وہ احمق سمجھنے لگی جس نے اپنی خوش گمانی کے باعث "آزاد" رشتے کو قبول کر لیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کی منطق اسکی ضرورت کے باعث ہمیشہ درست تھی۔ دلیل یہ کہ جنسی تعلقات میں فراوانی کی کمی اسے دیوانہ بنا رہی تھی۔ دراصل میں نے اس بات کا اندازہ ہی نہیں لگایا تھا کہ استعمال شدہ ذائقے اور بُو کے اثرات مجھ پر کیا ہوں گے۔ ہمارا بنیادی رشتہ وہی تھا جس کی عظمت کا چرچا تھا کہ ایک عارضی تعلق کسی بھی دوسرے سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اس کا مطلب یہ تھا کہ سودا سلف خریدنا، کپڑے دھونا میری ڈیوٹی تھی جبکہ محترمہ کو ریستورانوں وغیرہ میں اپنی ملاقاتوں کو جاری رکھنے کے لئے تیاری وغیرہ کرنا ہوتی۔

شاید جاتے وقت مجھے یہ سب کچھ اسے بتا دینا چاہئے تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی ••

DARBY HOOVER

ترجمہ: سعید انجم

ناتہ

میری ماں رو رہی ہے۔ میری ماں ہنس رہی ہے۔ میری ماں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ فون پر مصروف ہے۔ میری ماں کہتی ہے "ڈارلنگ اب میرے ساتھ اس طرح اور مت کرو۔ پلیز۔" میری ماں اپنی آواز میں وہی لجاجت برت رہی ہے جس کے ساتھ وہ مجھے برتن دھونے کیلئے کہتی ہے۔ میری ماں نے مجھے بتایا کہ اس کے ساتھ شادی کرنا لازمی نہیں ہے بلکہ یہی کافی ہے کہ وہ اس کے ساتھ رہنے کے لئے آجائے۔ میری ماں کہتی ہے کہ "میں مزے سے ہوں۔ سچ۔" میری ماں کا بوائے فرینڈ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میری ماں کا بوائے فرینڈ اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے گا۔ میری ماں کہتی ہے "فکر مت کرو ڈارلنگ ـــ مرتے دم تک میں تمہاری ہی مانوں گی۔" میری ماں رو رہی ہے۔ میری ماں ناراض ہو گئی ہے۔ میری ماں ہنس رہی ہے۔ میری ماں کہتی ہے "لیکن یہ تو احمقانہ بات ہوئی۔" مجھے اپنی ماں سے اتفاق ہے۔ میری ماں کہتی ہے۔ "شاید میں بس ہنسوں، تم دونوں پر۔ پھر خود غائب ہو جاؤں۔" میں تصور میں اپنی ماں کو ہنستے ہوئے دیکھتی ہوں جو جنگل میں گھس رہی ہے۔ وہ اپنے بال بکھرنے دیتی ہے۔ میری ماں کہتی ہے "وہ تمہیں بھی پسند کرتی ہے۔" وہ میرے بارے میں بات کر رہی ہے۔ میری ماں کہتی ہے۔ "اب وہ زیادہ مشکل نہیں

نہیں رہ گئی۔" میری ماں کہتی ہے "سرکش۔ توبہ۔" میری ماں کہتی ہے "اس کے بعض عقیدے تمہیں پھر سے تمہارے پیروں پر کھڑا کردیں گے۔" میری ماں کہتی ہے "بابا۔ دایاں۔ لعنت۔ مجھے اب کچھ علم نہیں رہ گیا کہ کیا کیا ہے۔ میری ماں کہتی ہے "اس نے ایک نئی دوستی ڈھونڈلی ہے۔" اس کا مطلب ہے کہ مجھے محبت کے لئے نیا ساتھی میسر آگیا ہے۔ میری ماں کہتی ہے "نہیں یہ جانے والی چیز نہیں ہے۔" اس کا مطلب ہے میں لزبین ہوں۔ میری ماں کہتی ہے "مجھے کیا پروا۔" میری ماں کہتی ہے "وہ میری ہے۔"

تخلیق : بیکی برتھا (BEEKY BIRTHA)
ترجمہ : سائیں سُچا

زندگی میں

گریس کل رات میرے پاس میری نیند میں آئی ۔ میں نے کسی کی موجودگی کو کمرے میں محسوس کیا ۔ پھر مجھے اس ناریل کی کریم اور اس خصوصی تیل کی خوشبو آئی جو وہ اپنی جلد پر لگاتی ہے ۔ میں جانتی ہوں کہ وہ پلنگ کے پاس کھڑی ہے ۔ بالکل میرے اُوپر اور پھر اس نے مجھے پکارا :

"پرل"

میرا پیدائشی نام پرل آئرین جنکز ہے لیکن اب مجھے کوئی بھی اس نام سے مخاطب نہیں کرتا ۔ مجھے دنیا کے لئے جنکسن بنے اتنی مدت گزر چکی ہے کہ اب میں پرواہ بھی نہیں کرتی ۔ میری والدہ کے انتقال کے بعد صرف گریس ہی مجھے میرے پیدائشی نام سے پکارتی ہے ۔

"پرل" اس نے پھر کہا "میں کچھ دیر کے لئے نیچے باغ میں جا رہی ہوں ۔ جلد پلٹ آؤں گی ۔"

میں اتنی گہری نیند میں ہوں کہ جاگنے کے لئے خود سے لڑنا پڑتا ہے اور جب میں پوری طرح جاگتی ہوں تو گریس جا چکی ہے ۔ میں نے اپنی تھکن سے چور ہڈیوں کو اُٹھایا اور انھیں گھسیٹتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے لائی اور پھر تاریک باورچی خانے

سے ہوتے ہوئے پچھلے دروازے کے راستے ڈیوڑھی میں نکلی۔ میرا خیال ہے کہ میں گریس کو وہاں پر اپنا منتظر پانے کی اُمید لگائے بیٹھی ہوں لیکن وہاں تو آج رات کوئی بھی ہستی موجود نہیں۔ ٹڈیوں کے نغموں کے علاوہ وہاں کوئی اور آواز نہیں اور اس پرانے لکڑی کے جنگلے کے سوا جسے مجھے گزشتہ گرمیوں میں رنگ کرنا چاہیئے تھا لیکن جس کے لئے مجھے فرصت نہ ملی مجھے کوئی اور شے نہیں گھور رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے جاکر اپنے آپ کو اس جھولے میں بٹھایا جس میں گریس اور میں گرمیوں کی بہت سی خاموش راتوں میں بیٹھ کر بوڑھے تھامسن کے کھیت پر چاند کو چڑھتا دیکھتی تھیں۔

ان دنوں بھی میرے پاس جنگلے کو رنگ کرنے کا کبھی وقت نہ ہوتا تھا لیکن اس زمانے میں اس کا کوئی فرق نہ پڑتا تھا کیونکہ گریس نے اس پر پھولوں کی بیلیں چڑھائی ہوئی تھیں۔ وہ رات کے وقت اسی جھولے میں بیٹھ کر، جب ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چلتے تھے، کہا کرتی تھی کہ وہ ان پھولوں کی مہک سے ہی ان کا نام بتا سکتی ہے۔ جوں ہی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گریس نے کہا "پرل۔ اس یاسمین کی خوشبو آئی"۔ پھر ایک اور جھونکا کسی اور سمت سے آتا تو وہ فوراً اپنا سر یوں گھماتی جیسے کسی نے پکارا ہو اور کہتی "اوہ! یہ تو میری رات کی رانی ہے"۔

اس کا مجھے بہت لُطف آتا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میں دن کی روشنی میں بھی ان پھُولوں کو نہیں پہچان پاتی تو بھلا آدھی رات کو ان کی خوشبو سے ان کی کیا شناخت کر سکتی۔ میں ایک دھیما سا قہقہہ لگا کر جھولے کو ذرا اُوپر چڑھاتی اور پھر اسے اس مدھم چاندنی میں لطف اندوز ہوتے دیکھتی۔

میں چاہے اسے کتنا کیوں نہ دیکھوں میری کبھی تسلّی نہ ہو پاتی۔ میرے خیال میں گریس میسن ڈکسن علاقے سے شمال کی خوبصورت ترین عورت تھی اور اب میری اتنی عمر گزر چکی ہے کہ میں جانتی ہوں کہ میرا خیال صحیح تھا۔ گریس کے علاوہ میری زندگی میں دوسری عورتیں بھی رہ چکی ہیں اور میں ان سب سے محبّت

کرتی رہی ہوں لیکن وہ کچھ اور ہی تھی ...... گریس تو بس ایک ہستی ہی اور تھی۔

اس کا رنگ کافی سانولا تھا۔ تندور سے نکلی ہوئی گرم گرم ادرک والی روٹی کی مانند۔ درحقیقت میں نے اس کا نام ہی "تندوری لونڈیا" رکھا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر اس سانولے رنگ کے ماس کی اتنی مقدار موجود تھی کہ اسے اپنے بازوؤں میں لینے پر مجھے اپنی آغوش بھری ہوئی محسوس ہوتی اور وہ اس کے گالوں اور جسم کے دوسرے حصّوں کے گڑھوں کے لئے جن کی تفصیل میں یہاں بیان نہیں کرنا چاہتی ایک پیاری زمین مہیا کرتی تھی۔

گریس جب چاہتی دلربا حسینہ کا روپ اختیار کر سکتی تھی۔ مجھے آج بھی اس کی وہ شکل نہیں بھولی جب نئے سال کی پارٹی اسٹار ہاربر بال روم (STAR HARBOUR BALL ROOM) میں منعقد ہوئی تھی وہ پہلا سال تھا جب ہم نے کلب میں شرکت کی تھی اور ان کے ہر پروگرام میں شامل ہوئے تھے۔

بڑے قاتلانہ انداز میں گریس نے وہ سفید ریشمی لباس پہنا ہوا تھا جو اس کی رنگت کو خوب نکھارتا تھا۔ اس نے اپنے بال گھنگھریالے بنالئے تھے۔ گلے میں موتیوں کی ایک لڑی، لمبے دستانے اور ایک چھوٹا سا دوپٹہ اس کے شانے پر تھا۔ ان دنوں ہم دعوتوں کو سنجیدگی سے لیا کرتے تھے۔ میں خود بھی کچھ کم نہیں تھی: کالی کمخواب کی جیکٹ میرے شانوں پر اور پتلون کی کریز اتنی سخت اور تیز کہ کوئی چاہے تو اپنے کو ان پر کاٹ لے۔ میرا وزن بھی ان دنوں آج کل کی نسبت بہت کم تھا۔ بال روم میں گھستے ہی سب سے پہلے ان کا اتنا بڑا فرش نظر آتا تھا جس پر سے سنہرے چوکھٹے والے سیڑھے اُٹھ کر چھت کو چھوتے تھے اور اگر آج بھی میری یادداشت صحیح کام کر رہی ہے تو اس فرش کو پار کرنے میں کافی وقت لگتا تھا۔

اس رات ہر کوئی گریس کے ساتھ ناچنا چاہتا تھا اور مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ آدھی رات کے وقت جب سازندے ایک زبردست دھن بجا رہے تھے تو لوئیس اور میکس (MAX) چہرا لٹکائے میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ میں اپنی عورت کو وہاں پر اجنبی

کے ساتھ کس طرح بے دھڑک ناچنے کی اجازت دے سکتی ہوں۔ انھیں ٹھیک ٹھاک علم تھا کہ وہاں کوئی اجنبی موجود نہیں تھا کیونکہ سنامن اور اسپائس (THE CINNA-MON AND SPICE) ایک مخصوص کلب تھا جہاں شرکت کرنے کے لئے دعوت نامہ ضروری تھا۔

گو ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو دوستوں کو غیروں سے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں لیکن میں کبھی بھی جلاپے کی ماری حد سے زیادہ قابض فرد نہیں تھی۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ گریس کو دیکھتے رہنا ہی میرے لئے دلکش ہوا کرتا تھا۔ مجھے تو اس کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ وہ وہاں اپنے آپ کو بی بی مریم کے ساتھ ہلا رہی ہو، بس اس کی خوشی مقصود تھی اور یہ ہی میں نے لوئیس اور میکس کو کہا تھا۔ میں اس میز پر ٹیک لگائے گھنٹوں اسے دیکھ سکتی تھی۔

اسے دیکھ کر آپ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ اس نے اپنے سارے کپڑے، ہیٹ اور دوپٹے وغیرہ خود سیئے تھے مثلاً اس نے اس شام والا دوپٹہ میری خالہ ماٹلڈا کے ایک لباس سے بنایا تھا۔ وہ اپنے بال بھی ہر دوسرے ہفتے خود بناتی تھی اور میرے بھی اور ہر دفعہ چھیڑتی تھی کہ وہ میرے بال بھی گھنگھریالے بنا دے گی۔ میں تو ناراض بھی ہو جاتی تھی لیکن ایسے شخص سے جو ہاتھ میں گرم گیلی کنگھی لئے کھڑا ہو کوئی کیا بحث کر سکتا ہے؟ بس اس کے رحم و کرم پر رہنا پڑتا تھا۔ میں ان گرم تولیوں کے نیچے بیٹھی اسے کوستی رہتی تھی اور وہ قہقہے لگاتی رہتی "لڑکی" میں اسے کہتی "تم جانتی ہو کہ میری وردی والی ٹوپی کے نیچے میرے بال گھنگھریالے نہیں رہ سکتے البتہ اگر تم چاہو تو میں اس ہفتے گھر رہ سکتی ہوں اور تم اپنا اور میرا کام سنبھال سکتی ہو۔"

ہم دونوں کو ہمیشہ کام کرنا پڑتا لیکن تب بھی ہم کنگال ہی تھے سب سمجھتے تھے کہ جنکسن اور گریس خوب مزے میں ہیں لیکن ہم سدا بچت کا سوچتی رہتی تھیں اکثر پرانی اشیاء کی مرمت کر کے ہی گزارہ ہوتا تھا۔ ہماری آدھی خوراک ہمیں اس باغ سے دستیاب تھی لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ ہم ٹھیک ٹھاک زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ہمیں ایک دوسرے

کی صحبت تو میسر تھی۔

اور اب جب میں نے مکان کی ساری قسطیں ادا کر دی ہیں تو وہ میرے ساتھ یہاں موجود نہیں اور گریس کا بیچارہ لاوارث باغ ہی میری مانند اپنی آخری گھڑی کا منتظر ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو کہ زندگی میں شکایات کرتے رہتے ہیں لیکن سچ پوچھو تو اب یہ میرے بس کی بات نہیں کہ گھٹنوں کے بل چل کر کام کر سکوں۔ یہ میرا جسم اب احتجاج کرتا ہے۔ رات کے وقت تو اب باغ میں کوئی لطف ہی رہ نہیں گیا۔ جب سے محکمۂ بلدیات نے مسٹر ٹومسن کی زمین پر نئی عمارات کھڑی کی ہیں۔ مجھے اب چاند اس وقت تک نظر نہیں آتا جب تک وہ چودھویں منزل سے زیادہ اونچا نہ ہو جائے۔ چاندنی تو اب میرے آنگن میں آتی ہی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے اپنے آپ کو سمیٹ کر بستر میں واپس چلنا چاہیئے۔

اب بھی مجھے کبھی کبھی یقین نہیں آتا کہ گریس گزر چکی ہے گو اس کا انتقال ہوئے تیرہ برس ہو چکے ہیں۔ وہ واحد عورت ہے جس کے ساتھ میں رہی ہوں اور تقریباً اپنی آدھی زندگی گزاری ہے۔ یہ گھر اس کا گھر بھی تو ہے اور اسے میرے ساتھ ہونا چاہیئے!

میں ہر روز چھ بجے صبح اُٹھ جاتی ہوں۔ ویسے ہی جب میں سی ٹی سی کے لئے گاڑی چلاتے وقت اُٹھا کرتی تھی۔ اگر موسم بہت خراب نہ ہو تو میں پیدل ہی چل پڑتی ہوں اور اگر محتاط نہ رہوں تو بارہویں گلی والے اڈے (TWELFTH STREET DEPOT) پر پہنچ کر پتہ چلاتی ہوں کہ مجھے آج کونسی ٹرام ملے گی۔ آج اس اڈے پر مجھے ایک فرد بھی نہیں پہچانتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اب ٹرام چلانے کی بجائے پچھلے پانچ برس سے بس چلا رہے ہیں۔

ان دنوں میں بہت کچھ بھول جاتی ہوں۔ پچھلے ہفتے میں نے دُھلے کپڑے کو رسی سے اُتارا اور انہیں لے کر جب استری کرنے کمرے میں گئی تو میں نے کسی کو پچھلے دروازے سے داخل ہو کر آنگن میں آتے سُنا۔ میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ گریس اسی طرح

گھر میں گھسا کرتی تھی۔ پہلے اپنے باغ کا معائنہ کرتی پھر گھر میں داخل ہوتی۔ میں اسے ہمیشہ چھیڑتی تھی کہ اسے اپنے پھولوں اور مٹروں کا میری نسبت زیادہ خیال ہے۔ جب میں آخری قمیص پر پانی چھڑک رہی تھی مجھے اس کی باہر سے آواز آئی۔ پہلے پتّوں کی سرسراہٹ پھر کسی کا لکڑی کے ڈبے کا گھسیٹنا۔

میں نے استری کے گرم ہونے کے دوران کھڑکی تک جاکر باہر نظر ڈالی تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہاں گریس کی بجائے دو چھوٹے شریر شیطان، جو کہ میدان کی پرلی طرف رہتے ہیں کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک سیبوں کے ڈبے پر چڑھا دوسرے کو اپنے شانوں پر اٹھائے کھڑا تھا اور وہ کمبخت بڑی پھرتی سے میرے پکے ہوئے آڑو توڑ رہا تھا۔ مجال ہے کہ انھوں نے ایک آنکھ بھی جھپکی ہو۔ جب میں نے انھیں کھڑکی سے ڈانٹا مجھے سب سیڑھیوں سے اتر کر استری کی تار گھماتے ہوئے ان کے پیچھے باغ میں بھاگنا پڑا حالانکہ مجھے ڈاکٹر ماتھیو نے ہزاروں مرتبہ کہا ہے کہ مجھے نہ بھاگنا چاہیے اور نہ معمولی باتوں میں اُلجھ کر جوش میں آنا چاہیئے اور سیڑھیوں پر اُوپر نیچے والی دوڑ تو بالکل منع تھی۔

میرے ہاتھوں میں گھومتی تار دیکھ کر ان دونوں کمبختوں میں بھی حرکت پیدا ہوئی۔ نیچے والے نے دوسرے کو اس کے چوتڑوں پر دھب سے گرا کر بھاگتے ہوئے آواز لگائی "خبردار گی! بڑھیا جنکس آ پہنچی ہے"۔

آج اس واقعہ کو سوچ کر مجھے ہنسی آتی ہے گو اس دن میں اتنے غصے میں تھی کہ مجھے ٹھنڈا ہوتے کم از کم آدھ گھنٹہ لگا تھا۔ میں اس سیبوں والے ڈبے پر بیٹھی اُبلتی رہی تھی۔

آخرکار مجھے سمجھ آنے لگی کہ میں ان دونوں بچّوں سے خفا نہیں تھی۔ میں وقت سے ناراض تھی۔ مجھ سے اس قسم کے واہیات مذاق کرنے پر مجھے یہ خیال تک نہ رہا تھا کہ گریس سیمن کو مرے ہوئے تین برس گزر چکے تھے اور میں وقت سے اسی کی تیز رفتاری پر ناراض تھی۔ اگر مجھے کبھی اپنی زندگی دوبارہ

بسر کرنے کا موقع ملے تو میں اس کا ایک سال بھی نہ بدلوں البتہ وقت کی رفتار ضرور کم کر دوں۔

میرے گھر کے قریب گرجے کی مذہبی عورتیں مجھے موت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔ ان کے نظریئے کے مطابق جب کوئی انسان میری عمر تک پہنچ جائے تو بس یہی ایک خیال ان کی زندگی میں کوئی جوش لا سکتا ہے۔ گلیڈیز ہاکنز آج جب میں دروازے کی مرمت کر رہی تھی کچھ دیر کے لئے ٹھہر گئی۔ اس کے چہرے سے خوشی یوں پھوٹ رہی تھی جیسے اس نے وہ رات عیسیٰ کے ساتھ گزاری ہو۔

"صبح بخیر! جنکنز بہن۔ خدا نے آج کتنا سہانا دن ہمیں عطا کیا ہے" مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ ایسے افراد سے جو خدا کو ہر عمل میں داخل کرتے ہیں کیسے گفتگو کروں۔ اگر میں اقرار کروں تو وہ سمجھیں گے کہ میں مذہبی ہو چکی ہوں۔ اگر میں انکار کروں تو وہ سمجھیں کہ میں پاگل ہو چکی ہوں کیونکہ درحقیقت وہ ایک انتہائی خوبصورت دن تھا۔ خوش قسمتی سے میرے انکار یا اقرار کرنے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ وہ خود ہی بڑبڑاتی رہی۔

جانتی ہو اتوار کا دن بلیسڈ اینڈیورنس کے گرجے (BLESSED ENDURA-NCE CHURCH) میں عورتوں کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ حضرت سولومن موڈی آج تشریف لا رہے ہیں اور "عورت کا گرجے میں مقام" پر بولیں گے۔ تم بھی آج عبادت میں حصہ کیوں نہیں لیتیں۔ تمہیں سب خوش آمدید کہیں گے۔"

میرا دل چاہتا تھا کہ اسے صاف صاف کہہ دوں کہ میں نے آج تک کسی عورت کو سلیمان (SOLOMON) کے نام سے نہیں جانا لیکن میں نے شرافت کے تحت اپنی زبان کو قابو میں رکھا۔ ظاہر ہے گلیڈیز کی زبان قابو میں نہیں تھی۔ وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بدلتی رہی۔ "میرے خیال میں تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آج تم پہلے کی مانند جوان نہیں"۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتی تھیں۔ ظاہر ہے ہماری عمریں ایک دوسرے کے لئے راز نہیں تھیں۔ وہ جاری رہی "تم عمر کے اس حصے میں

داخل ہو رہی ہو جہاں تمہیں روحانی معاملات میں پہلے سے زیادہ دلچسپی دکھانی چاہیئے۔"

اس کا اشارہ ان پینتیس برس کی طرف تھا جن کے دوران میں نے کبھی گرجے میں قدم نہیں رکھا تھا۔

" تم جانتی ہو کہ خدا پاک کا کیا کہنا ہے۔ خبردار، تمہیں نہ اس دن اور نہ اس گھڑی کا علم ہے جب ......" لیکن " جو بھی میرے بیٹے پر یقین رکھتا ہے اس کی زندگی امر ہے۔"

اس جیسے انسان سے بحث کرنا کوئی عقلمندی کی بات تو ہے نہیں۔ خدا ہر جھگڑے میں ہمیشہ ان کی طرفداری کرتا ہے اور نہ ہی وہ اپنی کوشش کبھی ترک کرتے ہیں۔ گفتگو کے آخر میں جب اس نے پوچھا کہ کیا ہماری گرجے میں ملاقات ہو گی تو میں نے اسے کہا کہ میں سوچوں گی۔

عجب بات ہے کہ میں آج اس ملاقات کے بارے میں تمام دن سوچتی رہی۔ نہیں، ان خیالات کے تحت نہیں جو کہ وہ جگانا چاہتی تھی۔ آخری مرتبہ جب ہم کسی گرجا میں گئے تھے تو وہ ایسٹر (EASTER) کا دن تھا۔ ہم نے گریس کی ایک خالہ زاد بہن کے اصرار پر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ ہم ایک غیر فطری اور گناہگار زندگی گزار کر ان کے خاندان کی عزت پر ایک دھبہ ہیں۔ لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا مقصد ہمیں کسی گرجے کے اندر لے جانا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کا خیال تھا کہ جب وہ ہمیں گرجے میں لے جائیگی تو خدا ہمیں اپنے سائے میں لے لے گا سو گریس اور میں نے سازش کی۔ اس سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے وہ موقع دے دیا جائے جو کہ وہ چاہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے جنگِ عظیم کے بعد آج تک کبھی اسکرٹ نہیں پہنی اور ظاہر ہے کہ میں بہن ہیٹی کے لئے اپنی زندگی کی عادات نہیں بدلنے لگی۔ چنانچہ اس دن میں نے اپنے آپ کو خوب سجایا۔ میں نے اپنے بہترین درزی کے سلے ہوئے سوٹ کو استری کی اور رات کو خاص ٹوپی پہن کر سوئی تاکہ اگلے صبح میرے لبس ہال صحیح مقام پر ہوں۔ میں نے

گریس کا ایک پھول بھی اپنے کاج میں لگا لیا تھا اور اسٹیٹن کا ایک عمدہ سلیٹی ہیٹ میرے سر پر تھا۔ جب میں تیار ہو گئی تو گریس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی تھی اور کہا تھا:

"آج گرجے میں بہنوں کو پادری کی جانب متوجہ ہونے میں کافی دشواری ہو گی۔"

ہم اس کی بہن کے گرجا میں اس دن جلد ہی پہنچ گئیں لیکن وہاں پہلے ہی ایک ہجوم اکٹھا تھا کیونکہ وہ ایسٹر (EASTER) کا اتوار تھا۔ آرگن کی درد بھری موسیقی نے فضا کو بھر رکھا تھا اور کیا زبردست تھی اس دن کی جماعت ـــ سب کی اعلیٰ ترین کپڑے اور عطر کی خوشبو میز پر رکھے ہوئے پھولوں کی مہک کو مات دے رہی تھی۔

ہمارے گرجے کے دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک ہلچل سی مچ گئی۔ وہ سب پاکیزہ عیسائی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہوئے دائیں بائیں سے مڑ کر ہمیں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ویسے لوگوں کی اس طرح کی توجہ کی گریس اور مجھے تو عادت پہلے سے ہی تھی۔ ہم نے گرجے کے آخر میں ایک خالی جگہ ڈھونڈ لی مگر ہمارے بیٹھ جانے اور اس ہجوم میں گھل مل جانے کے باوجود وہ ہلچل جاری رہی۔ آخر کار پتہ چلا کہ اس دلچسپی کا مرکز میرے سوٹ کا نچلا نصف نہیں بلکہ میرے سر کا سلیٹی ہیٹ تھا۔

آخر اس کھڑے بالوں والے بوڑھے نے جس کے چشموں کی موٹائی کم از کم ایک انچ تھی اپنی گدی سے مڑ کر گریس کو اتنی اونچی آواز میں مخاطب کیا کہ مجھے بھی سنائی دیا۔ "تم اپنی دلربا کو کہہ دو کہ یہاں حضرت عیسیٰ کے مقدس گھر میں اپنا ہیٹ اتار دے۔"

جوں ہی میں نے ہیٹ اتارا پیچھے سے ایک بڑھیا کی آواز آئی "ان جوان لڑکیوں میں حیا ہی نہیں رہ گئی۔ کیا یہ نہیں جانتیں کہ خدا کے گھر میں سر ڈھکنا لازم ہے۔"

یوں لگتا تھا جیسے وہ لوگ یہ فیصلہ ہی نہ کر پا رہے تھے کہ میرے سر کو ڈھکا ہونا چاہیئے یا ننگا۔

میرے لیئے بھی خطاب کے دوران اپنے چہرے پر قابو رکھنا دشوار تھا۔ جب بھی میری نظر گریس سے ٹکراتی یا ہماری نظر اس ہیٹ پر گرتی ہماری ہنسی پھوٹ نکلتی۔ میں اس جگہ سے باہر نکلنے کے لیئے کتنی مضطرب تھی لیکن وہ دن بس امر ہو گیا تھا۔ پورے دو ہفتے

ہم اپنے دوستوں کو اس قصے سے محظوظ کرتے رہے اس دن کے بعد بہن ہیٹی نے پھر کبھی ہمیں پریشان نہیں کیا۔

جہاں تک ابدی زندگی کا تعلق ہے میں وقت آنے پر وہ پل بھی یاد کرلوں گی کسی جلدی کی تو ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ میں جانتی ہوں کہ موت کا بوڑھا فرشتہ ایک دن میرے پاس بھی یوں ہی آئے گا جیسے کہ وہ میری والد، والدہ، گریس اور پچھلے برس میری سہیلی لوئیز کے پاس آیا تھا لیکن میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتی جس سے اسے میرے قریب آنے کی ترغیب ہو۔ ممکن ہے گلیڈیز ہاکنز اور گرجے کی دوسری عورتوں کی رائے مجھ سے مختلف ہو لیکن میرے پاس تو اب بھی زندہ رہنے کو بہت کچھ ہے۔ ایک دماغ جو خوشی کے دنوں کی یادوں سے مالامال ہے۔ جب ہم زندگی میں شرکت کرتے ہیں تو ہمارے دن کبھی بھی بے جان نہیں ہوتے اور نہ ہی راتیں۔ میری عمر رفتہ مجھے بہت عزیز ہے اور یہ تو تم جانتے ہو کہ یہ بڑھیا جنکس اب موت کے بوڑھے فرشتے کی آغوش میں مزاحمت کیے بغیر تو جانے والی نہیں۔

سچ بولوں تو کبھی کبھی مجھے موت کے بوڑھے فرشتے کے متعلق عجیب عجیب خیال آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے وہ پہلے ہی سے یہاں ہو۔ منتظر، اس وقت کے آنے کا۔ ہمیشہ تاک میں جب میں سیڑھیوں پر دم لینے کو رکوں۔ ہمیشہ گھات لگائے جب میری کمر میں اتنا شدید درد ہو رہا ہوتا ہے کہ مجھے اس بستر کو چھوڑنے میں آدھا گھنٹہ مزید لگانا پڑتا ہے اور میں صبح ساڑھے سات بجے نہیں اُٹھ پاتی۔

جس صبح میں نے گلیڈیز سے گفتگو کی تھی اس رات مجھے سونے میں بہت دشواری ہوئی۔ میں بستر میں لیٹی اپنے جوڑوں اور کمر میں درد کم ہونے کا انتظار کر رہی تھی جب میں نے کسی کو گھر کے اندر سنا۔ آواز نیچے سے یوں آئی تھی جیسے کوئی فریج کھول رہا ہو یا کسی نے بتی جلائی ہو۔ مجھ پر غنودگی طاری ہی ہوئی تھی جب میں نے خوابگاہ میں کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ کوئی اپنے پنجوں کے بل دھیرے دھیرے بستر، الماری اور سنگار میز کے درمیان آ جا رہا تھا۔

مجھے اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے خوف محسوس ہوا لیکن یہ گریس ہی تو ہے۔ اپنے پُرانے گاؤن میں، سر پر ایک ریشمی رومال باندھے، اب ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چمکار رہی تھی تاکہ میں جاگ نہ جاؤں۔ میں قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکی "ہیلو تندوری لونڈیا! یہ سر پر رومال باندھے اور کمر پر گاؤن چڑھائے کہاں جا رہی ہو۔ ابھی تو شفق بھی نہیں پھوٹی۔ چلو بستر میں واپس لوٹو۔"

"چلو چلو سو جاؤ" اس نے کہا "میں چند لمحوں کے لئے باہر جا رہی ہوں۔"

مجھے اپنی آواز میں غصّہ بھرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ زمین کے اس ٹکڑے کے لئے اتنی محبّت رکھتی ہے کہ مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ "تم بھلا آدھی رات کو وہاں کیا کرو گی۔ آج تو کوئی چاند بھی دیکھنے کے لئے نہیں۔ تمام شام بادل آسمان پر چھائے رہے تھے اور کل صبح بارش کے امکانات ہیں۔"

"میری فکر مت کرو اور پھر سو جاؤ۔ یہ آدھی رات نہیں سویرا ہونے کو ہے۔"

وہ یوں مسکرا رہی تھی جیسے کسی شرارت پر تلی ہو۔ پھر اس نے کہا۔ "یہ ان کالے اور پیلے کیڑوں کو چُننے کا بہترین وقت ہے۔ وہ میرے کھیروں کو شوربے میں بدل رہے ہیں۔ کل اخبار میں پڑھ لینا کہ کس طرح تمہاری نیند کے دوران نمبر ستائیس بلیک اسٹریٹ کے تمام کالے پیلے کیڑوں مکوڑوں کو فنا کر دیا گیا۔"

ہم دونوں یوں ہنس رہی ہیں جیسے کسی جرم میں شریک ہوں۔ پھر وہ نیچے جاتے ہوئے بولی "میں فوراً سے بیشتر لوٹ آؤں گی۔"

اب دن کی روشنی کمرے میں بھر رہی ہے لیکن وہ ابھی تک نہیں لوٹی۔

میں گریس کو اُوپر بلانے کے لئے کھڑکی کی جانب جاتی ہوں کہ ان نو تعمیر عمارتوں کا عکس میرے دماغ پر چھا جاتا ہے۔ مٹی کی رنگت والے ڈربے ہی ڈربے جو فضا میں اپنی بلندی کے سر اس تھوڑی سی روشنی کو بھی کاٹ رہے ہیں جو یہ ابر آلود صبح اپنے ساتھ لے کر آئی ہے۔

ایک عجیب ڈراؤنا احساس مجھ کو گھیر لیتا ہے۔ میں اپنا کوٹ پہن کر نیچے جا کر

دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا ہوا لیکن الماری میں مجھے نظر آیا کہ وہاں سب کپڑے میرے ہیں۔ فرش پر سب جوتیاں بھی۔ میں چاہتی ہوں کہ اس بارش سے پہلے ہی نہا دھو لوں کیونکہ وہ طوفان آنے کو ہی ہے۔ بہتر ہوگا اگر میں پکے ہوئے آڑو اور ٹماٹر بھی توڑ لاؤں اور اگر میرے گھٹنے اجازت دیں تو خزاں کے لئے چند مٹروں بیج بھی زمین پر بچھا آؤں۔

دوپہر تک بارش آ پہنچی اور مجھے بہت سُست رفتار کر دیا۔ بارش کے دوران میں کبھی بھی کسی مکان کے اندر نہیں رہ سکتی۔ ہمیشہ میرے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتی ہیں۔ اسی لئے میں سی ٹی سی کے لئے اتنے سال ٹرام چلاتی رہی، کیونکہ کسی بھی موسم کی پرواہ کئے بغیر مجھے گھر سے نکلنا پڑتا تھا، لوگ ملتے تھے، دُنیا دکھائی دیتی تھی۔ اور یہ سب کچھ اُس موسم میں ذاتی شرکت کے بغیر۔ سب کچھ اُسے شیشے کی کھڑکی سے نظر آجاتا تھا۔

یوں نہیں کہ مجھے بارش میں باہر جانا پسند نہ ہو۔ میں اُن دنوں محکمہ ڈاک میں نوکری کی متلاشی تھی۔ اُن دنوں میں بھی سیاہ فام لوگ محکمہ ڈاک میں اچھے پیسے بنا لیتے تھے۔ لیکن وہ ہمیں ڈاک بانٹنے کا کام نہیں دیتے تھے۔ ایک کمرے کی پشت میں دفن کر دیتے تھے تاکہ کوئی یہ نہ دیکھ سکے کہ ایک کالی جلد والی لڑکی بھی اتنی ہی رقم بنا رہی ہے جتنی کہ ایک ساتھ بیٹھی سفید جلد والی۔ چنانچہ میں ان تمام سالوں میں سی ٹی سی کے پاس ہی ملازم رہی اور اُن سے اپنی پنشن لے کر ہٹی۔

تین بج رہے ہیں اور بارش جاری ہے، جب میکس نے مجھے فون کیا کہ کیا میں ایون (IVONNE) اور اس کے ساتھ شام کے کھانے میں شرکت پسند کروں گی کہنے لگی کہ انھوں نے ضرورت سے زیادہ مُرغ بھون رکھے ہیں اور ویسے بھی ایون مجھے اپنے ایک منصوبے میں شامل کرنا چاہتی ہے۔ اور بھلا میں گھر سے باہر نکلنے کی دعوت پر خوش ہوں؟ میکس اور ایون کا گھر اُس شام کی محفل کے لئے سجا ہوا تھا اور بھُنے مُرغ کی مہک ان کا دروازہ کھولتے ہی مجھ پر حملہ آور ہوئی۔

ایون کو اگر کبھی بناؤ سنگار کا موقع ملے تو وہ اسے نہیں کھوتی۔ اس نے اپنے سامنے کے بالوں کو گوندھ کر اوپر کی جانب چڑھا رکھا ہے جس میں سے موتیوں کی لٹیں نیچے لٹک رہی ہیں۔ اس کے بدن پر ایک ڈھیلا چوغہ ہے جو یوم آزادی کے دن پر پھلوں والے سلاد کے سب رنگ دکھا رہا ہے۔ میکس اپنی عادت کے مطابق ڈھیلی پتلون اور کھلی جوتی میں ہے۔ میں اسے سالہا سال سے جانتی ہوں۔ مجال ہے اس میں کوئی تبدیلی آئی ہو سوائے اس کے کہ ہم دونوں کے چہروں پر بہت سی جھرّیاں آگئی ہیں اور سروں میں سفید بال۔ ایون ہم دونوں سے کافی چھوٹی ہے۔ اسے اور میکس کو اکٹھا رہتے تین برس ہونے کو ہیں۔

میرے آتے ہی ایون نے اپنا خواتین کے کلب والا منصوبہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ میں نے جب پہلی مرتبہ اس کلب کے متعلق سُنا تھا تو مجھے بھی کچھ دلچسپی ہوئی تھی۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ یہ سِنامن اور اسپائس جیسا کوئی سوشل کلب نہیں بلکہ ایک قسم کا ادارہ تھا۔ ایون اس کو ایک اجتماعی بزم کہتی ہے۔ اس میں کوئی پکنک یا پارٹی یا کسی تفریح کا اہتمام نہ تھا۔ بس ملاقاتیں ہی ملاقاتیں اور منصوبے۔

موجودہ منصوبے میں ان کے کارکن ایک ٹیپ ریکارڈر لئے لوگوں سے گفتگو کر کے اُن کی کہانیاں اکٹھے کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ جو ایک طویل زندگی گزار رہے ہیں اور یہ ان سے دریافت کر رہے ہیں کہ گزشتہ دنوں میں زندگی کیسی تھی۔ میں تو ایون کی پیدائش سے پہلے بھی زندگی گزار رہی تھی لیکن جس لمحے اس نے میرے سامنے مائکروفون رکھا میں ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔

"کچھ کہو نہ جنکس! تم ہمیشہ مزاحیہ قصّے سنایا کرتی ہو۔"

وہ چھوٹے چھوٹے پہیئے گھومتے رہے اور چمکیلی ٹیپ اِدھر سے اُدھر چڑھتی رہی لیکن مجھے ایک بھی قابلِ بیان بات یاد نہ آئی۔

"چلو بتاؤ کہ سِنامن اور اسپائس کلب کیسے شروع ہوا؟"

"یہ تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔"

"تو پھر بتاؤ کہ وہ ختم کیسے ہوا؟ یہ تم نے کبھی مجھے نہیں بتایا!"
"کچھ بھی تو بتانے کو نہیں! اسکیپ اور بیجیز ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے!"

ایون منتظر ہے، ٹیپ چل رہی ہے اور مجھے ایک مزید لفظ بھی کہنے کو یاد نہیں آرہا۔ اور میکس وہاں بیٹھی یوں بتیسی دکھا رہی ہے جیسے میں اکیلی تیس برس سے زیادہ کی ہوں اور اُسے کچھ یاد نہ ہو۔

آخر ایون نے تنگ آکر ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا، اور پھر ہم نے ان کے بھُنے مرغوں اور میری سبزیوں پر چڑھائی کر دی۔ جب ہم آخر میں شکر قندی کی مٹھائی تک پہنچے تو میری یادداشت نے کام کرنا شروع کیا۔ میں نے ایون کو بتایا کہ کس طرح اسکیپ اور بیجیز کا جھگڑا ہوا۔ دونوں ہی ارادہ کئے بیٹھے تھے کہ وہ کلب کو خود ہی چلائیں گے۔ آخر وہ حد آگئی جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ کمرے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں گزار سکتے تھے۔ دونوں متوقع تھے کہ دوسرا غائب ہو جائے گا اور ہر مرتبہ جب ہمارا گروہ اکٹھا ہوتا وہ دونوں نازل ہو جاتے۔ وہ دن بھی آگیا جب ہماری ٹولی کے دوسرے افراد بھی ان کی صحبت سے گھبرانے لگے۔ ہم بہانے بنا کر کوشش کرنے لگے کہ کوئی پروگرام ان کی اطلاع کے بغیر بھی بن سکے، لیکن بیجیز کلب کا صدر تھا اور اسکیپ خزانچی۔ بس یہ سمجھو کہ ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی استعفیٰ دینے کو تیار نہ تھا۔ دونوں میں سے ہر ایک کو یقین تھا کہ اُس کی موجودگی کے بغیر کلب نہیں چل سکتا۔ اور جب ان کا معاملہ ختم ہوا تو ساتھ میں کلب بھی ختم ہو چکا تھا۔

اس گفتگو کے دوران میکس میری چھوٹی چھوٹی غلطیاں ٹھیک کرتی رہی۔ جب ہم اُٹھ کر بیٹھک میں جانے لگے تو مجھے علم ہوا کہ ایون نے ٹیپ ریکارڈر کو اپنی افریقن شال کے نیچے چھپایا ہوا تھا اور میرے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اُس پر محفوظ ہے۔

جب رخصتی کا وقت آیا تو میں یہ دیکھ کر خوش ہوئی کہ ایون مجھے گھر تک اپنی کار میں چھوڑ آنے پر مُصر تھی۔ گو یہ فاصلہ ایک میل سے بھی کم ہے۔ تمام شام بارش

جاری رہی تھی اور وہ بھی موسلا دھار۔ کار سے نکل کر گھر کے دروازے تک پہنچتے ہی میں بالکل گیلی ہو گئی۔

ایوَن سڑک پر پلٹ چکی تھی اور میں ابھی دروازے میں آدھی داخل ہوئی تھی کہ مجھے خیال آیا کہ میں نے تو دروازے پر قفل ہی نہیں لگایا تھا۔ ممکن ہے میرا دماغ اب زنگ آلودہ ہو چکا ہو لیکن ابھی بالکل ختم نہیں ہوا۔ میں جانتی ہوں کہ میں آج بھی اِس قسم کی حرکتیں کرنا شروع کر دیتی ہوں جیسے میں تیس برس پہلے کیا کرتی تھی لیکن میں قسم کھا سکتی ہوں کہ میں نے آج ایوَن کے میرے گھر پہنچنے سے پہلے اس کِواڑ کو مقفل کر کے چابیاں اپنی بیٹی میں اڑائی تھیں لیکن اب دیکھو تو دروازہ تمام وقت کھُلا رہا تھا۔

کسی شخص کی موجودگی کے آثار نہیں ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر جیسے میں نے چھوڑی تھی۔ صوفے پر گرد پوش بالکل صاف اور ملائم۔ میٹھی گولیوں کا ڈبہ۔ راکھدان اور تصاویر۔ ہر شئے میز پر اپنی جگہ موجود ہے۔ فرش پر پڑا ہوا قالین بھی بالکل نہیں ہلا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میرا دل ایک پنکچر کئے ہوئے ٹائر کی طرح بج رہا ہے۔

ممکن ہے کہ جو کوئی بھی یہاں داخل ہوا ہو یہاں سے گیا نہ ہو۔

یہ خیال کہ کسی میں اتنی ہمّت ہو سکتی ہے مجھے ڈرانے کی. بجائے غصّہ چڑھا دیتا ہے اور اب تو میں معلوم کر کے ہی چھوڑوں گی کہ میرے گھر میں کسی نے مداخلت کی ہے یا نہیں چاہے مجھے اس تلاش کے جواب میں ان دونوں چھوٹے لفنگوں کی شکل دیکھنے کو دوبارہ کیوں نہ ملے۔ اور یہ کوئی حیرانی کی بات بھی نہ ہو گی اگر وہ دونوں ہی چور نکلیں۔

میں کمرے سے کمرے میں جاتی ہوں۔ الماریوں کے کواڑ جھٹکے سے کھولتی ہوں، پردے یکدم سرکاتی ہوں۔ دھیرے دھیرے بڑے کمرے میں جا کر ساری بتّیاں جلا دیتی ہوں۔ جب میں نے سارے کمرے گھوم لئے تب میں بڑے تحمّل سے ہر شے کا جائزہ لیتی ہوں۔ واپس جا کر سب ڈرازوں کو دیکھتی ہوں، باورچی خانہ میں نسخوں کے ڈبے کے پیچھے تلاشی لی اور دوسری خفیہ جگہیں جہاں میں اپنی خاص اشیاء رکھتی ہوں۔ لیکن کچھ بھی غائب نہیں ہوا۔ نہ کوئی نقدی اور نہ ہی شے۔

آخر میں میرے پاس سوائے بستر کو جانے کے کچھ بھی نہ رہ گیا۔ مگر میں اب بھی پریشان ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ کوئی شئے یا شخص میری عدم موجودگی میں یہاں داخل ہوئی تھی اور ابھی تک یہاں سے نہیں گئی۔ میں عرصہ دراز سے بستر میں لیٹی جاگ رہی ہوں کیونکہ آج شب مجھے سونے کی کوئی جلدی نہیں۔ ویسے بھی یہ کثرت کی بارش میرے جوڑوں میں سوزش پیدا کرتی ہے اور میرے گھٹنوں کا درد بھی آج خوب جوش میں ہے۔

ایک لمحے بعد گریس مجھے جگا رہی ہے۔ میرے ساتھ لیٹی میرے چہرے پر بوسے برسا رہی ہے۔ میں ہنستے ہوئے جاگتی ہوں اور وہ کہتی ہے "میں نے آج تک کبھی بھی ہلا کر جگانے کو 'بوسوں سے اٹھانے' پر ترجیح نہیں دی۔" میں شادمانی کی لہر کو اس کے اور اپنے بدن سے گزرتا محسوس کرتی ہوں۔ میں نے اُسے اپنے سینے سے لگایا ہوا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اُس نے بلاوجہ مجھے آدھی رات کو نہیں جگایا.... اور مجھے یہ قیاس لگانے میں کہ وہ وجہ کیا ہو سکتی ہے کوئی دشواری نہیں۔ وہ میری ٹھوڑی کے نیچے چوم رہی ہے اور ساتھ ہی میرے بلاؤز کے بٹن کھول رہی ہے۔

معلوم نہیں کتنا عرصہ گزر چکا ہے جب ہم نے ایسا کیا تھا۔ میرا تمام بدن چاہت کی آگ میں دہک رہا ہے۔ میرا خون کھولتا ہوا نغمہ سرا ہے اور اس کی انگلیاں میری قمیص کے اندر سرک رہی ہیں۔ "دھیرے دھیرے" میں نے اُس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ اِس تمام عمل کو بہت وقت لگا کر اختتام تک پہنچایا جائے۔

باہر آسمان کھلا پڑا ہے۔ بچلا ہوا طوفان ہماری چھت پر گھونسے مار رہا ہے اور اُس کا گیلا بدن ہمارے گھر کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ میں نے گریس کی انگلیاں پکڑیں اور انھیں اپنے لبوں تک لائی۔ پھر میں نے یوں کروٹ بدلی کہ اس کا چہرہ دیکھ سکتی۔ وہ اندھیرے میں مجھے دیکھ کر مسکراتی ہے..... اس کی آنکھیں چمکیلی اور مست۔ پھر میں نے اپنی انگلیاں اس کے لباس کے نیچے اُس کے پستانوں پر سرکائیں.....

میں اکیلی بستر میں جاگ گئی۔ ابھی بھی رات ہی ہے۔ بجلی کی مانند میں نے کمرے کو پار کیا، کیونکہ اس مرتبہ میں اس کے پیچھے جاؤں گی۔ قالین مجھے کھردرا محسوس ہوتا ہے۔

باورچی خانے کا فرش سخت اور ٹھنڈا۔ پچھلا دروازہ بالکل کھُلا ہوا ہے اور میں پردے ہٹا دیتی ہوں۔

طوفان آگے بڑھ چکا ہے۔ تازہ ہوا میری قمیص میں سے گزر کر میری جلد پر بہت اچھی لگی۔ اور کتنی مہک ہوتی ہے اس میں جب وہ گیلی زمین سے اٹھے! پھولوں اور پتّوں پر پانی کے موتی ہیں اور لگتا ہے کہ مٹروں کی بیلیں مالا بن چکی ہیں۔ چاند، ٹامسن میدان پر بلند کھڑا، اپنی چاندنی ہر طرف انڈیل رہا ہے جس میں باڑ پر لگی کلیاں دمکتی ہوئی سفیدی کا رُوپ لئے ہیں۔

کسی پتّے میں حرکت نہیں اور نہ ہی کوئی آواز۔ میں بھی بالکل ساکن ہوں، اور اَب اِس آنگن میں ہی ٹھہروں گی۔ میں نے غور سے سُنا۔ میں جانتی ہوں کہ گریس یہیں کہیں باغ میں ہی ہے۔ اور وہ میری منتظر ہے!

کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ راک ہڈسن، رائے کون اور میشل فوکو سنہ ۱۹۸۴ء میں پیرس میں واقع ایک امریکی اسپتال میں ملے اور ایک دوسرے سے آشنا ہوئے۔ وہ دونوں اس آگہی سے دوچار تھے کہ ان کے دن پورے ہو گئے ہیں اور وقت آچکا تھا کہ وہ تینوں ایک دوسرے سے اپنا حساب پورا کر لیتے۔ اہم سوالوں کا انہیں جواب دینا تھا۔ راک ہڈسن برسوں سے فوکو کی محبت کا اسیر تھا لیکن کبھی اس کی قربت حاصل نہ کر سکا۔ پانچویں دہائی کے آخری لمحوں سے رائے کون راک ہڈسن کا تعاقب کر رہا تھا لیکن اس کی کوششیں لاحاصل رہی تھیں۔ راک کی دل چسپی ذہین لوگوں میں تھی۔ اپنی زندگی کی شام میں راک، رائے اور میشل ایک ہی اسپتال میں دن گزار رہے تھے اور ان کے بیچ ایک گہرا ربط پیدا ہو چلا تھا۔

رائے CHAMPS ELYSEES کے قریب ہی ہوٹل جارج پنجم میں رہ رہا تھا، اور راک کا پیرس میں St. GERMAN DES PRIS میں اپنا مکان تھا جسے اس نے ساتویں دہائی کے اوائل میں خریدا تھا۔ فوکو کی رہائش کا کسی کو پتہ نہ تھا۔ یہ دونوں امریکی قیمتی LIMOUSINE میں آتے تھے، لیکن فوکو کی آمد و رفت کا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ نرس کی اطلاع کے مطابق وہ ایک خستہ حال RENAULT میں آیا تھا اور ڈاکٹروں کے

خیال میں اس کا ڈرائیور کسی امریکی گریجویٹ طالب علم سے مشابہ تھا۔

پہلی ملاقات میں رائے کو فوکو کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ تینوں اسپتال کے ایک کمرے میں چمڑے کی کرسی پر دراز تھے۔

کون ہو تم، رائے نے سوال کیا۔ "پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے، میں نے تمہاری تصویر دیکھی ہے۔"

فوکو پر غنودگی کا عالم طاری تھا۔ اس نے خطرناک جراثیم کش انجکشن لے رکھا تھا۔

"میں"۔ وہ بڑبڑایا، "میں علم کا آثار قدیمہ ہوں"

"اچھا، ایک فلسفی۔ مجھے پہچانتے ہیں آپ؟ کیوں؟

فوکو نے قدرے مشکل سے جواب دیا "ہاں"

"تو آپ جانتے ہیں!"

میرے امریکی نائبین نے بتایا تھا۔

"کیا کہا تھا انہوں نے؟" رائے نے فوکو کی باہنوں کو ہلاتے ہوئے کہا تاکہ وہ پھر نیند کی آغوش میں نہ چلا جائے۔ رائے کون طبعاً بے صبر واقع ہوا تھا۔ "مجھے کہو انہوں نے کیا بتایا تھا؟"

فوکو نے جمائی لی۔ "تم قوت ہو اور میں علم" آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے کہا۔ وہ مکمل طور پر گنجا ہو چکا تھا۔ اس نے بڑے سائز کے چمڑے کا ایک جیکٹ پہن رکھا تھا جو دھات کے تیار شدہ لوازمات سے پُر تھا۔ اس کا سر اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا یوں جیسے وہ کوئی چیز چبا رہا ہو۔ اس کی گود سے رومال زمین پر آگرا تھا۔ رائے کون ہچکچایا، نرس کیلئے نگاہ دوڑائی، پھر خود ہی رومال کو زمین سے اٹھا کر فرانس کے عظیم زندہ فلسفی کی گود میں رکھ دیا۔

فوکو، کون اور ہڈسن، تینوں کے تینوں کو HPA-23 کے انجکشن لگ رہے تھے۔ ایڈز کی بیماری کے لئے ایک امید افزا تجرباتی علاج۔ یہ انجکشن قیمتی ہوتا ہے اور سوئزرلینڈ کی پہاڑی بکریوں ـــــ سے پر تیار کیا جاتا ہے، یہی وجہ تھی کہ فرانسیسی پر اعتماد ہنیر

تھے۔ وہ لوگ تمام اخراجات کے لئے پیشگی رقم کی ادائیگی چاہتے اور یوں لگتا کہ گزشتہ دو سالوں میں ایڈز کے مریضوں نے اسپتال کے بل ادا نہیں کئے تھے۔ صرف رائے کو ان بلوں کی ادائیگی میں پریشانی تھی۔ اس کے پیسے عجیب قسم کے اداروں میں بند پڑے تھے۔ فرانسیسی ڈاکٹر اس کے کمرے کے باہر چکر لگایا کرتے تھے۔ راک کے پاس پیسے کی فراوانی تھی اور اسے فوکو کے لئے فکر لاحق تھی جس کے جوتوں میں شگاف پڑ چکے تھے۔

راک نے پوچھ ہی لیا "آپ کس طرح بل ادا کرتے ہیں"۔

"میں نہیں ادا کرتا" فوکو نے جواب دیا۔ "کیلی فورنیا کی یونیورسٹی ادا کرتی ہے۔ میرے ساتھ ان کا معاہدہ سالوں میں ہے"۔

ان لوگوں کی جاگیر ہیں آپ، راک نے کہا "آپکی ذہانت"

"نہیں، صرف میرے جسم کے مالک ہیں وہ، یہ جسم MGM کی طرح ہے"۔

راک لرز اٹھا۔ ہسپتال کے شیشے کی دیوار پر چھن سے ایک آواز ابھری۔

بہت سارے ناظرین ان کے دیدار کے لئے جمع تھے۔ مرد، عورت، نوجوان، یہاں تک کہ بچوں کے ساتھ والدین بھی۔ وہ سب شیشے پر اپنا چہرہ ٹکائے فوکو اور راک ہڈسن کو تک رہے تھے، جنہوں نے اپنے منھ پھیر لئے تھے۔

"آہ میشل" راک نے کہا" لوگوں نے مجھے برسوں اپنانے کی کوشش کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں"

"نہیں، نہیں، مجھے یہ پسند ہے۔ وہ میرا خیال رکھتے ہیں، مجھے کپڑے خرید کر دیتے ہیں، کتابیں اور کھانے مہیا کر دیتے ہیں .... میں یک سوئی سے اپنے کام میں لگا رہتا ہوں"۔

راک مغموم ہو اٹھا۔ سیاہ بالوں کا ایک مختصر سا ہالہ اس کی پیشانی پہ آگرا۔ "میں آپ کا خیال رکھ سکتا ہوں۔ اس نے نرمی سے کہا، اگر آپ اس کی اجازت دیں تو۔" فوکو خاموش رہا۔ شیشے کی دیوار پر آواز تیز تر ہوتی جا رہی تھی، ایک نرس نے کہا، فوکو صاحب، وہ لوگ آپ کے منتظر ہیں۔ راک نے نظر اٹھائی۔ "ہم مشکل سے ہی اکیلے ہو پاتے ہیں"۔ اس نے کہا۔ فوکو نے آہ بھری۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور نرس نے بے صبری سے اسکی طرف

دیکھا۔ راک نے پھر خاموشی توڑی۔ "آپ جائیں لوگوں کے پاس، ان کو آپ کی ضرورت ہے۔

اس امریکی اسپتال میں اکثر فوکو یا راک ہڈسن کے لئے زبردست بھیڑ ہوتی۔ کبھی کبھی وہ لوگ اپنے پرستاروں کی شناخت بھی نہ کر پاتے۔ جو پرستار فوکو سے ملاقات کو آتے، امریکی ہوتے۔ راک ہڈسن کے حصے میں ہمیشہ فرانسیسی پرستار ہوتے لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ سارے فرانسیسی امریکی انداز کے لباس زیب تن کئے ہوتے۔ آنکھوں پر چشمہ اور چمکیلا مختصر پتلون، جبکہ امریکی پرستار گہرے رنگ کے جیکٹ اور کالے جوتوں میں فرانسیسیوں کی طرح نظر آتے۔ اس سے کافی پریشانی ہوتی۔ دراصل فرانسیسیوں کو یہ پتہ ہی نہ چلتا کہ فوکو کون ہے۔ ہاں راک ہڈسن کو دیکھتے ہی پہچان جاتے۔ بہتوں کو یقین تھا کہ کبھی وہ جیری لوئس کا ساتھی ہوا کرتا تھا اور جیری لوئس کو وہ اس صدی کا غیر معمولی ذہین انسان تصوّر کرتے تھے۔

رائے کون کے لئے کوئی نہ آتا۔ ایک پیغامبر نیویارک کی صوباتی عدالت سے اسکی معطلی کا نوٹس دینے آیا تھا۔ اس کے پاس ان عدالتی چارہ جوئی کے تار آیا کرتے تھے، جو اس کے اگلے موکّل اس کے خلاف سامنے لا رہے تھے۔ سرکار کی طرف سے بھی ٹیکس کی رقم کی وصولی کے تار آتے۔ رائے مشہور زمانہ آدمی تھا۔ پبلک ٹی وی کے کارکن اور کیمرے انٹرویو کی غرض سے آتے اور روزین برگ یا میگار تھی کیس کے بارے میں سوال کرتے۔ "بابایاں محاذی" نرسیں سرگوشی کرتیں۔ "تغیّر پسند"۔ نامہ نگاروں نے سُنا کہ کون مر رہا تھا اور انہیں آخری کہانی کی ضرورت تھی۔ لوگ بہت کچھ جاننا چاہتے تھے۔ میکارتھی، رونالڈ ریگن، دیشنیل ہامیت کے بارے میں خصوصی اطلاعات۔ جب انہوں نے دیکھا کہ رائے کون تیز دوڑ سکتا ہے، اس کے مڑے چھوٹے پاؤں میں اب وہ دم خم نہیں، تو انہوں نے کون کو ہال میں کیمرے کی زد میں گھیر لیا لیکن اس سے ایک لفظ بھی اگلوا نہ سکے۔ رائے کون لوگوں کو بے وقوف بنانے میں ماہر تھا۔ امریکہ میں نیویارک کے باشی اکثر اپنے محفوظ گھروندوں سے اس پر تھوکا کرتے

تمام تر بُری خبروں کے باوجود، رائے کون شانت تھا۔ اپنی آرام کرسی پر بیٹھا وہ راک کو تکا کرتا تھا۔ رائے اور فوکو دونوں ہی سکڑتے جارہے تھے۔ رائے کا جسمانی انداز کبھی اچھا نہیں تھا، نیم جاں ہونے لگا تھا۔ وہ اس قدر مختصر تھا کہ اس کے پاؤں زمین تک نہیں پہنچتے تھے۔ وہ راک کو گھورا کرتا۔ راک فوکو میں مشغول ہوتا۔ راک واحد شخص تھا جس کے سر پر زلفیں تھیں اور وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھا، آخری دم تک ایک چمکتا ہوا ستارہ۔ رائے گنجے پکاسو، یا آئزن آور یا ڈبلیو سی فیلڈس کی طرح اپنی کرسی پر دراز ہوتا۔ تمام گنجے نرسوں کے لئے ایک جیسے لگتے۔ ہسپتال کے کارندوں کو اچھی طرح خبر تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ رائے راک کو تکا کرتا ہے اور راک فوکو کو، مشہور زمانہ لوگوں کی ایک تثلیث۔ یہ پتہ چلانا مشکل نہ تھا کہ ان لوگوں پر سکتہ طاری تھا۔ خاموشی توڑنے کے لئے کسی کی ضرورت تھی ورنہ اپنی موت تک وہ لوگ یونہی خاموش بُت بنے رہتے۔

نیو یارک کے سپریم کورٹ نے رائے کا سارا اثاثہ ضبط کرلیا تھا جب فرانسیسیوں کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے اسے اسپتال کے باہر بند کر دیا۔ شیشے کی دیوار کے باہر وہ مغموم کھڑا رہتا، اس دن کے پرستاروں کی بھیڑ میں دبا ہوا۔ شیشے کے باہر سے رائے مدد کے لئے پکارا کرتا۔ راک نے اسے دیکھا اور سوچا کیا: رائے کو ایسی عام قسم کی ڈھیلی ڈھالی قمیص نہیں پہننا چاہیئے۔"

"یہ چیخ و پکار کیسی؟" فوکو نے سوال کیا۔ اس صبح انجکشن بہت سخت ہونے کی وجہ سے وہ ٹھیک سے نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ بس اتفاق سے راہداری پر آئے ہوئے امریکی طالب علموں پر اسکی نظر پڑی جنہوں نے اس کے چہرے پر کیمرے کے فلش چمکائے۔

لوگوں کی بھیڑ میں رائے شیشے کے ساتھ دبا پڑا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک شخص کھڑا اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اخبار بھی شیشے سے لگا تھا، رائے کی پشت کے قریب! رائے ایک طرف جھکتا چلا گیا۔ اس کے قدم زمین چھوڑتے گئے یہاں تک

کہ اپنے سُرخ ڈھیلے کپڑوں میں پھیلا ہوا ترچھا ہو گیا تھا۔ دھندلے شیشے پر اس کے چہرے ایسے چپکے پڑے تھے کہ اگر وہ کچھ نکال لیتا تو بھی کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ اس کے ہونٹ گلابی نظر آ رہے تھے۔ اسے سانس لیتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے چہرے کے گرد شیشے پر دھندلے حاشئے پھیلنے اور بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ اگر وہ کچھ کہنا چاہتا تو کوئی دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔

راک نے فوکو سے مشورہ کرنا چاہا لیکن فلسفی کا دماغ دواؤں کی وجہ سے معطل ہو رہا تھا۔ ”میں صرف فلیش کی چمک دیکھا کرتا ہوں۔“ اس نے کہا: ”مختصر ستارے کی طرح۔ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں ستاروں سے بھرے پڑے ہیں۔“

راک نے کہا: ”ایسے لمحوں میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔“

ڈاکٹر پاس سے گزرتے ہوئے یہ تصدیق ضرور کرتے کہ شیشے کی دیواروں کے باہر رائے بند ہے کہ نہیں۔ اسپتال میں ایک مختصر سا نظام یہ تھا کہ دو اشخاص دو الگ الگ گھنٹیوں کے بٹن دبا کر مریض یا ملاقاتی کو شیشے کے بنے ہوئے گیٹ کی طرف آنے کی اجازت دیتے۔ کبھی کبھی پیرس کے میٹرو کی طرح چھوٹا سا پیلے رنگ کا کارڈ ہی دکھانا کافی ہوتا۔ لیکن اکثر اندر آنے کے لئے ماہرین کو بلانا اور مشورہ کرنا ضروری تھا۔ باہر کافی گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ راک کی نگاہ زمین پر پڑے ہوئے نیلے رنگ کے کاغذی رومال اور گرد و غبار پر پڑی۔ رائے چھینکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

آخر کار راک نے ڈاکٹروں کو بلایا اور رائے کون کے بل ادا کرنے کی رضامندی دے دی۔

یہ فیصلہ اس کے اگلے تمام بہتر فیصلوں کے برخلاف تھا۔ اس نے پڑھا تھا کہ رائے کس طرح اپنے موکلوں اور دوستوں سے روپیہ قرض لیا کرتا۔ اگرچہ اس کے اپنے کافی پیسے مضحکہ خیز اکاؤنٹس میں جمع تھے۔ بہر حال فرانسیسی خوش تھے۔ دو یا تین تحریری دستاویزات پر موٹے ماؤنٹ بلینک سے دستخط کرنے کے لئے لائے۔ راک نے شاہانہ انداز سے قلم کو گرفت میں لیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آزادی کے پروانے پر دستخط کر رہا ہے۔

رائے شکرگزاری کے احساس تلے لرزتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"بھول جاؤ" راک نے کہا: "مجھے تنہا رہنے دو۔ شاید تم سمجھ رہے ہو" وہ فوکو کے ساتھ تنہائی کا خواہاں تھا۔ وہ چپ چاپ الگ ہٹ گیا۔ فوکو خود بھی زندگی کی طرف واپس آچکا تھا۔ راک کے ساتھ تمام ملاقاتوں میں وہ یہ جان پایا تھا کہ راک کے لئے کسی فیصلے پر آنا محال ہے ـــ یہ اس کی عقلی ساخت کا ایک حصہ تھا۔ چونکہ راک نے فیصلہ کرلیا تھا اس لئے فوکو نے اس کی ستائش کی۔

بہت سالوں تک اور کافی تحقیق کے بعد راک نے جاپانی پھولوں کی ترتیب و تنظیم کا علم IKEBANA کا مطالعہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ علم تک پہنچنے کا یہ خالص راستہ ہے۔ اب اس کا یقین متزلزل ہوچکا تھا۔ جرمنی کے فلسفے میں کچھ ایسی بات تھی جس کو وہ اپنے دماغ سے نکال نہ سکا تھا۔ راک کو یاد تھا کہ ہیگل کے بیان کے مطابق ساری تاریخ ایک شاندار تسلسل کے تصور سے جڑی ہے، ایک نوع کی بے مثال نمائش جس کے ذریعہ روح اور جسم کا ملاپ امید افزا مستقبل میں ممکن تھا۔ اسے اپنے آپ سے وحشت ہوتی کہ وہ اس دوسطحی نمائش کے تصور کو اپنے اندر برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔

"نمائش" فوکو نے لقمہ دیا، "یہ تو عیش و طرب کی رنگ رلیوں سے زیادہ مشابہ ہے۔"

"آپ شاید ایسا خیال نہیں رکھتے ؟ کیوں" راک نے کہا: یہ خیال کہ ہر شئے ایک دوسرے سے جُڑی ہے آپ کے حلق سے نہیں اُترتا۔"

فوکو نے کہا! "صرف نطشہ کی اہمیت ہے"

"یقیناً نطشہ، راک نے کہا: مجھے نطشہ کے بارے میں بتائیں!"

فوکو نے بات شروع کی۔ "نطشہ نے ہمیں تمام نظام پر سوال کرنا سکھایا ہے۔" اس نے مزید کہا "نطشہ نے اس کا بھی مظاہرہ کیا کہ اگر ہم کچھ جانتے ہیں تو وہ ٹکڑوں یا حصوں میں ہی جانتے ہیں۔ اس نے علم کو نامکمل گردانا۔"

رائے کمرے میں دور سے سنتا رہا لیکن مداخلت نہ کی۔ وہ فوکو کی پشت پر بیٹھا

رہا تاکہ راک کی نگاہوں سے وہ سیراب ہو سکے۔

"میں سمجھتا ہوں کہ قوت کے لئے ارادہ بنیادی نقطہ ہے۔ فوکو نے کہا: "اس مقام پر آپ علم کے مختلف حصوں کو منتہائے مقصود کی طرف رواں دیکھ سکتے ہیں۔ فوکو اپنی انگریزی زبان کے اظہار میں کافی محتاط تھا لیکن اس آخری لفظ پر لڑکھڑا گیا۔ اس کی یکسوئی منتشر ہونے لگی۔ اس نے کہا "مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم اس رات ایلز بیتھ سٹیلر کی پارٹی میں تھے جب مانٹ گمری کلفٹ کا حادثہ پیش آیا تھا۔"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" راک بڑبڑایا

"یقین سے نہیں؟"

وہ بڑے خطرناک ماہ و سال تھے۔ ہم سب بلانوشی کا شکار تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب ایک بار مانٹی حادثے کا شکار ہوا تھا تو میں اس کی گاڑی میں تھا۔ وہ خطرناک انداز میں گاڑیاں چلاتا۔ انتہائی کم بخت۔ بہت سارے حادثوں کا شکار ہوا۔ کچھ کے تو اخبار میں خبر بھی نہ بنی۔

فوکو نے اداس ہو کر کہا: "اوہ!"

"ایک واقعہ یاد آتا ہے جب میں نے اسے ملبے سے باہر نکالا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ اگرچہ اسے اس لمحے کسی خاص مرہم پٹی کی ضرورت نہ پڑی۔ خیر ہم نطشہ کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔ اس کے زمانے میں تو اتنی گاڑیاں نہیں تھیں۔"

"نہیں" فوکو نے جواب دیا "لیکن کبھی آپ مانٹ گمری کی گاڑی میں کسی بڑے حادثے کے دن بیٹھے ہوتے تو...."

راک نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ٹکڑے علم کی سرحدوں پر اس لئے ہوتے ہیں کہ ہمیں یاد دلائیں کہ ہم سب مشروط ہیں یا پھر وقتی۔ آپ کو پتہ ہے کہ آدمی صرف ایک پل ہے۔ منتہیٰ نہیں۔"

"ہوں، یہ سچ ہے کہ نطشہ نے آدمی کو ناپائیدار اور عبوری گردانا اور تباہ جانا۔" فوکو نے کہا آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں ہماری زندگی کا خاصہ ہیں۔ جیمس ڈین کے

بارے میں سوچئے۔ برسوں میں نے اس حادثے کے بارے میں غور و فکر کیا اور اپنے نتیجے سے مطمئن نہ ہو سکا۔

راک نے اپنے آخری رسالے میں لکھا: "فوکو سے کسی بات کا جواب طلب کرنا آسان نہ تھا۔ کبھی جب میں نہیں سو سکتا تو اس کے ساتھ تصوراتی کلام کیا کرتا۔ میری خوش بیانی ہم دونوں کو حیرت زدہ کر دیتی اور پھر ہم دونوں حقیقت کی دنیا میں بلند تر مقام تک پرواز کرتے نظر آتے۔ میں اپنے معنی خیز مقالے کے بارے میں اسے آگاہ کرنا چاہتا جہاں میں نے شوپن ہاور کو رد کیا تھا۔ علاوہ ازیں امریکہ کے تقریباً تمام سنجیدہ رسالوں نے اسے رد کیا اور یہی بات اکثر ماشٹ گمری کے مضحکہ خیز معاملے سے مجھے جوڑ دیتی۔ آہ! میں کس قدر اپنے آپ سے نفرت کرتا تھا۔"

فوکو کے دھیان کو پوری سنجیدگی سے پانا قدرے مشکل تھا کہ ہر وقت اسے امریکی گریجویٹ طلباء گھیرے رہتے۔ وہ اسپتال کی شفاف زمین پر بیٹھے رہتے اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو لوٹ کرتے۔ راک نے اسے تنہا رہنے کے لئے طلبا کو رشوت دینا شروع کیا۔ اس نے انہیں الفاظ پروسیس کرنے والی مشین بھی دی۔ روپیوں کا نذرانہ بھی پیش کیا کہ دریدا کے ساتھ وہ Irvine میں تعلیم حاصل کریں۔ کچھ تو چلے گئے اور جو رہ گئے تھے وہ فوکو پر اپنی پی ایچ ڈی کے بارے میں سوچتے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا: "فوکو کے گرد توانائی کی بہتات ہے۔" وہ باہمت جہانِ نو کا ایک طرح کا سقراط تھا اور اچھے برے تمام لوگوں کے لئے دل چسپ۔"

اگرچہ فوکو تمام طرح کی توجہوں سے بے نیاز ہونے کا دعویٰ کرتا لیکن اس نے دیکھا کہ بھیڑ چھٹنے لگی ہے۔ "ساختیات کے ماہرین کی طرف واپس نہ لوٹو"۔ وہ گریجویٹ طلباء کو ہوشیار کرتا۔ "وہ لوگ تمہیں سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید بتائیں گے۔ علم کی تحصیل میں وہ تم سبھوں کو بے وقوف بنائیں گے۔"

وائے ان ساری چیزوں کو یک گونہ دل چسپی کے ساتھ دیکھا کرتا۔ اسے طلباء پسند تھے۔ کولمبیا میں گزارے ہوئے دن یاد آتے جہاں اس نے جنگ سے بچنے کیلئے

داخلہ لیا تھا۔ ان دنوں بہت سارے نوجوان فسطائی طاقتوں کے خلاف صف آرا تھے۔ فوکو کے جوان طالب علموں کی طرح، رائے خالی ہال میں بیٹھا مارک وان دورین اور لائنل ٹریلنگ جیسے لوگوں کو سنا کرتا تھا۔

رائے کو اس بات کا ملال تھا کہ راک اس میں دلچسپی نہیں لیتا۔ ۱۹۵۹ء میں Peggy Guggenheim کی دعوت سے ہی وہ راک کی تاک میں تھا۔ ہر کوئی وہاں موجود تھا۔ سارتر، نیڈ روریم، جیک کیروئنگ، یہاں تک کہ لورین بکال بھی۔ راک متوسط عمر کے سارتر کا پیچھا کرتا رہا جو الجیریائی خادم لڑکے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ زندگی کے عروج کے زمانے میں راک سیاہ گلا بند والی قمیص پہنا کرتا اور "ڈیڈی او" یا "غلط ایمان" کی رٹ لگائے رہتا۔ ٹیب ہنٹر جو حال ہی میں ایک ہونہار جوان نیوکلیئر سائنس داں سے رشتہ توڑ چکا تھا، سارتر کی صحبت کا متمنی تھا۔ لیکن اس الجیریائی لڑکے کی گرفت اس فلسفی پر مستحکم تھی۔

رائے نے اسپتال کے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس نے میری فرانس نامی نرس کو بلا کر کہا، "کیا ایسا نہیں ہے کہ میں عمر رسیدہ ہوتے ہوئے سارتر کی طرح نظر آتا ہوں۔"

میری فرانس نے سارتر کا نام بھی کبھی نہ سنا تھا۔ "ہاں" اس نے جواباً کہا: آخری فلموں میں وہ جس طرح نظر آتا تھا آپ ویسے ہی لگ رہے ہیں، خصوصاً اپنی ٹوپی میں۔"

اس کے جانے کے بعد رائے نے خود پر سخت نگاہ ڈالی۔ اس کی ناک پر بچپن کا عجیب انداز کا داغ تھا۔ اس کی ماں نے اسے یوں ہی نہیں چھوڑا۔ چہرے پر غازے نے اسے تکلیف نہ پہنچائی۔ اس کے سخت جبڑے کے آس پاس اس کے چمڑے سکڑ گئے۔ بیماری کے بعد جس میں تبدیلی رونما ہوئی وہ اس کی آنکھیں تھیں جو اب نرم نیلی پڑ گئی تھیں۔ ان میں اب وہ اگلا سا جلال نہ تھا۔ رائے کوہن کو احساس ہو چلا تھا کہ وہ مرنے والا ہے۔ اب تک وہ واحد شخص تھا جو اپنے فانی ہونے کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر پایا تھا۔ وہ واحد

شخص تھا جواب بھی عدالتی مقدمے دائر کرتا، نرسوں کی تحقیر کرتا اور شراب پیتا۔
اب اس نے دیکھا کہ شیشے کے پار طلباء اسے مرتا ہوا دیکھنے کے لئے تک رہے ہیں۔
کلرکوں کو بل لکھتے دیکھا، نوکر چاکر باھر زمین صاف کر رہے ہیں اور خادمائیں صحن کو جراثیم سے محفوظ کرنے میں لگی ہیں۔
رائے نے یہ ساری چیزیں بغور دیکھیں۔ گندگی کے ڈھیر، گندے غلیظ شیشے، اور چمکدار صحن۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ بنیادی سطح پر ان کی معنویت سے وہ بے نیاز ہے کہ یہ چھچھلتے چمکتے ہوئے مظاہر ذات کی حقیقی دنیا سے کس طرح جڑے ہیں۔ فوکو اور راک ایک نوٹ بک پر جھکے خاموشی سے محو گفتگو تھے۔ دن چڑھ آیا تھا، پیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ان دونوں کے خدوخال اس روشنی میں میڈونا اور بچے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ رائے نے اپنے یہودی نژاد ہونے کا آموختہ دھرایا۔ اور یہ کہ اس طرح کے خیالات کبھی اس کے اندر جنم نہیں لیتے۔
رائے نے اندازہ لگا لیا تھا کہ علم کی قوت اس کی اپنی طاقت سے کہیں سوا ہے۔ لہٰذا اس نے فوکو کے قدموں پر راک سے ہم آغوش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنی آرام کرسی کو دونوں کے قریب کر لیا۔ وہ بہت پستہ قد انسان تھا اس لئے دیر لگی۔
دونوں نے رائے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔
رائے نے کہا کہ اب آپ دونوں کچھ نہیں کر سکتے۔ راک ہڈسن اور فوکو ایکدوسرے کا منھ تکنے لگے۔ رائے اپنی کرسی کے قریب کسی چھوٹے سے سپاہی کی طرح کھڑا تھا اور کمر تک جھک چکا تھا۔
"ٹھیک ہے"۔ راک نے کہا، لیکن یہ بدصورت ڈھیلی قمیص بالکل نہیں۔"
ہماری یہ دنیا کبھی نہ جان پائے گی کہ ان تینوں کے درمیان کیسی باتیں ہوئیں۔ تمام طلباء، اپنے نوٹ بک، اپنے ٹیپ ریکارڈرز اور ویڈیو کیمرے سمیت نکال دئے گئے تھے۔ یہ فوکو کے لئے انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہی طلباء اس کے نام کو ساری دنیا میں روشن کریں گے۔ لیکن اس نے انہیں جانے دیا۔ "ہر شخص کو

اپنے نام کی بقا کے لئے خود ہی کچھ کرنا چاہئے" اس نے کہا۔ فوکو نے محسوس کیا کہ راک اور رائے کے ساتھ اس کی بہت ساری قدریں مشترک ہو سکتی ہیں بجائے ان طلباء کے جو اس کی موت کا انتظار کئے بغیر ہی یہ سمجھ رہے تھے کہ فوکو کی موت کے بعد وہ فوکو کے ماہرین کی صف میں شمار ہونے لگیں گے۔

ایک طویل عرصے تک وہ اسپتال ہی میں رہے۔ نرسوں کے بیان کے مطابق انکی ساری گفتگو کا محور محبت ہوا کرتا۔ یہ سب کچھ ۱۹۵۰ء میں رائے کے ذریعہ چھیڑے گئے مباحث سے شروع ہوا جو اس نے زبان، جنس اور سچائی کے بارے میں اٹھائے تھے۔ اور جو آگے چل کر راک ہڈسن کے لئے محبت کا ایک ترانہ ثابت ہوئے۔

"اب ان مباحث کو زیادہ طول نہ دو، راک نے کہا، تم نے مجھے صرف ایک گوشت پوست کے لوتھڑے کی طرح برتا ہے، پھر وہ فوکو سے مخاطب ہوتا ہے" آپ بھی یوں میرے ساتھ پیش آتے ہیں جیسے کہ میں کوئی بے جان سا ریشہ ہوں۔ لیکن ایسا میں ہرگز نہیں ہوں۔ میرے اپنے احساسات ہیں۔ ٹھیک رائے کی طرح، لیکن میری کوئی قدر نہیں کرتا۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ میری ذہانت کی بنا پر لوگ میری قدر و منزلت کریں۔"

میری فرانس ٹرے پر شاہ دانے کا خوشبودار مشروب لئے داخل ہوئی اور میز پر اسے رکھ کر بنا کچھ کہے ہی نکل گئی۔

"یہ قدر و منزلت کیا ہے" فوکو نے کہا۔ ہم سب اپنی تعمیر، حیثیت ایک موضوع کے مخاطب کئے بغیر ہی محبت پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ ان معنوں میں ہم سب مریض ہیں۔ یہ ساری انسانیت اور سارے کا سارا علم بس ایک قیمتی شفاخانہ ہے۔"

راک پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ اپنی کرسی کے نیچے کچھ تلاش کرنے لگا۔ اس نے اپنا رسالہ نکالا اور دیکھا "سارے کا سارا علم بس ایک قیمتی شفاخانہ ہے"۔

"یقیناً" رائے نے لقمہ دیا " اگر ہم سب مریض ہیں تو اس کی دوا کیا ہے"

راک جھنجھلاہٹ کے مارے کانپ اٹھا، پھر مخاطب ہوا " دیکھو رائے، ایسا صرف مجازاً کہا گیا ہے۔" راک نے ہر لفظ کو آہستہ آہستہ ادا کیا، رائے کی زبان دانی سے عاجز ہو

کرمیشل ہمارے مریض ہونے اور دنیا کی حالت کے درمیان توازن کی تلاش نہیں کر رہا تھا۔ کیوں؟

تینوں کو چپ سی لگ گئی۔ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ "ہم سب ہیں کون، کہاں ہیں اور کیا تھے؟" راک نے اپنے رسالے میں یہ سوال اٹھایا۔ "موضوعاتی طور پر ہماری تعمیر..... سچائی قوت اور زبان کی میزان پر روز لڑکھڑاتی ہے۔ رائے کا کمال یہ ہے کہ..... چیزوں کی ضرورت کی شناخت اسے ہے۔ جسم کی زبان اور جنسیاتی محبت کے کنائے۔ لیکن میشل؟ آہ میرے پیارے..... جلد ہی میں اسے اپنے فلسفے کی بنیاد قرار دینے والا ہوں۔"

انہوں نے اپنا لذیذ مشروب نوش کیا۔ چند ہی لمحوں میں میری فرانس ان کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی اور ان کے انتہائی معمولی خیالات اور گھنی گہری خواہشات کا اندازہ لگانے کے قابل ہو گئی۔ وہ یہ جان چکی تھی کہ کیلے یا Pina colada کے بجائے انہیں جنگلی شاہ دانے پسند تھے۔ رائے نے ایک گیت گنگنانا شروع کیا، "بس ایک بوسہ ...." کچھ ایسی بات بھی تھی کہ جو میری فرانس کی دسترس سے باہر تھی۔ ایک کونے میں کسی نے جھولتے ہوئے پنکھے کے ساتھ ٹکر کھائی۔ ایئر کنڈیشن کے خراب ہونے کی صورت میں اسے وہاں نصب کیا گیا تھا۔ لیکن اب بھی وہاں وہ پنکھا جنبش کر رہا تھا، بالکل کسی وحشی جانور کی طرح۔ رائے گنگناتا رہا: "بس ایک بوسہ" فوکو نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اس کے گنجے سر پر چمکیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

فوکو نے راک سے سوال کیا: "کیا لنڈا ایوان ٹھیک ٹھاک ہیں"

"ہاں ٹھیک ہے" راک نے جواب دیا۔

"مجھے پریشانی لاحق تھی۔ یہ تمام اخباروں میں ......"

راک نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں، اچھی ہے وہ، میں نے ایک بار اسے چوما تھا۔ یہ، یہ رلکے کی نظموں کا نسخہ اس نے بھیجا ہے۔"

"اور جرمن زبان میں" فوکو نے کہا۔

رائے نے لقمہ دیا: "اپنی جوانی میں رلکے کو میں بہت پسند کیا کرتا تھا۔"

"میں بھی"۔ راک نے کہا، وہ کس قدر حسیاتی شاعر ہے اور کتنا ذہین۔ میں اس کیساتھ ہم آغوش ہونا چاہتا تھا کیوں کہ میرے اندر ہمیشہ سے شاعروں اور فلسفیوں کے لئے اتنی للک ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ امید رہی کہ کسی پارٹی میں رلکے سے ملاقات ہو گی۔"

"تمہاری پیدائش سے قبل ہی وہ موت کی وادیوں میں گم ہو چکا تھا۔" فوکو نے ٹوکا۔

راک شرمسار ہو کر اپنی کرسی میں دھنس گیا۔ فوکو نے اس اداکار کے ہاتھ پر سر پھیرا۔ "میں تمہیں شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔" فوکو نے نرمی سے کہا۔ پھر اس کے ہاتھ راک کے جبڑے کو سہلانے لگے۔ یہاں تک کہ اس کی انگلیاں راک کے کاندھوں پر بیگنی نقطے پر پہنچیں۔ راک نے لرزنا شروع کیا۔ فوکو کے سارے خدوخال ڈھیلے پڑ گئے۔ اسے احساس ہوا کہ اس نے وہی کچھ کیا ہے جس سے اسے ہمیشہ ہی نفرت رہی۔ علم کے ذریعہ استحصال۔ راک ہڈسن کی باہنوں میں جھرجھری سی ہوئی۔

اب مجھے کوئی نہیں چھوتا، راک نے سرگوشی کی۔ میشل نے اس کے کاندھے پر انگلیوں سے تارے اگائے۔ اس نے راک کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔ راک نے کہا: "میں کس قدر سہما ہوا ہوں"۔

"نہیں راک" رائے نے ہمت بندھائی اور فوکو کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اب تین ہاتھ ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔

راک نے کہا: "میں مرنا نہیں چاہتا"

اُن کی آنکھیں چار ہوئیں، ایک دوسرے پر مرکوز، اور پھر جدا ہو گئیں۔ اب دیکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ فوکو کی منظر رائے کی ناک کے مساموں پر ٹک گئی۔ رائے کی ناک پر مسام تھے ہی نہیں۔ کوئی ڈھیلا چمڑہ بھی نہیں۔ جو چند سال پہلے نظر آتا تھا۔ رائے کی ناک اب بھی مسلّم تھی۔

فوکو نے کہنا شروع کیا: "چاہنا، خواہش کرنے کے قابل ہونا ایک ایسی ذات کا مفروضہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جسے اپنی ہی حدود سے واقفیت ہوتی ہے۔"

"کیا" رائے نے کہا، کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"
فوکو نے جواب دیا، "میں بھی موت سے خوفزدہ ہوں، ہم سب موت سے خوفزدہ ہیں۔"
"کتنا کم وقت رہ گیا ہے" راک نے کہا
اگر ایسا ہے تو تم میرے ساتھ سوتے کیوں نہیں؟ رائے نے اکسایا۔
راک کا جواب حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ فوکو نے کوئی مدد نہ کی۔ ایک بار پھر وہ ایک بالکل ہی مختلف سطح پر سوچ رہا تھا۔ رائے نے پھر راک کو چھیڑنا چاہا تاکہ کوئی منطقی جواب مل سکے۔ جھولتا ہوا پنکھا کونے میں گہری سانسیں لے رہا تھا۔ رائے نے راک کی طرف دیکھا اور پھر فوکو پر نظر ڈالی۔ راک ہڈسن کی نگاہ رائے کی نارنگی رنگ کی ڈھیلی ڈھالی قمیص پر پڑی جوان فانی لوگوں کے درمیان کہنے اور نہ کہنے کے سارے عقدے اپنے اندر چھپائے ہوئے تھی۔
شیشوں پر گھڑگھڑاہٹ ہوئی۔ یوں لگا کہ ناظرین میں سے کسی ایک نے انکی گفتگو سن لی ہو۔ اس نے اپنے سر کو شدت سے ہلایا۔ دور سے ایک شخص کے سسکنے کی آواز آئی۔ دوسرے ناظر نے ایک چھپا ہوا نشان شیشے کے پار سے دکھایا جس پر لکھا تھا: میشل، کیا خدا مر چکا ہے۔" فوکو نے مسکرا کر سر کو جنبش دی۔ یوں لگا کہ دوسرا امریکی بھی موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے جھٹ اپنا سوال داغ دیا: "Shroud of Turin کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
اس رات راک ہڈسن اپنے بستر پر تنہا جاگتا رہا۔ دیر تک رائے کون اور اسکی آواز کے درد کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ حیران تھا کہ فوکو کیا کہے گا۔ رائے اس کی خواہشوں کو جگانے میں ناکام رہا تھا۔ اور پھر بھی جیسا کہ فوکو نے کہا کہ ہم سب اب جبر کے بجائے ہیجانی قوت کے بس میں ہیں۔ راک بے چین ہو اٹھا: "آہ میری آنکھوں میں نیند نہیں، میں سو نہیں سکتا، کیا ایسی ہی راتوں کو فرانسیسی سفید راتوں سے تعبیر کرتے ہیں؟"
شام نرسی راک کا درجۂ حرارت معلوم کرنے آئی۔ اس نے نیند کا سوانگ رچا،

اور نرسی جلد ہی لوٹ گئی۔ راک نے سوچا' ہاں اب فیصلہ کر لیا ہے میں نے' اور انکار نہیں کر سکتا۔ میں اپنے رہبر کی پیروی کروں گا۔ میں اور انکار نہیں کر سکتا۔ بالکل نہیں۔"
دوسرے دن اس نے رائے کون کے ساتھ سونے کا منصوبہ بنا لیا (فوکو کی طرف ایک معنی خیز نگاہ ڈالتے ہوئے)۔ ایک ایسا بستر جو تاریخ کو دوبارہ ضبطِ تحریر میں لائے گا۔

رائے، راک اور فوکو کے آخری چند ہفتے خوشیوں سے چھلک اٹھے۔ تینوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ فوکو نے راک ہڈسن کے ساتھ شب گزاری اور راک رائے کیساتھ ہم بستر ہوا۔ فوکو اور رائے کون کو ایک دوسرے کیساتھ سونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن وہ دونوں خصوصی دوست بن گئے۔ نرسیں مسکراتیں جب تینوں کو آتا دیکھتیں۔ لوگوں نے ان کے چہروں پر کیمرے کا فلیش چمکانا چھوڑ دیا تھا۔ آخر دم تک وہ تینوں چمڑے کی بنی آرام کرسی میں پاس پاس بیٹھتے۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے سخت انجکشن جو بکریوں سے تیار ہوتے تھے، کے اثر سے ان کے چہرے گُلنار ہو جاتے ❖❖

❖❖❖❖

ایڈز کے بارے میں نظمیں

AIDS

جہنّم کیا ہے

ہیتھر میک ہیو
ترجمہ: خالد سہیل

تمہارا باپ
عالمِ بے چارگی میں
گھر کے کشادہ کچن میں بیٹھا
خلاؤں میں گھورتا رہتا ہے
اس گھر میں کوئی نہیں جانتا کہ
تمہاری بیماری کہاں سے آئی ہے
کیا وہ محبت کے جزیرے سے آئی ہے
یا ایسے ہی کسی اور مقام سے
تمہارے باپ نے
چالیس سال کی محنت کی کمائی سے
جو گھر بنایا تھا
تم اس گھر میں اب
اپنی موت کا انتظار کرنے آئے ہو
لوگ اس سے پوچھتے ہیں
جہنّم کیا ہے؟

وہ کہتا ہے
میرا فریج لذیذ کھانوں سے بھرا ہوا ہے
لیکن
میرے بیٹے کا پیٹ خالی ہے

تمہارے والدین کے دوستوں نے آنا چھوڑ دیا ہے
کیونکہ
تمہیں دیکھ کر ان کی خوشیاں مرجھا جاتی ہیں
تم ہر روز
انسانوں کی قربت کی گرمی سے دور
سردی میں ٹھٹھرتے رہتے ہیں
بعض لوگ مسکرا کر کہتے ہیں
وقت سے پہلے بوڑھا ہونا بھی کیا حقیقت ہے
لیکن یہ ہنسنے کا مقام نہیں ہے
ہمیں
تمہیں چھونے تک کی اجازت نہیں ہے
چاہے تم رو رہے ہو یا خون بہا رہے ہو

جب تمہارا بھائی
تمہارے زخموں پر مرہم رکھتا ہے
ایسے زخم جو کبھی شفایاب نہ ہوں گے
تو وہ دستانے پہنتا ہے
جب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ
زکام یا ایک بوسہ
تمہاری جان لے سکتے ہیں
تو ہم سوچتے ہیں کہ
محبت کی حقیقت کیا ہے

وہ شخص جسے اپنے خوبرو ہونے پر ناز تھا
ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے
وہ شخص جسے باتیں کرنے کا شوق تھا
اب خاموش رہتا ہے
اس کی آنکھوں کے گرد حلقے بن گئے ہیں
جب ہم گھر میں
دکھوں کی بات کرتے ہیں تو
ہمیں احساس ہوتا ہے کہ

وہ خود ہی سراپا دکھ بن گیا ہے
جب ہم کچن میں بیٹھے
سوچ رہے ہوتے ہیں کہ
ہم سب کتنا دکھ برداشت کر سکتے ہیں
وہ کہاں ہوتا ہے

جہنم میں
وہ جہنم
جو ہمارا لونگ روم ہے
وہ جہنم
جس میں ایک آرامدہ کرسی بھی ہے

••

موت کی وادی

جون مرا نہیں ہے
وہ ابھی مرا نہیں ہے
لیکن
وہ کبھی کبھار ہی ہوش میں آتا ہے
اگر وہ مسکرا دے تو
ہم کتنے خوش ہوتے ہیں
جب وہ چیختا ہے کہ گھر چلے جاؤ تو
ہم شکر گزار ہوتے ہیں کہ
وہ بول سکتا ہے
جب وہ انگلیاں ہلاتا ہے تو
ہم جان لیتے ہیں کہ
ابھی اس میں جان باقی ہے
کسی لمحے وہ بہتر لگتا ہے کسی لمحے بدتر
اب وہ زندگی کے اس مقام پر آگیا ہے جہاں
ہر دن، ہر گھنٹہ، ہر لمحہ غیر یقینی ہو گیا ہے
کون جانے کب
اس کا دماغ کام کرنا چھوڑ دے ••

روون شرامیبر

ترجمہ: خالد سہیل

اپنے بھائی کو
مرتے کیسے دیکھا جاتا ہے

جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو
تحمل سے کام لینا
اپنی بیوی سے کہنا
میرا بھائی مر رہا ہے، مجھے کیلیفورنیا جانا ہے
اپنی طبیعت اداس نہ کرنا جب وہ
اپنے بستر میں ایک مردہ ڈھانچے کی طرح نظر آئے
اس جوان مرد سے
جو اس کے سرہانے بیٹھا ہو کہنا
"میں اس کا بھائی ہوں"
اس وقت زیادہ حیرانگی کا اظہار نہ کرنا جب وہ کہے
"میں اس کا محبوب ہوں! آنے کا شکریہ

ڈاکٹر کی باتیں بھی سننا
جس کا چہرہ جذبات سے عاری ہوگا
سارے فارموں پر دستخط کرنا
ڈاکٹر سے کہنا
تم تمام چیزوں کا انتظام کر لوگے

یہ بھی سوچنا کہ
ڈاکٹر اتنے سر درد ّیے کے مالک کیسے بن جاتے ہیں
اس محبوب کی نظروں کی طرف دیکھنا
جو تمہارے بھائی کی نظروں کی طرف دیکھ رہی ہونگی
اور تمہارے بھائی کی نظریں
خلاؤں کی طرف دیکھ رہی ہوں گی
سوچنا کہ وہ نظریں وہاں کیا دیکھ رہی ہیں
وہ وقت یاد کرنا جب اس نے
حسد کی آگ میں
تمہاری طرف ایک چھڑی پھینکی تھی
اور تمہارے ابرو پر زخم لگایا تھا
اسے باآوازِ بلند معاف کردینا
چاہے اسے وہ بات سمجھ آئے یا نہ آئے
یہ یاد رکھنا کہ اب
صرف زخم کا نشان باقی رہ گیا ہوگا

ہسپتال کے کیفی ٹیریا میں محبوب سے کہنا
تم بہت حسین مرد ہو
اسے کہتے سننا
میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں
تمہارے بھائی کے قابل ہوں گا
اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنا
جو آنسوؤں سے بھر جائیں گی

اسے کہنا
میں نہیں جانتا کہ کیسے
ایک مرد دوسرے مرد کے عشق میں گرفتار ہو سکتا ہے۔
اسے کہتے سننا
دو مردوں کا عشق
میاں بیوی کے عشق کی طرح ہوتا ہے
البتہ ذرا گہرا ہوتا ہے
کیونکہ انہیں
زیادہ خطرات کا سامنا کرنا ہوتا ہے
تم خاموش رہنا
اس کا ہاتھ ایک بھائی کی طرح تھام لینا

اس کے ساتھ میکسیکو جانا
ایسی غیر قانونی دوائیاں لانے کی کوشش کرنا
جن سے
تمہارے بھائی کی زندگی بڑھنے کی امید ہو
سرحد پر پکڑے جاؤ اور فوجی کہے
"آپ یہ سرحد پار نہیں لے جا سکتے" تو
غصے میں شور مچانا
اس کا ہاتھ اپنے بازو پر محسوس کرنا
جو کہہ رہا ہو گا سنبھل جاؤ
اس فوجی کی آنکھوں میں اس غصے کو دیکھنا
جس سے اندازہ ہو گا کہ ایک انسان

دوسرے انسان سے کس حد تک نفرت کر سکتا ہے
محبوب سے کہنا
تم اس روّیے کو کیسے برداشت کر سکتے ہو
وہ کہے گا
انسان کو اس کی عادت ہو جاتی ہے
سوچنا کہ کیسے تمہارا کوئی بچہ
کسی کی نفرت کا عادی ہو سکتا ہے

اپنی بیوی کو فون کر کے کہنا
"میرا بھائی عنقریب مر جائے گا
اور میں جلد گھر آجاؤں گا"
اس سے پہلے کہ وہ فون رکھ دے
اس سے پوچھنا
"کسی جوڑے کی محبت
میاں بیوی کی محبت سے کیسے گہری ہو سکتی ہے؟"
اس کا جواب سننا
"میں فون پر تفاصیل نہیں سننا چاہتی"

جب تمہارا بھائی موت کی وادی میں اترنے لگے
اس کے محبوب کو سہارا دینا
اور سوچنا کہ
وہ کب تک اپنے آپ کو سنبھال سکے گا
یہ بھی سوچنا کہ کیسے

ایک مرد دوسرے مرد کو اپنے بازووں میں لیتا ہے
اپنے بھائی کی جان بچانے کے لئے
خدا کو ہر قسم کی قربانی پیش کرنا
یہ جانتے ہوئے کہ
خدا تم سے کچھ نہیں چاہتا
خدا پر غصہ ہونا
لیکن اس سے دور نہ ہٹنا

فیونرل ڈائرکٹر کے چہرے کی طرف گھورنا
جب وہ تمہیں بتائے کہ وہ
تمہارے بھائی کی لاش تو تیار نہیں کر سکتا
کیونکہ
مرض کے پھیلنے کا خطرہ ہے تو
اسے اپنی آنکھوں میں جھانکنے دینا
تاکہ وہ دیکھ سکے کہ
ایک انسان دوسرے انسان سے کتنی نفرت کر سکتا ہے

کاسکٹ کے قریب کھڑے ہونا
جو سفید پھولوں سے لدی ہوگی
سیکڑوں مردوں کے آنے کا شکریہ ادا کرنا
ان میں سے چند
آنسو بہاتے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گزر جائیں گے
اپنے بھائی کی زندگی اور موت کے بارے میں سوچنا

دو مردوں کی بات سننا
جو کہہ رہے ہوں گے
"اس کے بعد کس کی باری ہوگی"

تجہیز و تکفین کے بعد
پہلے جہاز سے گھر لوٹ جانا
تمہارے بھائی کا محبوب تمہیں ایئر پورٹ لیجائیگا

جب جہاز تیار ہو تو
اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہنا
"اگر تمہیں کبھی میری مدد کی ضرورت ہو تو
اطلاع دیتے نہ ہچکچانا"
زیادہ غصے میں نہ آنا

جب وہ کہے
"اپنے آپ کو معاف کر دینا
جب تمہارے بھائی نے تمہیں
حقیقت سے آگاہ کیا تھا تو
تم نے قطع تعلق کر لیا تھا"
تم کہنا
"اس نے شاید مجھے معاف کر دیا تھا"
وہ کہے گا
"ہاں کر دیا تھا"
اسے اپنے بھائی کی طرح گلے لگانا
وہ تمہارے رخسار پر بوسہ دے گا

سوچنا کہ آخری دفعہ
تمہارے والد کی موت پر
کسی نے تمہارے رخسار کو چوما تھا
سوچنا کہ وہ مردانگی دکھانے کا موقع نہیں

فرسٹ کلاس میں بیٹھ کر واپس آنا
جہاز میں اسکاچ اور سوڈا پینا
اپنے ابرو کو انگلیوں سے چھونا
اپنے بھائی کی زندگی کا تصور کرنا
اس کی یاد میں مسکرانا
اور
اپنے بچوں کے بارے میں سوچنا
جب وہ تمہاری آغوش میں آئیں گے تو
کیسے محسوس کریں گے
انہیں کتنی محبت اور شفقت ملے گی
اور وہ
آزمائشوں سے محفوظ رہیں گے ••

مائیکل لیزیل

تسلّی

اپنی موت کے تقریباً دس دن بعد تم
خواب میں لوٹ آئے
اور کہنے لگے
اب میں بخیریت ہوں
وہ تم ہی تھے
اگرچہ تم کمزور دکھائی دے رہے تھے
لیکن تم نے
ہم سب کو گلے لگایا
ہمارا مسکرا کر استقبال کیا
تم پہلے کی طرح مہربان تھے
ہمیں تسلّی دے رہے تھے

اور ہم
پہلے کی طرح
اپنے سکون کی تلاش میں تھے۔

تھام گن

ترجمہ: خالد سہیل

REFERENCES

1. GAY/LESBIAN ALAMANAC

A NEW DOCUMENTARY — 1607 - 1950

JONATHAN NED BATZ

HARDER & ROLO PUBLISHERS

NEW YORK

2. WORLD HUMAN RIGHTS GUIDE

CHARLES HUMANA

PAN BOOKS LONDON & SYDNEY.

3. POETS FOR LIFE

SEVENTY SIX POETS RESPOND TO AIDS

EDITED BY- MICHAEL KLEIN

CROWN PUBLISHERS INC. NEW YORK.

4. MENON MEN

BEST NEW GAY FICTION

EDITED BY- GEORGE STAMBOLIAN

A PLUME BOOK

PENGUIN BOOKS NEWYORK

5. WOMEN ON WOMEN

ANTHOLY OF AMERICAN LESBIAN SHORT FICTION
EDITED BY- JOAN NESTLE/NAOMI HOLOCH
A PLUME BOOK
PENGUIN BOOKS NEWYORK.

PAL

6. WANTING WOMEN

ANTHOLOGY OF EROTIC LESBIAN POETRY

EDITED BY- JAN HARDY

SIDEWALK REVULGTION PRESS

PITTSBURGH

7. OUT HERE FLYING (POETRY)

JAN HARDY

8. HOMOSEXUALITY IN CHINESE CULTURE

DR. M.P LAU & DR M.L NG

CULTURE MEDICINE & PSYCHIATRY

13: 465-488 — 1989

9. SEXUAL ATTITUDE IN THE CLIMEX.

DR M.L. NG & DR M.P. LAU

ARCHUVIS OF SEXUAL BEHAVIOUR

VOL. 19, NOV- 1990

ڈاکٹر خالد سہیل
کی
تصانیف

- تلاش : (شاعری)
- زندگی میں خلا : (افسانے)
- بریکنگ دی چینز :
  (افسانوں کا انگریزی ترجمہ)
- اک پیر وچ زنجیر : (افسانوں کا پنجابی ترجمہ)
- سوغات : (بین الاقوامی کہانیوں کا اردو ترجمہ)
- بھگوان، ایمان، انسان : فلسفیانہ مضامین کا اردو ترجمہ)
- مغربی عورت، ادب اور زندگی :
  مغربی خواتین ادیبوں کے افسانوں اور مضامین کا اردو ترجمہ)
- چنگاریاں : (افسانوں کا کیسٹ)
- تازہ ہوا کا جھونکا : (شاعری کا کیسٹ)
- ایک کلچر سے دوسرے کلچر تک : (مقالے کا کیسٹ)
- ٹوٹا ہوا آدمی : (دو ناولٹ)
- انفرادی اور معاشرتی نفسیات : (مضامین)
- ورثہ : (لوک کہانیوں کا انتخاب و ترجمہ)
- امن کی دیوی : مشرقِ وسطیٰ/ خلیج ۹۰/۹۱ کی جنگ
- کالے جسموں کی ریاضت : (افریقی ادب)
- ایک باپ کی اولاد : (عرب، یہودی مسائل)
- ہر دور میں مصلوب : (لیسبیئن اور گے ادب و زندگی)